آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل

MashalBooks.org

آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

MashalBooks.org

آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

اردو ترجمہ: حسن عابدی

کاپی رائٹ اردو (c) 2002 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی (c) غلام کبریا

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http:/www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

انتساب

میں اس کتاب کو بصد احترام ان پانچ ممتاز شخصیات کے اسمائے گرامی سے منسوب کرتا ہوں- یہ ہیں ڈاکٹر رفیق احمد خان' پروفیسر عبیداللہ درانی' پروفیسر کرار حسین' پروفیسر سید شمیم احمد اور ڈاکٹر اختر حمید خان جو میرے استاد اور گرو تھے اور جنہوں نے مجھے وہ سماجی شعور اور وہ اہلیت عطا کی کہ مسلمہ تصورات سے الگ ہو کر سوچ سکوں- کسی عصبیت کے بغیر اور اس حوصلہ مندی کے ساتھ کہ اپنی غلطیوں کا اقرار کرتے ہوئے انہیں درست کرتا رہوں-

MashalBooks.org

MashalBooks.org

فہرست

1-	پیش لفظ	7
2-	تعارف	17
3-	آزادی سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان	25
4-	آزادی نے ہندوستانی مسلمانوں کو آ لیا	81
5-	ہندوستانی مسلمانوں کا مغلئی ورثہ	126
6-	ہندوستانی مسلمانوں کو کمپنی کی دین	155
7-	مسلمان قوم کی بدعہدی	176
9-	بدعہدی کے سلسلے کا آغاز	228
10-	اختتامیہ	291

MashalBooks.org

MashalBooks.org

پیش لفظ

1930ء کی دہائی میں، میں سکول کا طالب علم تھا اور متوسط طبقے کے ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان کی طرح میں بھی یہی جانتا تھا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا سبب ہندو اور انگریز ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یہی معلوم تھا کہ انگریزوں نے ہندوؤں کی چشم پوشی اور چند مسلمانوں کی غداری کی بدولت مسلمانوں کو ہندوستان کی سلطنت سے محروم کر دیا تھا۔ یہ باتیں کسی نے ہمیں بتائی نہیں تھی۔ بس ہمیں ان کا علم ہو گیا تھا۔ بچپن کے ابتدائی دنوں سے ہی مجھے ہر روز اور خاص طور پر جمعہ کے دن نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جایا جاتا تھا اور بسا اوقات میں وعظ بھی سنتا تھا۔ خواہ ہمارے مولوی صاحب وعظ کرتے ہوں یا کوئی عالم جو ہماری طرف آ نکلتے تھے ہمیں یہی بتایا جاتا تھا کہ سارے مسلمان جنت میں جائیں گے اور تمام بے دینوں کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ اگر ہم ناداروں اور محتاجوں کو خیرات دیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا ثواب دے گا۔ ہمیں یاد نہیں آتا کہ کبھی کسی عالم نے ہمیں ہماری سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی بتایا ہو۔ میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا یہ دیکھتا رہا کہ ہمارے خاندان میں مختلف مواقع پر مثلاً محرم اور شب برات پر فاتحہ خوانی ہوتی کیونکہ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا ایک دیندار خاندان مشہور تھا۔ اس موقع پر خاص کھانے پکائے جاتے جن میں شرکت کے لئے رشتہ داروں کو مدعو کیا جاتا اور فاتحہ کے بعد دعوت ہوتی۔ کچھ تھوڑا سا کھانا ہمسائے میں غریب لوگوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس کار خیر کی وجہ سے ہمارا خاندان ایک خدا ترس، عزت دار خاندان سمجھا جاتا تھا۔ درمیانہ طبقے اور دولت مند مسلمان خاندان کے لوگ بھی یہی کچھ کرتے، جو ہمارے خاندان یا ایسے ہی دوسرے گھرانوں کے لوگ کرتے تھے۔

MashalBooks.org

خوشحال ہندو خاندانوں کی مذہبی سرگرمیاں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ روزانہ نماز، روزے اور فاتحہ خوانی کا بدل ہندوؤں کے یہاں کیا تھا اور میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی، تاہم میں نے پانی کے پیاؤ دیکھے تھے، جہاں ٹھنڈے پانی سے پیاسے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ پھر ان کے دھرم شالے ہوتے جہاں ہندو یاتری آ کر رات گزارتے۔ یہ اقامت مفت یا معمولی اجرت کے عوض ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی کچھ اور سرگرمیاں رفاہ عامہ کے سلسلے میں ہوتی تھیں۔ یہ مستقل نوعیت کی ہوتیں جنہیں آسودہ حال ہندو خاندان مل جل کر چلاتے یا دولت مند انفرادی طور پر جاری رکھتے تھے۔ میں نے نہ کبھی دیکھا اور نہ یہ سنا کہ مالدار مسلمانوں نے نجی طور پر یا مل جل کر اپنی برادری کے لئے ان کے برابر کے ادارے قائم کئے ہوں۔ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سنا کہ متمول مسلمانوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی برادری والوں کے لئے سکول اور کالج قائم کئے ہوں۔ نادار مسلمان مسافروں کے لئے سرائیں بنانا تو دور کی بات ہے۔ البتہ دولت مند ہندوؤں نے انفرادی طور پر یا مل جل کر ہسپتال سکول اور کالج کھولے اور انہیں جاری رکھا۔ میں نے جس شہر میں پرورش اور تعلیم پائی اور جہاں میرے والد وکالت کرتے تھے، وہاں ایک مسلم سکول تھا۔ اس مسلم سکول کی تعلیمی کارگزاری تو نہایت قابل تعریف تھی لیکن فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بقا کی جدوجہد میں ہمیشہ مصروف رہتا لیکن اس ضلع میں پانچ بڑی پرشکوہ جاگیرداریاں تھیں۔ ان میں سے چار مسلمان نوابوں اور راجاؤں کی تھیں۔ ہندو سکول ایک ہی تھا۔ دیانند اینگلو ناکیولر ہائی اسکول کی مالی چالت اچھی تھی چنانچہ جلد ہی کالج بن گیا لیکن مسلم سکول چار بڑی مسلم جاگیرداریوں کے ہوتے بھی کالج نہ بن سکا۔ اس ضلع میں ہندوؤں کی واحد ریاست بہت چھوٹی تھی، مسلمانوں کی سب سے چھوٹی ریاست بھی چھوٹی۔

مجھے یقین ہے کہ شہر میں ہمارے خاندان کی طرح دوسرے خاندانوں کے لڑکے بھی یہ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمان خاندان کس طرح گزر بسر کرتے ہیں۔ میں بھی اس بات سے لاعلم رہتا۔ اگر ایک سبب نہ ہوتا وہ یہ کہ میری ماں اور میرے دادا ہمارے علاقے کے ناداروں کی ہمیشہ مدد کرتے رہتے تھے۔ اس میں دوائیوں کی خریداری یا دوسری ہنگامی ضرورت کے لئے اور کپڑے بنانے کے لئے مالی اعانت شامل

MashalBooks.org

ہوتی تھی۔ اس سے فیض یاب ہونے والوں میں ہندو بھی شامل ہوتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے مسلمان اس پر معترض ہوتے کیونکہ ''کافروں کو مدد دینے میں کوئی ثواب نہیں تھا۔'' لیکن میری والدہ اس پر اصرار کرتیں کہ انسان آخر انسان ہیں، چاہے کافر ہوں۔ میری والدہ اور میرے دادا دونوں کو اس بات پر اصرار تھا کہ نادار اور محتاج لوگوں کی مدد کرنا ایک سماجی ذمہ داری ہے۔ وہ اس بات پر بھی بہت زور دیتے تھے کہ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے نیک کاموں کا چرچا نہیں کرنا چاہئے۔ میرے والد اور دوسرے قریبی رشتہ دار ان ساری باتوں کو محض حماقت سمجھتے تھے۔ مجھے اپنی سماجی ذمہ داریوں کا علم اپنی والدہ اور دادا جان کے ذریعے سے ہوا۔ باقی لوگ اور ان میں میرے والد بھی شامل تھے صرف ثواب اور گناہ کی باتیں کرتے رہتے۔ انہوں نے عام لوگوں کے مصائب و آلام کا تذکرہ انسانی احساسات کے حوالے سے کبھی نہیں کیا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ گھر میں ایسی کوئی کتابیں تھیں یا میرا خیال ہے نہیں تھیں جو ہمیں سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں اور دوسروں کی تکالیف اور ان پر انسانی احساس کے تعلق سے کچھ بتاتیں۔

میرے بہت سے ہندو دوست تھے۔ جیسے میرے والد کے دوست، ان کے پیشے اور مجلسی زندگی کے تعلق سے تھے۔ میرے والد ایک کٹر مسلم لیگی تھے لیکن ان کا ایک عزیز ترین دوست ہندو تھا اور وہ بھی وکیل تھا لیکن کٹر کانگریسی مسلم لیگی تھے لیکن ان کا ایک عزیز ترین دوست ہندو تھا اور وہ بھی وکیل تھا لیکن کٹر کانگریسی۔ بہت سے ہندو اور مسلمان تہواروں کے موقعوں پر ایک دوسرے سے ملتے رہتے۔ ہندو، عید اور شب برات، اور مسلمان ہولی اور دیوالی پر۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے مراسم خوشگوار تھے اور یہ بات شہروں سے زیادہ گاؤں میں تھی۔ ایک ہی زبان بولتے تھے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی جب فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تو اسے اردو کہا جاتا تھا اور جب دیوناگری خط میں لکھی جاتی تو ہندی کہلاتی۔ سکولوں میں جن طلبہ کی پہلی زبان اردو ہوتی ان کے لئے ثانوی زبان کے طور پر ہندی پڑھنا ضروری تھا اور جن کی پہلی زبان ہندی ہوتی ان کیلئے ثانوی زبان کے طور پر اردو کی تدریس لازمی ہوتی۔ بہت سے ہندو سکولوں میں اردو پہلی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی لیکن مجھے تو ایک بھی ایسا مسلم سکول یاد نہیں آتا جہاں کی پہلی زبان ہندی ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل جول میں

MashalBooks.org

تپاک، صارف میرے خاندان، میرے شہر اور صوبے تک محدود نہ تھا۔ اس کا اندازہ تو مجھے اس وقت ہوا جب میں علی گڑھ پہنچا۔ علی گڑھ میں سارے ہندوستان سے طلبہ پڑھنے کے لئے آتے چنانچہ ہم آپس میں بہت سے معاملات پر تبادلہ خیال کرتے اور ان میں ہندو مسلم تعلقات کا معاملہ بھی شامل تھا۔ کبھی کبھار لیک صرف چند جگہوں پر اور انہی میں کان پور بھی تھا۔ مسلسل فسادات ہوتے رہتے۔ اس کے باوجود کہ نجی اور اجتماعی سطح پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات قائم تھے تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے مسلمان عام طور پر خود کو برتر درجہ دیتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ماضی میں دہلی کے تخت پر مسلمان حکومت کرتے آئے تھے۔ اسی طرح متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کو مداخلت کار قرار دیتے تھے جنہوں نے ان پر محکومی مسلط کی تھی۔

ہندوستان میں زبردست سماجی ناہمواری اور مختلف ذاتوں کے درمیان امتیاز خوفناک حد تک موجود تھا لیکن اس سلسلے میں ایک عام بے حسی پائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی اونچے اور نچلے طبقے موجود تھے حالانکہ اسلام میں ایسے امتیاز کو سختی سے ناپسند کیا گیا ہے کہ کسی فرد کا کسی بھی خاندان میں پیدا ہونا محض ایک اتفاقی امر ہے لیکن ہندوؤں میں یہ تفریق، غیر انسانی طور پر ہولناک تھی۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی کسی موقع پر اس امر پر تشویش ظاہر کی گئی ہو کہ اس غیر اسلامی سماجی طرز عمل کو آخر کیوں برداشت کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ایک مسلمان کو محض اس کی پیدائش کے حوالے سے حقیر کیوں سمجھا جاتا ہے۔ سماج کے اس طرح حصے بخرے ہونے پر خود ہندوؤں میں بھی کوئی تشویش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس سے بھی بدتر بات، محض ذات برادری کے نظام کے تحت بدترین درجے کی تفریق اور نابرابری تھی حالانکہ ہندوؤں میں گاندھی جی کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔ ماضی کو دھیان میں لاتا ہوں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گاندھی نے ذات برادری کے نظام کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے عوامی تحریک کیوں نہیں چلائی۔ حالانکہ یہ نظام انسانی وقار کے منافی اور انتہائی توہین آمیز تھا۔ اچھوتوں کو ہریجن یعنی بھگوان کے بچے کہہ کر گاندھی کے اپنے ضمیر کی تسکین تو ہو جاتی تھی حالانکہ اچھوتوں کے ''اچھوت پن'' میں کوئی کمی نہ آتی اور انکے حالات ذرا بھی بہتر نہ ہوتے۔ خود مسلمانوں کے درمیان جو اپنے آپ کو بڑے فخر سے پیغمبر اسلامؐ کی امت قرار

MashalBooks.org

دیتے تھے کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں ہوا جو ایک غیر اسلامی غیر انسانی اور ذات برادری کے نظام کو ختم کر کے معاشرے کو اسلامی بنانے کے لئے کسی عوامی تحریک کی قیادت کرتا۔

وقت گزرتا رہا، میں بڑا ہوتا گیا لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی اپنے بڑوں کو مسلمانوں کے سماجی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل پر گفتگو کرتے سنا ہو۔ اگر کبھی کچھ سنا تو یہی کہ امام مہدی علیہ السلام مسلمانوں کے نجات دہندہ بن کر ظہور فرمائیں گے اور پھر ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی ہو گی۔ حقیقی زندگی میں اس کی کیا ضرورت ہو گی؟ اس پر کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ مسلم معاشرے کے روحانی، سماجی، اخلاقی اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کسی مسلمان پر کون سی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس پر بھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس معاملے میں فرد کا کوئی کردار ہو سکتا ہے۔ سب کیلئے ایک ہی جواب تھا، یعنی اللہ کی مرضی۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے 1940ء کی دہائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا تو اس وقت اندازہ ہوا کہ بیشتر مسلمان گھرانوں کا طرز عمل بالکل ہماری ہی طرح کا تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ہمارے بیشتر پروفیسر ہندوستان گیر بلکہ عالمی شہرت کے مالک تھے لیکن میں نے ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھی، جو بڑی کلاس کیلئے نہ سہی کم از کم نچلے درجے کے طلبہ کیلئے ہی مسلمان اساتذہ نے لکھی ہو۔ لے دے کے ایک ہی الجبرے کی کتاب تھی جو میں نے انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں پڑھی۔ درحقیقت وہ ساری درسی کتابیں جو ہم نے پڑھیں یا تو انگریز مصنفوں کی ہوتیں یا ہندوؤں کی ہوتیں۔ البتہ اردو اور دینیات کی کتابیں اس سے مستثنیٰ تھیں۔ مجھے یہ بھی علم ہوا کہ سائنس کے مضامین میں ہمارے بعض پروفیسر صاحبان زبردست سائنسدان شمار ہوتے تھے۔ البتہ ان کی ایجادات یا ریسرچ کیا تھی؟ ان کی نشاندہی کرنے میں میں معذور تھا۔ ایم اے اردو کی جماعتوں میں میرے سینئر طلبہ ڈاکٹر رائے بہادر رام بابو سکسینہ کی تاریخ اردو ادب اور ساتھ ہی اردو ادب میں ہند یورپی اساتذہ کی جیسی تصانیف پڑھتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے پروفیسروں کے بارے میں ہمارا وہ زعم کم نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی دیکھئے کہ غالب کے کلام کا شارح مالک رام سے بہتر کوئی نہ تھا جو ایک ہندو تھے۔ لیکن اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ کسی نے بھی لکھنؤ کے منشی نول کشور کو کوئی اہمیت نہیں دی جن کے اشاعتی ادارے

MashalBooks.org

اور چھاپے خانے نے اردو کے کلاسیکی ادب، قرآن کریم اور دیگر اسلامی کتب کی اشاعت کا سلسلہ وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا جو کسی بھی مسلمان ادارے حتیٰ کہ لاہور کے مولوی فیروز الدین کی مساعی سے بھی آگے تھا۔

علی گڑھ میں ہر طرح کی سرگرمیاں خاص طور پر سیاسی سرگرمیاں، ان دنوں زوروں پر تھیں۔ علی گڑھ بڑی حد تک مسلم لیگ کا گڑھ تھا اس کے باوصف طلبہ کے ایک مختصر سے گروہ اور ان سے زیادہ اساتذہ میں پاکستان کے متعلق میں یہ شک موجود تھا کہ کیا یہ مسلمانوں کے مسائل کا حل ہو گا؟ علی گڑھ میں میرے داخلے سے چند سال پہلے تک یہاں کمیونسٹوں کا غلبہ تھا۔ جب 1937ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو مسٹر جناح کی قیادت میں ہوئی تو کمیونزم سے مسلم لیگ کی طرف تبدیلی کا ریلا چل پڑا۔ ان دنوں علی گڑھ میں کوئی کانگریسی یا قوم پرست مسلمان اگر موجود رہا ہو تو کم از کم مجھے نظر نہیں آیا تاہم اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا تھا جو لوگ پاکستان کے تصور سے اختلاف کرتے انہیں کریک (خبطی Crack) کہا جاتا تھا۔ علی گڑھ میں سنکی یا احمق کے لئے کریک یک اصطلاح وضع کی گئی تھی لیکن انہیں غدار نہیں کہا جاتا تھا اگرچہ 90 فیصد طلبہ لیگی تھے لیکن 50 فیصد اساتذہ ان سے مختلف رائے رکھتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اگرچہ یوپی میں واقع تھی لیکن یہ ادارہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تھا۔ مسلمان طلبہ یہاں ہندوستان کے ہر گوشے سے، جنوب میں مدراس سے مشرق میں آسام سے، شمال میں کشمیر سے اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان سے داخلہ کیلئے آتے تھے۔ ان میں شامل پٹھان، بلوچ، سندھی، پنجابی اور بنگالی تھے جن کا تعلق مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں سے تھا جو مختلف بولیاں بولتے تھے اور قدرے مختلف کلچر کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے اقلیتی آبادی کے صوبوں سے طلبہ آتے تھے۔ یہ مدارسی تھے، میسوری اور گجراتی تھے اور اڑیسہ کے طلبہ تھے جن کی زبانیں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ اور آخر میں اردو بولنے والے علاقوں سے آئے ہوئے طلبہ تھے یعنی حیدرآباد، ممبئی، سی پی، بھوپال اور راجپوتانہ کی ریاستیں اور یوپی اور بہار کے طلبہ لیکن ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ سب علی گیرین تھے اور انہیں اس پر فخر تھا۔

اسی طرح سارے ہندوستان سے آنے والے اساتذہ تھے، جن میں ہندو بھی

MashalBooks.org

شامل تھے اور ان کی الگ الگ مادری زبانیں تھیں۔ مجھے کچھ یاد ہے کہ ہندو یا مسلمان کوئی بھی استاد جس کا تعلق کسی ایک صوبے یا علاقہ سے رہا ہو۔ محض اپنے علاقے کے طلبہ میں مقبول نہیں ہوتا تھا۔ زندگی کے کسی شعبہ میں تفریق ہرگز نہیں تھی۔ وہ شعبہ مذہب کا ہو، سماجی یا کھیلوں کا ہو یا تعلیم و دانش کا شعبہ ہو۔ میں نے ان پروفیسر صاحبان کو بھی جو مسلم لیگ کے کاز سے وابستہ تھے، کبھی مسلمانوں کی کمزوریوں پر بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یعنی مسلمانوں کی ناخواندگی، ان کا افلاس ان میں حوصلہ مندی کا فقدان، ان میں ذات پات کا تفرقہ اور ان کا غیر اسلامی سماجی نظام یا جاگیرداری نظام، جو پاکستان بننے کے بعد مغربی پاکستان یا دوسرے علاقوں میں موجود ہوگا۔ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سنا کہ پاکستان میں حکومت کیسی ہوگی۔ اس کا معاشی نظام کیا ہوگا اور اس نوع کے دوسرے مسائل۔ ان معاملات پر کتابیں بھی نہیں لکھی گئی تھیں۔ درحقیقت ایک بھی ایسی کتاب دستیاب نہ تھی۔ اگرچہ ان کی اکثریت سنجیدہ قسم کے اخلاقی، سماجی اقتصادی اور سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ نہیں کرتی تھی لیکن گنتی کے چند لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ ضرور موجود تھا جو ان مباحث میں حصہ لیتا تھا اور ان میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ غیر کمیونسٹ ارکان کے ایک ایسے ہی گروہ میں مجھے شمولیت کا موقع ملا۔ ان کی سربراہی دو مسلمان نوجوان کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے انڈین سول سروس کے ایک افسر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ دوسرا نوجوان میرٹھ کے ایک کالج میں انگریزی کا استاد تھا۔ یہ گروہ نہایت اہم نوعیت کے مسائل پر غور و بحث کرتا تھا۔ وہ ایک ہفت روزہ بھی شائع کرتے تھے۔ اس کے اوراق میں آزادی کے بعد مسلمانوں کو درپیش ہونے والے مسائل پر بحث شامل ہوتی تھی۔

طلبہ اور اساتذہ کے درمیان مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے موضوع پر اکثر بحث ہوتی رہتی۔ مسلمان سلطنتوں کے بارے میں ان سب کا ایک نوتسلجیا تھا۔ وہ سلطنتیں بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی طرح فلسفے، سائنس اور علمی موضوعات پر مسلمانوں کے کارناموں کے حوالے سے اکثر گفتگو ہوتی لیکن محض رواداری کے انداز میں زیادہ سنجیدہ اور گہرائی کے ساتھ نہیں۔ ہر شخص کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ ان علوم اور خاص طور پر سائنس کے باب میں مغرب والے، مسلمانوں کے مرہون احساس ہیں۔ اس کے ثبوت میں علامہ اقبال کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی مسلمانوں کے

MashalBooks.org

تدبر، ان کے تمدن اور دیگر نسلی، لسانی، مذہبی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے وابستہ لوگوں سے رواداری کا سلوک اور ان سب سے سوا، ان کے سماجی انصاف اور قانون کے تحت عدل اور انصاف کے معاملات پر بھی بحث کی جاتی ہو۔ مسلمانوں کے زریں زمانے اور آج ان کے دور زوال اور انحطاط کے درمیان تقریباً پانچ سو برس کا فاصلہ حائل ہے۔ اس پر کبھی بحث نہیں ہوئی اور نہ اس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا۔ اس طرح کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ اس گزرے ہوئے طویل زمانے کا ان کے ذہن میں کوئی تصور ہی نہیں تھا اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھے کہ مسلمانوں کی سائنس ابھی اس بیج کی طرح تھی جس سے اکھوے پھوٹ رہے ہوں جبکہ مغرب میں سائنس تیزی سے بلند ہوتے ہوئے ایک شاداب اور ہرے بھرے عظیم الجثہ درخت کی طرح تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا جب کسی موقع پر مسلمانوں کے زوال اور پانچ سو برس پر محیط ان کی پسماندگی پر بھی بحث ہوتی ہو گی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں آتا کہ علم کی عظمت، رواداری، مہم جوئی اور تہذیب کو فروغ دینے والی خصوصیات کو بھی کوئی اہمیت دی گئی ہو۔

1945ء میں آزادی کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ دراصل اس مرحلے پر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ہندو اور انگریز کے گٹھ جوڑ کا انکشاف علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ پر ہوا جس طرح دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا وجود ایک زندہ حقیقت کے طور پر ابھرنے لگا تھا۔ بہت سے اساتذہ اور طلبہ کو یقین تھا کہ علی گڑھ اور آگرہ دونوں پاکستان میں شامل ہوں گے اور دہلی تو بہرطور ہو گی ہی۔ یہ بات بھی معلوم تھی کہ پاکستان کا آغاز تو ایک نادار ملک کے طور پر ہو گا لیکن جلد ہی بلوچستان میں سونے، چاندی، تانبے اور لوہے کی کانیں نکل آئیں گی جن سے پاکستان ایک دولت مند ملک بن جائے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ لاہور میں ڈیزل انجن، بجلی کے پنکھے کی صورت میں برقی موٹریں اور مشینی کل پرزے بنائے جا رہے تھے۔ لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ہم جماعت طلبہ میں سے کوئی اکنامکس پڑھ رہا تھا یا اس مضمون کی تدریس کو پاکستان کی بنیاد کیلئے اہم سمجھتا ہو کہ یہ علم تعمیراتی منصوبوں کے قیام اور مشینوں کی تنصیب کیلئے نہایت مضبوط بنیاد فراہم کرتا تھا۔ ہماری گفتگو میں سندھ اور پنجاب کی زرخیز زراعت کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔

MashalBooks.org

1945-46ء کے انتخابات کے بعد بہت سے علی گڑھ کے طلبہ کو مسلمانوں کے ایک وطن یعنی پاکستان کا قیام صاف نظر آنے لگا تھا۔ بہت سے مسلم لیگی اس طلسم کے اسیر تھے لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ کوئی سنجیدہ بحث یا رسمی بات چیت بھی اس سوال پر ہوئی ہو کہ پاکستان کی حکومت کس طرح کی ہو گی۔ اس کو کون سے مسائل درپیش ہوں گے، اور ان کے حل کی صورت کیا ہو گی۔ کس نوع کی معیشت رائج ہو گی اور ایسے ہی دوسرے سوال جو کسی ملک کے نظام میں درپیش ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ سماجی نظام کی لعنت، معاشرے کی ذات برادری، قبیلے اور ذیلی قبیلوں کے درمیان تقسیم در تقسیم، کسانوں اور نادار لوگوں پر جابرانہ تسلط، جاگیرداروں، ملکوں اور سرداروں کی بالا دستی، ان باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ ہر فرد کے پیش نظر دو ہی مسائل تھے ایک ہندو، دوسرا غیر ملکی برطانوی حکمراں۔ یہ مسائل جوں ہی رفع ہوں گے باقی تمام معاملات کو قائداعظم از خود طے کر لیں گے۔

آزادی کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا اور 1945-46ء کے انتخابات کے بعد تقسیم کے امکانات واضح ہوتے گئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔ اس کے باوجود انفرادی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات قائم رہے۔ اگرچہ گرمجوشی رخصت ہو چکی تھی۔ بعض جگہوں پر کشیدگی نے کھلی دشمنی کا روپ دھار لیا تھا اور وہاں فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ بہار کے صوبے میں، بنگال کے ضلع نواکھلی میں اور مغربی پنجاب کے بعض علاقوں میں فسادات نے سنگین صورتحال پیدا کر دی تھی۔ یوپی میں فساد صرف چند جگہوں پر ہوا مثلاً گنگا کے کنارے، گڑھ مکتیشر کے مقام پر، لیکن کشیدگی پورے صوبے میں پھیل چکی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد، پنجاب کے تقسیم شدہ صوبے، یوپی اور دہلی کے مغربی علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات نہایت بھیانک رخ اختیار کر چکے تھے۔ ٹرین کے مسافروں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

اگست 1947ء میں پاکستان قائم ہو گیا۔ بیشتر طلبہ اور بہت سے اساتذہ اس پر بہت خوش تھے۔ 1948ء کے وسط میں حکومت پاکستان کی جانب سے تمام انجینئروں، اساتذہ، انجینئرنگ کے گریجوایٹ اور سینئر طلبہ کو اس مفہوم کی درخواست ملی کہ جلد پاکستان پہنچ جائیں۔ ہر ایک سے کہا گیا تھا کہ حب الوطنی کا ثبوت دیں کیونکہ ہندو اور سکھ انجینئروں کے ترک وطن سے ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ بہت سے لوگ پاکستان آ گئے اور ان

MashalBooks.org

میں بھی شامل تھا۔

مسلمانوں کا آزاد وطن اگست 1947ء میں وجود میں آ چکا تھا لیکن مسلمان اس آزاد ملک میں پرامن طور پر مل جل کر نہ رہ سکے۔ چنانچہ 1971ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا جبکہ باقی ماندہ پاکستان انتشار اور لاقانونیت میں مبتلا ہوتا گیا۔

اور اب دیکھئے؟ کیا ہونے جا رہا ہے۔ 2001ء میں آدھے سے زیادہ ملک عالمی بینک کی فہرست میں روانڈا اور برونڈی کے ساتھ دنیا کے انتہائی نادار ملکوں میں شمار کیا جانے لگا اور المیہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی معیشت دنیا کی دسویں سب سے بڑی معیشت شمار ہوتی ہے۔ جو نادار ملک ضرور ہے لیکن نکہت زدہ نہیں اور عالمی بینک کی فہرست میں اس کا شمار نادار ترین ملکوں میں نہیں اور یہ کہ اس کا نام پاکستان سے کہیں اوپر ہے۔ آخر مسلمان اپنی نام نہاد خوابوں کی سرزمین میں پہلے سے بھی زیادہ ناخواندہ اور نادار کیوں ہو گئے؟ یہ اور ایسے ہی سوالات پاکستان کی موجودہ نسل کو درپیش ہیں۔

یہ کتاب ایسے ہی سوالوں کے جواب معلوم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے اور اس کا مقصد عالموں، سماجی، دانشوروں اور معیشت دانوں کو اس امر پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ پاکستان کو درپیش مصائب و آلام کے بنیادی اسباب معلوم کریں اور اس کا گہرا تجزیہ کریں۔

اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ میں اپنی کوتاہیوں اور مشکلات کی وضاحت کرتا چلوں۔ میری کمی یہ ہے کہ میں کوئی سکالر نہیں۔ میں ایک پیشہ ور شخص اور ایک عام شہری ہوں لہٰذا یہ کتاب کسی سکالر کی تحقیقات کا حل نہیں، میری سب سے بڑی دشواری پاکستان میں ریسرچ کی کامیابی ہے۔ لہٰذا میں نے بڑی حد تک دستیاب سہولتوں پر ہی انحصار کیا۔ باقی مواد کے لئے میں نے ان کتابوں کی فوٹو کاپی سے مدد لی جو پاکستان سے باہر شائع ہوئیں نتیجہ یہ کہ نامکمل حوالے دینے پڑے۔

غلام کبریا

مئی 2001ء

MashalBooks.org

باب نمبر 1

تعارف

دوسری عالمی جنگ 45-1939ء سے پہلے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کسی نہ کسی مغربی یورپ کی سامراجی طاقت کے زیر نگیں تھے۔ چند ممالک جو نام نہاد طور پر آزاد تھے، مثلاً ایران، افغانستان اور مصر وہ بھی مغرب کی بالادست طاقت کے ماتحت تھے۔ سب سے بڑی شاہی طاقت تو برطانیہ ہی تھی لیکن کچھ چھوٹے یورپی ممالک مثلاً پرتگال، ہالینڈ اور بیلجیئم ان کی بھی کالونیاں تھیں۔ بڑے ممالک میں غالباً صرف جرمنی تھا جو پہلی عالمی جنگ میں شکست کھانے کے بعد اپنی نو آبادیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ پورے ایشیا میں لے دے کے ایک جاپان تھا جو صحیح معنوں میں آزاد تھا اور ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس کی بھی ایک نو آبادی تھی یعنی کوریا، ایشیا کا بلکہ دراصل پوری دنیا کا سب سے بڑا ملک چین تھا۔ یہ بالکل نو آبادی تو نہیں تھا لیکن مغرب کی بالادستی اس پر بھی تھی۔ اس کی زیادہ تر بندرگاہوں پر مغربی ممالک کی براہ راست حکمرانی تھی۔ اس صدی کے اوائل میں جاپان نے بھی شمال مشرقی چین کے ایک صوبے میں اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ جاپان نے ایک بار پھر 1937ء میں چین پر حملہ کر کے اس کے بیشتر مشرقی صوبوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

یہ تھے اس زمانے کے حالات جب 1939ء میں دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان نے باقی ماندہ ترقی یافتہ ملکوں خاص طور پر امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ سویڈن، سوئٹزرلینڈ، سپین اور پرتگال غیر جانبدار رہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک نے جاپان سے دشمنی کی بنا پر ہندوستان کے زمینی راستے سے چین کو امداد فراہم کی۔ جاپان کی شکست کے نتیجے میں چین کو اپنی آزادی واپس مل گئی لیکن اس وقت

MashalBooks.org

تک یہ ملک بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ ایک آزاد ملک ہوتے ہوئے بھی وہ انتہائی پسماندہ تھا جس کا اپنا کوئی بنیادی ڈھانچہ (سڑکیں، ٹرانسپورٹ، بجلی وغیرہ) نہیں تھا۔ اگر کوئی ایسا ڈھانچہ تھا بھی، تو وہ جنگ میں بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ یہ تھے وہ انتہائی مایوس کن حالات جن میں ماؤزے تنگ نے چیانگ کائی شیک کی برائے نام حکومت کا خاتمہ کر کے اکتوبر 1949ء میں چین کو صحیح معنوں میں ایک آزاد ملک بنا دیا۔ جنگ کے بعد کوریا کو بھی آزادی مل گئی لیکن ایک بٹے ہوئے ملک کے طور پر جس کا شمالی حصہ روس کے زیر اثر چلا گیا اور جنوبی حصہ امریکہ کے تحت ہو گیا۔ اس کی حالت تو چین سے بھی کہیں زیادہ خراب تھی۔

جنگ کے بعد ہندوستان کو بھی آزادی مل گئی۔ اس طرح کہ اب وہ ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا لیکن کوریا کے ساتھ اس کی مشابہت بس یہیں تک ہے۔ آزادی اور تقسیم کے بعد چند ہی برسوں کے اندر شمالی اور جنوبی کوریا ایک خونیں جنگ میں الجھ گئے، ان کی باہمی خانہ جنگی کے عذاب میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب یہ بین الاقوامی جنگ بن گئی۔ اس میں امریکہ اور اس کے مغربی حلیف ایک طرف تھے، یعنی جنوبی کوریا کے ساتھ۔ چین اس جنگ میں سوویت یونین کی مادی امداد کے ساتھ شمالی کوریا کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاپان نے ایک نو آبادیاتی طاقت ہوتے ہوئے سنگدلانہ رویہ رکھا تھا اور بمشکل کوئی ترقیاتی کام کیا تھا اور اگر کچھ کیا بھی تو وہ جنگ میں تباہ ہو گیا تھا۔ جنوبی کوریا کا جاگیردارانہ (فیوڈل) نظام بدستور قائم رہا بلکہ آزادی کے بعد تو پہلے سے بھی زیادہ جابرانہ اور سفاک بن گیا۔ چین اور کوریا کے مقابلے میں برطانوی نو آبادکاروں نے ہندوستان میں ایک وسیع اور جدید ٹرانسپورٹ (سڑکیں، ریلوے) کا نظام اپنے پیچھے چھوڑا اس کے ساتھ ہی اس نظام میں توسیع اور دیکھ بھال کیلئے ماہر کاریگروں اور مقامی تربیت یافتہ انجینئروں کی بھی ایک تعداد چھوڑی۔ وہ نئے ریلوے انجن، ویگن اور ریل گاڑی بنانے کی سہولتیں بھی چھوڑ گئے۔ انہوں نے دنیا کا وسیع ترین نہری نظام تعمیر کیا تھا جو اس زمانے کی بہترین ٹیکنالوجی پر قائم تھا۔ اس کے علاوہ تعلیم کا ایک وسیع و عریض نظام قائم کر گئے تھے۔ جس میں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں شامل تھیں۔ ان درسگاہوں میں مقامی اساتذہ اور پروفیسر درس دیتے تھے۔ ان میں سے بعض تو عالمی شہرت کے فلسفہ داں، اسکالر

MashalBooks.org

اور ان کے علاوہ سائنس دان شامل تھے۔ انہی میں سے کم از کم ایک تو تامل (مدارس کا کام سائنس دان بھی تھا جسے نوبیل انعام ملا اور دوسرا نوبیل انعام یافتہ بنگالی زبان کا شاعر تھا۔ ہندوستان میں دو بڑے مذہبی فرقوں کے لوگ آباد تھے اور ان میں سے کچھ اقلیتی قومیں بھی تھیں۔ مسلمان آبادی کا 25 فیصد تھے، ہندو 70 فیصد، باقی سکھ، عیسائی، بدھ مت کے ماننے والے، پارسی اور دیگر یعنی 5 فیصد تھے۔ ہندوستان پر چونکہ ایک غیر ملکی نو آبادیاتی طاقت کی حکمرانی تھی اس لئے یہ ملک سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ رہ گیا۔ اس میں مسلمان ہندوؤں سے بھی زیادہ پسماندہ تھے۔ پارسی، ہندوستانیوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ہندوستان کا مجموعی طور پر خیال تھا کہ ان کی پسماندگی اور محرومیوں کا سبب برطانوی راج تھا۔ اس سوچ نے آزادی کی تحریک جنم دی، جس نے 1918ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد عملی صورت حال اختیار کر لی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس تحریک کی مقبولیت اور اس کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اگرچہ ہندوستان کی سبھی قومیں اس میں شامل تھیں لیکن مسلمانوں کی تعداد کے تناسب سے ان کی شرکت بہت کم تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعل آل انڈیا مسلم لیگ پر برطانوی راج کے وفادار جاگیرداروں، نوابوں اور بڑے زمینداروں کا قبضہ تھا۔ ان میں سے کچھ افراد جاگیردار تو نہیں تھے، لیکن وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر انگریزی رائج کے وفادار تھے۔ انہیں انگریزوں نے خان صاحب، بہادر اور سر کے خطابات سے نوازا تھا۔)

یہ صورتحال 1937ء تک برقرار رہی یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کے لئے محمد علی جناح سے درخواست کی گئی جو ہندوستان میں ایک چوٹی کے بیرسٹر تھے۔ جناح مسلم لیگ کے وہ پہلے صدر تھے جو نہ تو نواب یا جاگیر دار تھے اور نہ برطانیہ کے خطاب یافتہ تھے۔ اس تبدیلی کے باوجود لیگ پر آخر الذکر عناصر کی بالادستی برقرار رہی، جو اس کی مرکزی قیادت میں شامل تھے، شمال کے صوبوں یعنی پنجاب، سندھ، یوپی، بہار اور سی پی کی صوبائی مجالس عاملہ پر بھی انہیں عناصر کا تسلط تھا۔ تاہم بنگال، آسام اور شمال کے صوبہ سرحد میں متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ یا بالائی متوسط طبقے کے افراد اس کی قیادت کر رہے تھے۔ یہی صورت جنوب کے صوبوں میں تھی۔ مسلم لیگ کی قیادت میں کسی بھی سطح پر عام مسلمانوں کی موجودگی نظر نہیں آتی تھی۔ جناح اگرچہ طبقہ اشرافیہ سے تھے اور ایک انگریزی

MashalBooks.org

لارڈ کی طرح رہتے تھے لیکن انہوں نے عام مسلمانوں کے ساتھ کہیں زیادہ وابستگی کا ثبوت دیا۔ تاہم بدقسمتی سے انہیں عام مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع نہیں ملا۔

متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ مسلمان، جو مسلمانوں کی برادری میں کھل کر بات کرتے آئے تھے، اگرچہ اپنی آبادی کے تناسب سے غالباً دس فیصد سے زیادہ نہ تھے، لیکن انہوں نے اپنی سماجی اور اقتصادی پسماندگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہی تھا کہ مسلمان قوم ان دونوں معاملوں میں ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ پسماندہ تھی لیکن مسلمانوں میں ایسے ماہرین اقتصادیات اور سماجیات موجود نہ تھے جو تجزیہ کر کے اس پسماندگی کے اسباب معلوم کرتے، متوسط طبقے کے زیادہ تر تعلیم یافتہ مسلمان اسی ماضی کی جھوٹی شان وشوکت کے طلسم میں مبتلا تھے، جب مسلمان حکمرانوں کے دور میں ان کا تعلق خوشحال طبقے سے تھا۔ چونکہ ان میں گہرے سوچ و بچار کی اہلیت اور بصیرت نہیں تھی لہٰذا وہ فطری طور پر یہی سوچ سکتے تھے کہ انگریزوں نے ان سے اقتدار اور خوشحالی کا وسیلہ چھین لیا ہے۔ اس بنا پر وہ کہتے تھے کہ ان کی پسماندگی کا سبب برطانیہ ہے چونکہ ہندو، مسلم سلطنت کے دنوں میں اقتدار سے دور رہے اور اب مسلمانوں کے مقابلے میں وہ زیادہ بہتر حال میں تھے لہٰذا مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ ان کی بد حالی اور پسماندگی کا ایک سبب ہندو بھی ہیں۔ اس طرح آزادی سے پہلے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیدا ہوا آخر کار 23 مارچ 1940ء کے بعد مسلمانوں کے ایک الگ وطن کے طور پر پاکستان کا قیام مسلم لیگ کا مطالبہ بن گیا۔

یاد رہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم قرار دیا، حالانکہ ان کے ساتھ نو سو برس تک اکٹھے رہتے آئے تھے۔ انکا جغرافیہ، تاریخ اور کلچر مشترکہ تھا اور وہ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ہندوستان کے مشرق میں یعنی بنگال کے مشرقی حصے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس سے ایک ہزار میل دور پنجاب، سندھ اور سرحد کے صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس طرح پاکستان وجود میں آیا جو جغرافیائی طور پر پہلے ہی تقسیم تھا۔ پاکستان کی اکثریتی آبادی مشرقی پاکستان میں تھی جس میں بنگالی بولنے والے مسلمان آباد تھے۔ مغربی پاکستان میں چار صوبے تھے اور اس کے ہر صوبے میں مختلف نسلی اور لسانی گروہ کے لوگ رہتے آئے تھے۔ یہ تھے پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ ان میں پنجابیوں کی اکثریت تھی۔

MashalBooks.org

ہندوستان کا معاشرہ بالعموم ایک اَن پڑھ معاشرہ تھا اور اَن پڑھوں میں بھی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس کے باوجود نہ تو مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی رہنما اس بارے میں فکر مند تھے اور نہ مسلمان دانشوروں یا تعلیم یافتہ متوسط طبقے کو اس سلسلے میں کوئی تشویش لاحق تھی۔ مسلمانوں کے درمیان غور و فکر کرنے والے لوگ معدودے چند تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کا محنت کش طبقہ ہنر مند تھا اور تخلیقی ذہن رکھتا تھا، لیکن ان کا بالائی طبقہ ان خصوصیات سے محروم تھا اور کسی نے یہ بھی نہ کیا کہ مسلمانوں کے مفاد کی خاطر ان کی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانے کے اقدامات کرے، ایسے مسلمان سماجی مصلح، سماجی کارکن، قائد اور سیاست دان موجود نہیں تھے جو مسلسل سماجی اصلاحات کرتے، مسلمانوں سے ان کی کوتاہیاں دور کرتے اور ایک مہم کے ذریعے سیاسی بیداری اور سماجی شعور کو عام کرتے۔

بمبئی (ممبئی) میں بیسویں صدی کے اوائل تک تین کاروباری طاقتیں موجود تھیں۔ یہ صوبہ اقتصادی اور مالی طور پر ہندوستان کا دارالحکومت تھا اور ان تین طاقتوں میں مسلمان، پارسی اور انگریز شامل تھے۔ 1920ء کی دہائی میں اور اس کے بعد بھی مسلمان ایک کاروباری طاقت نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پارسیوں اور انگریزوں نے تو کاروبار کے جدید طریقے (Corporate Culture) اپنا لئے تھے، لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ پارسیوں نے 1879ء سٹاک ایکسچینج قائم کر لیا تھا۔ انہوں نے کاروبار کے جدید طریقے اختیار کر لئے تھے اور اپنے یہاں پیشہ ور منیجر ملازم رکھ لئے تھے۔

اس امر کے باوجود کچھ کاروباری برادریاں اور افراد ترقی کر کے انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ مثال کے طور پر میمن جو ملک کے اندر اناج اور تعمیراتی لکڑی کی تجارت پر قابض رہے اور بوہری تھے جن کا کم از کم آزادی کے زمانے تک لوہے، فولاد وغیرہ کی تجارت پر قبضہ رہا، ہندوؤں یا انگریزوں نے ان کو نقصان پہنچانے کی کوئی کوشش کی ہو، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ جائز تجارتی مسابقت ضرور ہوئی اس کی کوشش ہندو مارواڑیوں نے کی لیکن ناکام رہے۔ انتہائی کامیاب مسلمان تاجر اور نہایت کامیاب کاروباری خاندان بھی پیدا ہوئے۔ انہی میں ایک نہایت کامیاب کاروباری سر عبداللہ ہارون تھے جو ایک زمانے میں ہندوستان کے اندر چینی کے بادشاہ (شوگر کنگ) مشہور تھے۔ یا کاروباری خاندانوں میں ایک سرکردہ نام آدم جی کا تھا جس کے سربراہ سر عبدالواحد آدم جی تھے۔ برطانوی حکومت

نے اس سلسلے میں کوئی امتیاز برتا ہو اس کا ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حکومت نے ان کارناموں کو سراہا اور انہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔ کچھ اور کامیاب تجارت پیشہ خاندان تھے، جن میں اصفہانی خاندان بھی تھا۔ بدقسمتی سے ان میں کسی نے بھی جدید کاروباری کلچر اختیار نہیں کیا، نہ انہوں نے صنعتیں لگائیں اور نہ بینک کھولے۔ مسلمانوں کی کاروباری برادریوں نے اور تجارت پیشہ خاندانوں نے اور انفرادی طور پر کامیاب تاجروں نے اگر ایسا کیا ہوتا تو یقیناً وہی کامیابیاں حاصل کی ہوتیں جو ہندو اور پارسی تاجروں نے مثلاً برلا، ڈالمیا اور ٹاٹا نے حاصل کر لی تھیں۔ برلا اور ڈالمیا اور دوسرے ہندو کاروباری بھی انڈین نیشنل کانگریس کو چندہ دیتے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے، جو برطانوی راج کی سب سے بڑی مخالف تھی۔ اس طرح مسلمان تاجر بھی اگر آل انڈیا مسلم لیگ کو چندہ دیتے تو وہ بھی اس قدر اپنے آپ کو محفوظ پاتے۔

بینکنگ کے شعبہ میں مسلمان بہت دیر سے داخل ہوئے۔ بمبئی میں حبیب بینک اور لاہور میں آسٹریلیشیا بینک 1940ء کے ابتدائی برسوں میں قائم ہوئے۔ ان کو بے روک ٹوک بینکنگ کی اجازت تھی اور بھی کئی ہندوستانی قوموں کے بارے میں شواہد موجود ہیں جنہوں نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر تعلیم حاصل کی۔ ان میں بیشتر ہندو لیکن کچھ مسلمان بھی شامل تھے۔ ٹرانکور میں جس کا نام آزادی کے بعد کیرالا رکھا گیا۔ تقریباً ساری آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ یہ وہاں کے شہریوں کی مسلسل کاوش کا نتیجہ تھا جنہوں نے جگہ جگہ سوسائٹیاں اور انجمنیں بنائیں اور تعلیم پھیلائی۔ بمبئی پریسڈنسی میں جسے آزادی کے بعد مہاراشٹر کا نام دیا گیا اور گجرات میں تعلیمی سرگرمیوں کی ذمہ داری، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے سنبھال لی تھی۔ یہ تنظیم گوپال کرشن گوکھلے نیب نائی تھی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل کے ایک ہندو سیاستدان تھے۔ اس کام کو گوکھلے کے جانشینوں نے آگے بڑھایا۔ مسلمانوں میں واحد سماجی مصلح سرسید احمد خان تھے، جنہوں نے ایک مرتبہ حاصل کیا، لیکن ان کو گوکھلے کی طرح لائق و فائق جانشین نہیں ملے، لہٰذا مسلمان قوم تعلیم سے محروم اور ان پڑھ رہ گئی۔ 1930ء کے عشرے کے آخری برسوں میں اکیلے مسلمان قائد مولوی فضل الحق نے بنگالی مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ بھی کوئی 150 برس پیچھے رہ گئے تھے۔ اس لئے کہ ان سے پہلے ایشور چندر ودیا ساگر نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں

ہندو بنگالیوں میں تعلیم عام کرنے کا مشن شروع کر دیا تھا۔ اس سے قطع نظر مولوی صاحب سیاستدان دان زیادہ تھے انہوں نے اپنے کام کو منظّم طور پر چلانے کے لئے سوسائٹیاں نہیں بنائیں اور اپنے کام کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل نہیں دی۔ تعلیم محض ان کا ایک مشغلہ تھی پھر بھی ایک مفید کام تھا۔ یہ اور بات ہے کہ 1947ء میں آزادی کے بعد یہ کام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ مسلم قومیتوں میں ادارے تو کیا ہوتے فضل الحق جیسے افراد بھی کمیاب تھے۔

معاشی زندگی کے فروغ میں بھی ہندوؤں اور سکھوں میں اور پنجاب کے چھوٹے کاشتکاروں میں اپنی مدد آپ کی بنیاد پر کام کرنے کی مثالیں موجود تھیں۔ پنجاب کے مغربی حصے میں خاص طور پر پاکستان بننے سے پہلے کے پنجاب میں اس کی مثالیں زیادہ تھیں، جو اس صوبے کا غالب حصہ تھا۔ کمیونٹی یا برادری کے لوگوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی کسان کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائیں لیکن پنجابی مسلمانوں میں ایک بھی ایسا رہنما نظر نہیں آتا جس نے اس طرح کا کام کیا ہو۔ لہٰذا پنجاب کے مسلمان کسان غریب کے غریب ہی رہے۔ معاشی خوشحالی کے لئے اپنی مدد آپ کے اصول پر سب سے پہلے پارسیوں نے کام شروع کیا پھر ہندوؤں نے کیا، یہ کارپوریٹ کلچر یعنی مل جل کر کام کرنے کا رویہ تھا۔ پارسیوں نے کاروبار کو آگے بڑھانے کے لئے پبلک لمیٹڈ کمپنیاں بنائیں، بینک کھولے اور صنعتیں قائم کیں۔ 1879ء کے زمانے تک امداد باہمی کا یہ کلچر اتنا پھیل چکا تھا کہ بمبئی کے پارسیوں نے اپنا سٹاک ایکسچینج بھی قائم کر لیا تھا۔ بمبئی کی برطانوی کمپنیاں اور دیگر علاقوں کی کمپنیاں بھی اس کی رکن بن گئی تھی جب ہندوؤں نے امداد باہمی کا طریقہ اختیار کیا تو وہ بھی سٹاک ایکسچینج میں شامل ہو گئے۔ یہ اس امداد باہمی کے کلچر کی دین تھی کہ پارسیوں نے بہار کے جنوب مشرق میں واقع جمشید پور میں وہ سٹیل مل قائم کی جو پوری سلطنت برطانیہ میں سب سے بڑی مل تھی۔ یہ تھی ٹاٹا آئرن اینڈ سٹیل ملز لمیٹڈ اگرچہ ٹاٹا خاندان پارسیوں میں بہت دولت مند تھا لیکن اتنا سرمایہ تو ان کے پاس بھی نہیں تھا کہ اتنا بڑا صنعتی کارخانہ کھول لیتے یہ اس طرح ممکن ہوا کہ ہزاروں ہندوستانیوں نے اس کے حصے خرید لیے۔

مسلمان تاجروں میں میمن، بوہری، خوجہ، پنجابی سوداگان دہلی یا پنجاب کے چنویٹی شیخ کسی نے بھی امداد باہمی کا کلچر اختیار نہیں کیا۔ اس وجہ سے ہندوؤں اور پارسیوں کی طرح بڑے کاروباری اور صنعتی اداروں اور بینکوں کے مالک نہ بن سکے اور یہی وجہ تھی

MashalBooks.org

کہ وہ بعد میں مقابلے سے باہر ہو گئے۔

محکوم قومیں آزادی کے حصول کی جدوجہد محض اس لئے نہیں کرتیں کہ وہ انسانی وقار اور عزت نفس حاصل کریں اور قوموں کی برادری میں سر بلند ہوں بلکہ وہ معاشی خوشحالی بھی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اقتصادی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے پاکستان کو نہ صرف چین اور کوریا پر برتری حاصل تھی، جنہوں نے اپنا کام ملبے کے ڈھیر سے شروع کیا بلکہ ہندوستان پر بھی فوقیت حاصل تھی جو ویسے تو چین اور کوریا کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا، لیکن اپنی بھاری آبادی کی غذائی ضروریات کیلئے وافر اناج پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان نے اس قدر اناج پیدا کیا کہ ملک کے اندر استعمال کے بعد بہت سا اناج فالتو بچ گیا۔ اس نے کپاس اتنی بھاری مقدار میں پیدا کی جو بیشتر ہندوستانیوں کی ستر پوشی کیلئے کافی ہوتی۔ اس کپاس سے کپڑا بنانے کے بعد بھی اتنی مقدار بچ جاتی جس سے زرمبادلہ کمایا جا سکتا تھا۔ جانوروں کی کھالوں اور فالتو زرعی پیداوار کی بھی یہی صورت تھی۔ انجینئرنگ کے سامان تو لاہور اور وسطی پنجاب سے آزادی سے کئی سال پہلے بھی برآمد کئے جا رہے تھے۔

1997ء میں جب پاکستان اپنی گولڈن جوبلی منا رہا تھا چین اور کوریا کو ان کی اقتصادی ترقی کے کارناموں پر دنیا بھر میں احترام کے ساتھ سراہا جا رہا تھا یہاں تک کہ ہندوستان جو ان دونوں ملکوں سے بہت پیچھے رہ گیا تھا پاکستان سے پھر بھی آگے تھا۔ ہندو اور انگریز ان دو دشمنوں کے جانے کے بعد تو پاکستان کو بہت ترقی کر لینا چاہئے تھی لیکن اقتصادی طور پر پاکستان ایک دیوالیہ ملک اور مغربی طاقتوں خاص طور پر امریکہ کے رحم و کرم کا محتاج تھا۔

MashalBooks.org

باب 2

آزادی سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان

ایک قوت تھا کہ سارے شمالی ہندوستان میں ریاست کے احکام کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے ڈھنڈورچی ہوتے تھے جو ان الفاظ میں اعلان کرتے تھے۔ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا۔'' یہ 1857ء کی شورش سے پہلے کی بات ہے۔ اس ایک فقرے سے مثالی ہندوستان کی آئینی حیثیت بالکل صحیح طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اگرچہ مغل بادشاہ ملک کا مالک تھا لیکن ریاستی اختیارات برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھے۔ کمپنی نے یہ اختیار ایک ناقابل تنسیخ مختار نامے کے ذریعے بادشاہ کو پنشن دے کر حاصل کیا تھا۔ اس اختیار کی بنا پر کمپنی اس امر کی مجاز تھی کہ ملک کا نظم ونسق چلاتی اور قوانین اور ضابطے بناتی اور نافذ کرتی۔ یہ انتظام صرف شمالی ہندوستان اور ان مغل صوبوں تک محدود تھا جو معاہدہ الٰہ آباد کے تحت آتے تھے۔ یہ معاہدہ شاہ عالم دوئم اور لارڈ کلائیو کے تحت 1764ء کی جنگ بکسر کے بعد طے پایا تھا۔ اس جنگ میں مغلوں کی غیر منظّم فوج کو بری طرح شکست ہوئی تھی۔ مذکورہ معاہدے کے تحت مغل بادشاہ ریاستی اختیارات، خاص طور پر مالیے کی وصولی، نظم ونسق کی بحالی اور امن عامہ کے قیام کے لئے اختیارات سے کمپنی کے حق میں دستبردار ہو چکا تھا۔ اس معاہدے کا جن صوبوں پر اطلاق ہوتا تھا ان میں بنگال، بہار اور موجودہ اتر پردیش یعنی یوپی کے مشرقی حصے شامل تھے۔ مغربی یوپی مدھیہ پردیش کا بیشتر شمالی علاقہ، راجستھان اور پنجاب، دریائے ستلج کے مشرقی علاقے اس معاہدے میں 1803ء کے بعد شامل ہوئے جب لارڈ لیک نے یہاں سے ڈاکوؤں کے ایک گروہ پنڈاریوں اور ٹھگوں کا صفایا کر دیا تھا اور مرہٹہ جنگجو سندھیا کو علی گڑھ کے مقام پر زبردست

MashalBooks.org

شکست دی تھی۔ اودھ کو اس انتظام میں 1886ء میں کمپنی کے قبضے کے بعد شامل کیا گیا تھا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بمبئی، برطانیہ کے تصرف میں اس وقت گیا جب سترہویں صدی کے اواخر میں پرتگال کی شہزادی کی شادی برطانیہ کے بادشاہ سے ہوئی۔ مدارس اور تامل ناڈو کے بیشتر علاقے 1750ء سے پہلے کسی مقابلے کے بغیر انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے۔ مہاراشٹرا ک بیشتر علاقہ 1850ء تک کسی معاہدے کے تحت یا فتوحات کے ذریعے انگریزوں کے تصرف میں چلا گیا۔ یہ تھے جنگجو مرہٹے، پیشوا، بھونسلے، ہولکر اور گائیکواڑ جنہوں نے شکستیں کھائیں اور معاہدے کئے۔ یہی کچھ گجرات اور کاٹھیا واڑ میں ہوا، حیدرآباد ریاست کو فتح نہیں کیا گیا بلکہ 1748ء میں ایک معاہدے کی شرائط کے تحت یہ انگریزوں کی تولیت میں چلا گیا۔ صرف کرناٹک کو جسے میسور کہا جاتا تھا 1799ء میں فتح کیا گیا چنانچہ اس پر معاہدہ الہ آباد کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان کی جغرافیائی حدود اس وقت کچھ یوں تھی کہ ایک تو کاؤبیلٹ (Cow Belt) یا ہندی بیلٹ (ہندی بولنے والوں کا علاقہ) تھا۔ اس اصطلاح کو 1950ء اور 1960ء کے عشروں میں رواج ملا۔ اس میں یوپی، دہلی، ہریانہ، بہار اور وسطی صوبوں کے شمالی حصے جنہیں آج کل مدھیہ پردیش کہا جاتا ہے شامل ہیں۔ سترہویں، اٹھارہویں اور جزوی طور پر انیسویں صدی کے زمانوں میں ہندوستان سے اصطلاحی مراد صرف یہی علاقے تھے اگرچہ انگریزی کے لفظ انڈیا سے مراد جنوبی ایشیا کا پورا برصغیر تھا۔

1857ء کی بغاوت کے زمانے تک بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ حقیقی اور موثر حکمران برطانوی پارلیمنٹ پر بیٹھے ہوئے انگریز تھے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے حکومت کر رہے تھے۔ وسط ایشیا کا مغل محض ایک کٹھ پتلی تھا جسے کمپنی کا گورنر جنرل اپنی مرضی سے چلاتا تھا۔ وہ کمپنی کی کورٹ آف ڈائریکٹرز کے ذریعے برطانوی پارلیمنٹ سے ہدایات وصول کرتا تھا۔ 1857ء تک ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے کمپنی کے ڈائریکٹروں کی جانب سے اصول مقرر کئے جاتے تھے جو پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعے طے ہوتے۔ ڈائریکٹر صاحبان صرف کام کی مبادیات طے کرتے تھے۔ 1857ء کے بعد پارلیمنٹ نے تاج برطانیہ کے نام سے براہ راست حکومت کرنا شروع کی۔ ان قوانین پر وقتا

فوقتاً نظر ثانی ہوتی، جو ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے تابع ہوتی۔ اس صورتحال میں ایک اوسط ہندوستان کی قانونی اور سیاسی حیثیت قدرے بہتر ہوتی گئی وہ شاہ برطانیہ کا راست طور پر رعیت بن گیا۔ اب وہ بادشاہ کی رعیت یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کی رعایا نہیں تھا۔ 1857ء سے پہلے ایک عام شہری کی حیثیت غیر متعین اور مبہم تھی۔ بغاوت نے سبھی کی حیثیت واضح کر دی اور پارلیمنٹ کو براہ راست حکمرانی پر مجبور کر دیا۔

یہ صورتحال آئینی اور سیاسی طور پر تبدیل ہوئی ہو گی بلکہ قدرے بہتر ہو گئی لیکن ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑی کربناک تھی۔ متوسط طبقے کے مسلمان بالخصوص دہلی، ہریانہ، مغربی اور وسطی یوپی اور مدھیہ پردیش کے مسلمان خواب سے چونک کر جاگ اٹھے۔ وہ مسلمان جو اس وقت تک خواب کے عالم میں خود کو حکمران طبقے کے افراد سمجھتے آئے تھے اب اصل زندگی سے آشنا ہوئے۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ وہ ایک مفتوحہ قوم کے لوگ ہیں۔ لیکن وہ نفسیاتی صدمہ محض ذہن کی ایک کیفیت تھی۔ عملی زندگی میں اب انہیں ملازمتوں کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ درپیش تھا اور ایک الگ وحدت کے طور پر زندہ رہنا تھا جس کے لئے انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اب وہ دوسرے درجے کے شہری تھے اور وہ لوگ جو مقابلے سے جی چھوڑ بیٹھے تھے اب پہلے سے زیادہ پست ہمت اور نااہل ہوتے گئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے بالائی اور متوسط طبقے کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ اس کے علاوہ حکمران طبقے سے تعلق کی بنا پر مسلمانوں نے تجارت اور کاشتکاری سے احتراز کیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ غیر حاضر جاگیردار ہوتے ہوئے دوسروں کی محنت کے بل پر زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے اگرچہ بہت سے مسلمان ماہر کاریگر اور دستکار تھے لیکن وہ بھی ہندو کاروباریوں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے جو انہیں ان کے کام کے مطابق اجرت نہیں دیتے تھے۔ ایسا محض کسی تفریق کی بنا پر نہیں ہوتا تھا کیونکہ ہندو کاریگروں اور دستکاروں کے ساتھ بھی ان کا وہی سلوک ہوتا تھا۔ ہندو ہوں یا مسلمان یہ ان کے لئے ساہوکارے (ہندوستان میں غیر رسمی بینکنگ) کا اصول تھا۔ یہ ان لوگوں کی ایک مستقل محرومی تھی۔ مزید یہ کہ انگریز انہیں ہمیشہ باغی طبقے میں شمار کرتے تھے، اس طرح ان کی قابلیت اور بھی کچلی جاتی تھی چونکہ بالائی طبقے کے کچھ مسلمانوں نے باغی سپاہیوں کی مدد کرتے ہوئے بغاوت میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا لہٰذا وہ آئندہ کئی برسوں تک زیر عتاب

رہے۔ بمشکل چند مسلمان ہونگے جن میں یہ اہلیت یا ہمت تھی کہ خود پر ہونے والے عتاب کو ریکارڈ پر لاتے۔

انگریزوں کے عتاب کی نوعیت تو عبوری ہوتی اور گزر جاتی لیکن مسلمانوں کی مستقل محرومی جس نے ان کو کچل کر رکھ دیا تھا ان کی پست حوصلگی، مقابلے کی اہلیت کی کمی اور تعلیم یا گزر اوقات کے لئے پیشہ وارانہ تربیت سے محرومی تھا۔ المیہ یہ ہے کہ وہ صورتحال کوئی اچانک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ 1803ء سے پہلے بھی اتھل پتھل اور شورش پیدا ہوئی تھی اور کم از کم ایرانی حملہ آور نادر شاہ کے حملے کے بعد سے ہی نراج کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ ایسے خلفشار اور نراج کے دور میں ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مسلمان تو امن اور سکون کی زندگی، جنگ پلاسی کے بعد ہی سے گزارتے آئے تھے۔ یہی امن اور سکون کی کیفیت 1740ء کے بعد سے مدارس پریسڈنسی کی تھی جس میں تامل ناڈو اور آندھرا اور ٹرانکور جسے بعد میں کیرالا کہا گیا کے علاقے شامل تھے۔ مسلمان قوم ایسے مفکر اور مصلح پیدا کرنے میں ناکام رہی جو اپنی قوم کی دردناک کیفیت کے اسباب معلوم کرتے اور ان کے مسائل کا حل دریافت کرتے۔ کاغذ کا ایک پرزہ بھی دستیاب نہیں جس سے یہ پتہ چلتا کہ مسلمانوں کو اپنی حالت پر تشویش تھی یا وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر رہے تھے۔ مسلمان مفکر شاہ ولی اللہ نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جو خطوط لکھے تھے انہیں حال ہی میں ہندوستان میں پروفیسر خلیق نظامی نے مرتب کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے شاہ عالم دوئم کے نام اپنے خطوط میں جو برائے نام بادشاہ تھے ان کی توجہ انتشار میں مبتلا سماجی اور اقتصادی صورت حال کی طرف دلائی تھی اور کاشتکاروں کی بدحالی کی جانب انہیں متوجہ کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے حکمران پر زور دیا تھا کہ فیض پر مبنی ایک محصولاتی پالیسی نافذ کی جائے اور ٹیکس کی وصولی کے کام کو انسانی بنیادوں پر چلایا جائے۔ لیکن بادشاہ تو محض نمائشی تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ بھی انہیں صورتحال سے آگاہ کرنے میں ناکام رہے۔ عقل یہ بات سمجھنے سے عاجز ہے کہ 1803ء کے بعد بھی کوئی ایک مسلمان مفکر، دانش ور یا عالم اس طلسم سے آزاد ہو کر یہ نہ سوچ سکا کہ ایک کٹھ پتلی حکمران، جو انگریزوں کی پنشن سے لال قلعہ میں اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا وہ ایک خودمختار بادشاہ کیسے ہو سکتا تھا اور اس کی قوم، ایک آزاد قوم کس طرح ہو سکتی تھی۔ مغل بادشاہ 1803ء سے

پہلے بھی باری باری مرہٹہ جنگجو سندھیا یار وہیلہ حملہ آور غلام قادر کے ماتحت رہ چکا تھا۔ لال قلعہ کے پنشن خور اکبر ثانی کی بے بسی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ہندو بنگالی دانش ور اور مصلح راجہ رام موہن رائے کو راجہ کا خطاب دے کر اپنی پنشن میں اضافے کی پیروی کی خاطر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں سے ملاقات کے لئے بھیجا تھا۔ دراصل فارسی زبان میں ایک لطیفہ ان دنوں اکبر ثانی سے جو شاہ عالم کے والد تھے، منسوب تھا کہ ''سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم''۔ اس سے مراد یہ تھی کہ ہندوستان کے بادشاہ کی سلطنت دلی سے پالم تک جو تین میل دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے محدود تھی۔

1857ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے معمول کی زندگی کا آغاز کیا۔ اب ان میں پہلا سا وہ زعم باطل نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس ملک کے حکمران ہیں۔ پلاسی کی نمائشی جنگ میں شکست کے بعد کسی نے بھی صورتحال کا معروضی انداز سے تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح مغل بادشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کو لگان وصول کرنے کے جو اختیارات دیئے تھے اس کے مطابق برطانوی انتظامیہ کے پیدا کردہ گہرے اثرات کو سمجھنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ 1803ء کے بعد جب دہلی برطانوی عمل داری میں چلی گئی تھی اس تمام زمانے کا بھی کوئی تجزیہ نہیں کیا گیا۔ اس وقت تک انگریزوں کی عمل داری دریائے ستلج تک پھیل چکی تھی۔

مشرقی یورپ اور بہار میں 1764ء میں انگریزوں کی آمد سے پہلے اور یوپی کے باقی علاقے اور مدھیہ پردیش میں 1803ء میں ان کی آمد تک مسلمان، مرہٹوں اور جاٹوں کی مسلسل مداخلت کے باوجود بہتر حیثیت کے مالک تھے۔ برطانیہ کے قبضہ کے بعد ان کی ترجیحی حیثیت ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی برتری ختم کرنے اور ایک لحاظ سے ہندو اکثریت کو اپنے ساتھ ملانے کے لگان داری کے قانون میں تبدیلی کی۔ اس کا مقصد کسانوں کی طرف داری تھا جو بشتر ہندو تھے اور ساتھ ہی مسلمانوں کو نیچا دکھانا تھا جو زمیندار تھے۔ مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ زمینوں کے مالک تھے اب زمین کے مالک کو قانونی طور پیداوار میں کسی طرح کے حصے سے محروم کر دیا گیا تھا اسے صرف لگان ملتا تھا۔ یہ گویا کسان کی طرف سے اراضی کو استعمال کرنے کا کرایہ تھا۔ کسان کو اس سے بھی زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ زمین پر مسلسل تین سال کاشت کرنے کے بعد جو اب

موروثی ہو چکی تھی کسی کسان کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زمیندار عملاً ریاست کی جانب سے لگان وصول کرنے پر متعین تھا کیونکہ لگان کا ایک حصہ حکومت کے خزانے میں مال گزاری کے طور پر جمع کر دیا جاتا تھا۔ زمین کی صرف وہ قطعہ جو خود کاشت یعنی سیر کہلاتا زمیندار کی ملکیت ہوتا تھا لیکن یہ نہایت مختصر حصہ ہوتا اور اسے بھی اجرت پر دیا جاتا تھا، خود کاشت اس پر بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگان داری کے قانون میں ایک سقم کی وجہ سے ہوتا رہا۔ دوسرا قطعہ اراضی جو زمیندار کی ملکیت ہوتا وہ باغ تھا۔ یہ قطعہ بھی مختصر ہوتا اور اسے سال کے سال پھلوں کے بیوپاریوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا۔ چنانچہ یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش میں زمیندار اب بھی زمیندار تھا تاہم کسانوں کو دبانے کے معاملے میں اس کی اہلیت کم رہ گئی تھی لیکن تمام تر ختم نہیں ہوئی تھی۔

فطری بات ہے کہ بڑے زمینداروں اور چھوٹے مالکان اراضی کو بھی یہ صورتحال پسند نہیں تھی۔ 1857ء کے دور میں بہتوں کو یہ امکان نظر آیا کہ انگریزوں کو نکال باہر کر دیا جائے گا اور ان کی سابقہ مراعات بحال ہو جائیں گی۔ بہت سے جاگیرداروں اور زمینداروں نے اپنی حیثیت کے مطابق اس بغاوت کی حمایت کی۔ بعضوں نے اعلانیہ اور کچھ دوسروں نے چھپ کر صرف چند افراد ایسے تھے جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی۔ جب بغاوت ختم ہو گی تو انگریزوں نے یہ بندوبست کیا کہ وہ زمیندار اختیارات سے یکسر محروم ہو جائیں اور اگر کوئی اور بغاوت ہو تو اس وقت یہ بااثر نہ ہوں۔ البتہ جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی تھی انہیں مناسب انعام سے نوازا گیا۔

برطانوی ہند کے صوبوں میں سے صرف ایک صوبہ پنجاب میں مسلمان ارباب اقتدار نہ صرف اپنی جگہ برقرار رہے بلکہ ان کے مال اموال میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ پنجاب میں مسلمانوں کا کردار بالکل برعکس تھا۔ یہاں انگریزوں کا مقصد چونکہ سکھوں کے اقتدار کو کچلنا تھا لہٰذا ممدوٹ، ٹوانے اور قزلباش جیسے خاندان برطانوی راج کے فطری حلیف ہو گئے بلکہ لازمی ضرورت بن گئے۔ پنجاب کے مسلمان جاگیردار جنہوں نے سو سال بعد پاکستان کی سیاست میں زبردست افراتفری پیدا کی، ہندوستان میں برطانیہ کے سب سے زیادہ وفادار حلیف بن گئے۔ تنومند پنجابی کھیت مزدور جن پر جابر جاگیداروں کی کڑی گرفت تھی برطانوی ہند کی فوج میں جنگ کا چارہ بنا دیئے گئے۔ دو عالمی جنگوں میں پنجاب رجمنٹ اور

MashalBooks.org

اس کی فتوحات کو بھی شہرت ملی۔ یاد رہے کہ انیسویں صدی میں برطانوی پالیسی نے پنجاب اور بنگال کے دوصوبوں پر جنہیں بعد میں پاکستان بننا تھا گہرے اثرات ڈالے۔ پنجاب میں مسلمان جاگیردار خاندانوں کو بڑی طاقت حاصل ہوئی اسکے مقابلے میں بنگال، مرشد آباد اور ڈھاکے کے مسلمان زمیندار تباہ و برباد ہو گئے۔

یہاں مسلمان نہیں بلکہ سکھ مراعات یافتہ شمار ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے انگریزوں کی آمد کا خیر مقدم کیا لہٰذا انگریزوں نے مسلمان جاگیردار کی حوصلہ افزائی کی جو غیر منقسم پنجاب کے مغربی حصے میں ایک بڑی طاقت تھے۔ 1849ء کے فوراً بعد جب پنجاب انگریزوں کی عملداری میں چلا گیا۔ 1857ء کی بغاوت نے سر اٹھایا۔ مغربی پنجاب میں جاگیرداروں نے شکر گزاری کے جذبے کے تحت انگریزوں کی مدد کی۔ فوجی رنگروٹوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد آگے چڑھائی کی۔ یہ عیسیٰ خیل، میانوالی، شاہ پور (موجودہ ضلع سرگودھا) اور ٹیکسلا سے آئے تھے اور سب کے سب مسلمان تھے۔ پنجاب کے نصف مشرقی حصے کے کچھ سکھ بھی شامل ہو گئے تھے۔ بریگیڈیئر نکلس ان کی سراہی کر رہا تھا انہوں نے میرٹھ کو باغیوں سے چھڑا لیا اور بالآخر لکھنؤ تک پورے مغربی اور وسطی یوپی کو فتح کر لیا۔ مسلمان جاگیرداروں کے نہایت اہم کردار کی تفصیلات چیفز اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب (پنجاب کے سرکردہ اور ممتاز خاندان) میں درج ہیں۔ یہ دستاویز میجر ڈبلو ایل کونر ان اور مسٹر ایچ ڈی کریک نے حکومت پنجاب کی ہدایات پر 1909ء میں مرتب کی تھی۔

پنجاب سے یہ دو مثالیں بآسانی مل جاتی ہیں۔ ایک مثال صوبیدار صاحب خان ٹوانہ کی ہے جن کا تعلق ضلع شاہپور کے گاؤں مٹھا ٹوانہ سے تھا۔ اس کی غیر منظم فوج نے زبردست کردار ادا کیا۔ چنانچہ انہیں کلرا جاگیر کے طور پر ایک وسیع قطعہ اراضی دیا گیا۔ یہ 1857ء میں ان کی خدمات کا انعام تھا۔ ملک خضر حیات خان ٹوانہ جو آزادی سے پہلے پنجاب کے آخری وزیراعلیٰ تھے وہ صاحب خان ٹوانہ کے بعد جاگیر کے مالک بنے۔ دوسری سرکردہ شخصیت سردار سکندر حیات خان کے پردادا تھے۔ وہ سر خضر سے پہلے پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے۔ سکندر کے پردادا نکلسن کے اردلی یا ذاتی ملازم تھے۔ انہوں نے بڑی وفاداری سے ان کی خدمت کی تا آنکہ انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ نکلسن کی خواہش کا

MashalBooks.org

احترام کرتے ہوئے واہ میں ان کے اردلی کو ایک بڑا قطعہ اراضی دیا گیا۔

برطانیہ کے لئے مسلمان جاگیرداروں کی حمایت تو سمجھ میں آتی ہے لیکن سکھوں کی امداد حاصل کرنا، جنہوں نے بمشکل چھ سال قبل شکست کھائی تھی برطانیہ کی سیاسی فراست اور تدبر کا نتیجہ تھی۔ انگریزوں نے بہت جلد ہی انہیں اپنا حلیف بنا لیا۔ لاہور، سیالکوٹ اور دوسرے شہروں میں مسلمان اس بغاوت کے حمایتی تھے لیکن ان کے اثر و رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر کچھ تھی تو لاہور کے نہایت بااثر قزلباش خاندان کی موجودگی میں بے اثر ہوگئی، جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ قزلباشوں نے جو شیعہ تھے لکھنؤ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ وسط یورپی کے اودھ علاقے کو جہاں شیعوں کی اکثریت تھی انگریزوں کے خلاف شورش سے محفوظ رکھنے میں ان کا کردار بہت اہم تھا۔

سندھ کی صورت حال پنجاب سے قدرے مختلف تھی۔ یہاں پنجاب کے سکھوں سے زیادہ بلوچوں نے طویل عرصے تک حکومت کی تھی۔ بلوچ سردار، تالپور کے میر سندھ میں کلہوڑوں کو حکومت سے بے دخل کر چکے تھے۔ بلوچ سرداروں نے سندھ کے وسیع قطعات اراضی اپنے ہی بلوچ سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیئے تھے۔ مقامی سندھی مسلمان جاگیرداروں کی طرف سے انگریزوں کی امداد کی نوعیت وہی تھی جو پنجاب کے جاگیرداروں کی تھی۔ ہندو چونکہ ساہوکار، غیر رسمی قسم کے بینکار تھے اور روپوں کا لین دین کرتے تھے وہ مہاجن اور تجارت پیشہ تھے لہٰذا پنجاب اور سندھ دونوں جگہوں پر وہ انگریزوں کے حمایتی تھی۔

انگریزوں نے سندھ فتح کر کے ممکن ہے غلطی کی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ انہوں نے وہاں کے عوام کو انتہائی جابردانہ جاگیرداری قبائلی نظام سے بچا لیا تھا۔ ابتدائی زمانے کے انگریز افسروں کے بموجب انہوں نے اپنی انگریزی سلطنت کی خوشنودی کیلئے ایسا کیا۔ ان دنوں سندھ میں کیا حالات تھے؟ یہ جاننے کے لئے ایسٹ وک، برٹن اور نیپیئر کی تحریریں پڑھ لینی چاہئیں۔ جھوٹے مقدمے بنانا، ملزم کو حراست میں لے کر اسے شدید اذیت دینا اور الزام ثابت ہونے سے پہلے سزا دینا، یہ معمول کے جاگیردارانہ طور طریقے ہیں، جنہیں انگریز پاکستانی علاقوں میں سو سال حکومت کرنے کے بعد چھوڑ گئے۔ انگریز بہر طور وڈیروں پر نظر رکھتے تھے اگرچہ ان کے طریقوں کو انہوں نے ختم نہیں کیا کیونکہ ان سے

MashalBooks.org

ان کے شاہانہ مفادات کی توسیع اور تحفظ میں آسانی ہوتی تھی۔ (2)

پنجاب کا جاگیردار اسی بناء پر کہ انہوں نے 1857ء میں انگریزوں کی بڑی مدد کی تھی ان کے لئے بے حد اہم تھا، اور روس سے قریب ہونے کے باعث اپنی جغرافیائی حیثیت سے بھی یہ علاقہ اہم تھا۔ پھر یہ کہ اس علاقے میں سلطنت برطانیہ کے مستقبل کے لئے ان کا وجود بہت ضروری تھا اور یوں بھی وہ علاقہ انگریز کی شاہی فوج میں بھرتی کا علاقہ تھا اس لئے بھی بہت اہم تھا۔ انکو انگریزی راج کا ہمنوا بنائے رکھنا اور دلجوئی کرتے رہنا بہت ضروری تھا۔ یہی وہ مصلحت تھی جس کے تحت پنجاب میں خاص قوانین اور ضوابط مرتب کئے گئے اور خاص طور پر لگان داری کے ضوابط بنائے گئے۔ پنجاب کا جاگیردار صحیح معنوں میں اپنی زمین کا مالک اور آقا تھا۔ 1857ء میں جو خدمات اس نے انجام دی تھیں یہ بیشتر نوازشیں انہی خدمات کے صلے میں تھیں یا اس سے قبل سکھوں کے خلاف جنگ میں دی جانے والی امداد کے عوض تھیں۔ (3)

مزارعہ کی مشقت کے نتیجے میں جو کچھ پیدا ہوتا، جاگیردار صحیح معنوں میں اس کا کلیتاً مالک تھا۔ یہی مزارعہ کھیت میں بیج ڈالتا تھا، مشقت کرتا تھا، سود خور بنیئے سے قرض کا بندوبست کرتا، جس کی بہت بھاری شرح ہوتی تھی کھاد اور کھیت میں ہل چلانے کے لئے ہل بھل سب کچھ وہی مہیا کرتا تھا۔ اس میں مزارعے کا حصہ جاگیردار کی فیاضی پر منحصر ہوتا، پنجاب میں لگان داری کا وہ قانون نافذ نہیں تھا جو یوپی یا بہار یا ہندوستان کے دیگر علاقوں میں رائج تھا۔ البتہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد اس سے مستثنیٰ تھے۔ زمانہ وسطیٰ کے برطانیہ اور یورپ میں جو کھیت مزدور ہوتے تھے جاگیر کا مالک، ان کی تقدیر کا مالک، ان کے گھر اور تمام املاک یہاں تک کہ عورتوں کا بھی مالک ہوتا تھا۔ کسان کی خدمات جبری محنت کسی وقت بھی حاصل کی جا سکتی تھیں، جسے مقامی زبان میں بیگار کہتے یعنی بلا اجرت خدمت۔ یہاں بھی کسان، یوں کہنا چاہئے کہ از منہ وسطیٰ کے کھیت مزدور، اس زمین سے بھی کسی وقت اٹھائے جا سکتے تھے جس پر وہ کاشت کرتے تھے اور جاگیردار کی منشاء کے تحت ان کی تمام املاک یہاں تک کہ عورتیں بھی چھینی جا سکتی تھیں۔ کسانوں کو کسی قانونی چارہ جوئی کو اختیار حاصل نہیں تھا کیونکہ ان کے سرے سے کوئی حقوق تھے ہی نہیں۔ 1930ء تک جاگیرداروں کے یہاں کوئی قیادت نہیں تھی۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ کانگریس کے

ایک حمایتی فضل حسین نے اپنی پارٹی چھوڑ دی اور پنجاب کے جاگیرداروں کو قیادت مہیا کر دی۔ فضل حسین ایک تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے بیرسٹر تھے۔

پنجاب کی سماجی زندگی پر جاگیردارانہ نظام کا گہرا اثر تھا۔ ذرا سوچئے کہ مسلم اکثریت کے اس وسیع وعریض علاقے میں جاگیردار طبقے کے افراد کے سوا کسی کو بھی سماجی حقوق حاصل نہیں تھے اور کھیت میں کام کرنے والے کو تو سرے سے حقوق میسر ہی نہ تھے وہ کمی کہلاتے، یعنی ادنیٰ درجے کے مزدور جو جاگیردار کے آگے چارپائی یا کرسی پر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ انہیں زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جسے آئندہ دور میں پاکستان کا قلب بننا تھا۔ جاگیردار کھیت مزدور یا کسان کو موت کی سزا بھی دیتے تھے لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہوگا کیونکہ انگریزی انتظامیہ اس سلسلے میں اپنے قانون کی سختی سے پابندی کرتی تھی تاہم جاگیردار کے حکم پر جب ایسی اموات ہوتیں تو پولیس مختلف وجوہ کے تحت اور اس لئے بھی کہ اسے جاگیردار سے پابندی سے رقم ملتی رہتی تھی ان اموات کو حادثاتی قرار دیتی تھی، البتہ جاگیرداروں کے حلقہ اثر سے باہر باقی پورے پنجاب میں، برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں کی طرح، قانون کی سختی سے پابندی ہوتی۔

سندھ کا حال کم وبیش پنجاب جیسا تھا۔ بلوچستان میں بلوچوں کا علاقہ، جہاں سرداروں نے نجی جیلیں بنا رکھی تھیں اور بھی خراب حال تھا۔ سندھ میں اور پنجاب کے جاگیرداروں کے علاقے میں عام لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ ان کی نجی جیلیں خفیہ نوعیت کی ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس کا پتہ چل گیا تو ضلع کے گورا صاحب کا عتاب نازل ہونا یقینی ہوگا، انگریزی حکومت اپنے ضابطوں کی بالادستی اور قانون کے احترام پر بہت زور دیتی تھی اگر جاگیردار کوئی قتل کر دیتا تھا یا اس کے حکم سے کوئی قتل ہو جاتا تو یہی کارروائی اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

پختون معاشرہ میں مساوات قدرے زیادہ تھی لہٰذا صوبہ سرحد اور بلوچستان کے پختون علاقے میں حقوق انسانی کی صورت حال ذرا بہتر تھی۔ پختونوں میں پیش امام کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور خان یا پختون سردار کے ساتھ سبھی لوگ برابر کی پروقار حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ خان جو ایک پنجابی یا سندھی جاگیردار اور بلوچ سردار کے برابر کی حیثیت رکھتا تھا وہ برابر والوں کے درمیان اول درجے پر فائز ہوتا۔ اگرچہ ہر بالغ مرد رائفل سے مسلح ہوتا،

MashalBooks.org

لیکن پختون علاقوں میں قتل شاذونادر ہی ہوتا۔ بلوچستان کے قبائل یا جاگیرداروں کے علاقے کی نسبت سے بہت ہی کم لیکن ایک بار کوئی قتل ہو جاتا تو انتقامی قتل کا سلسلہ سالہا سال تک چلتا رہتا۔ یہ بات بھی پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے مختلف تھے۔ سندھیوں اور پنجابیوں کے مقابلے میں پختون نماز، روزے اوردیگر دینی ضوابط کی بڑی سختی سے پابندی کرتے لیکن ان کی سماجی زندگی پختون ولی کے ضابطے کے تحت تھی۔ یہ ایک قبائلی ضابطہ ہے اور کچھ زیادہ اسلام نہیں ہے اگر ان دونوں ضوابط کے درمیان اختلاف ہوتا تو ترجیح بہرحال پختون ولی کو حاصل ہوتی۔

پنجابی اور سندھی جاگیردار آزادی کے بعد اور اس سے پہلے بھی اچھے منتظم نہیں تھے۔ ان کے کسان غلاموں کی طرح مشقت کر کے ان کے لیے جو روپیہ کماتے تھے اس کی قدر و قیمت کا ان کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اخراجات میں کمی نہیں کر سکتے تھے اور نہ اپنی زندگیوں میں کسی طرح کا بجٹ یعنی جمع وخرچ کا حساب رکھتے تھے اور نہ اپنی زندگیوں میں کسی طرح کا بجٹ یعنی جمع وخرچ کا حساب رکھتے تھے۔ وہ بالعموم آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے، ناچنے گانے والیوں کی سرپرستی کرتے، شراب بیچنے والوں سے رابطہ رکھتے، مرغ بازی اور کتوں اور گھوڑوں کی دوڑ اور ایسے ہی دیگر مشاغل میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ اس طرز زندگی نے انہیں ہندو ساہوکاروں کا مقروض بنا دیا تھا جو انہیں بھاری شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ جاگیردار اس کی خاطر اپنی زمین گروی رکھ دیتے تھے۔ آزادی کے بعد ہندو ساہوکار یہاں سے چلے گئے تو جو زمین گروی رکھی گئی تھی وہ واپس پنجابی اور سندھی جاگیرداروں کو مل گئی۔

لاہور کے ایک صحافی منیر احمد منیر نے چند اہم سیاسی شخصیات سے انٹرویو کر کے ان کا بیان شائع کیا ہے۔[4] ان کی کتاب میں ایک انٹرویو عبدالحمید دستی کا بھی ہے۔ وہ جنوبی پنجاب کے جاگیرداروں والے علاقے مظفر گڑھ کے ایک تعلیم یافتہ اور بہت بڑے تو نہیں، تاہم ایک جاگیردار تھے۔ 1947ء سے 1958ء تک وہ کئی بار وزیر مقرر ہوئے اور ایک مرتبہ تو وزیراعلیٰ بھی ہوئے۔ دستی نے بڑے تاسف کے ساتھ مسلمانوں کی قابل رحم اقتصادی حالت بیان کی تھی۔ ان کے بقول انہی کے ضلع کا بڑا جاگیردار، ایک ہندو ساہوکار صاحب رام کا مقروض تھا۔ تمام مقروض جاگیردار ساہوکار کو بڑی حقارت سے صابح کا نا

یعنی ایک آنکھ والا صاحب کہتے تھے۔ نواب اپنے نوکر سے کہتے، مجھے ملتان جانا ہے، جا اور صاحب کا ناسے سو روپے مانگ کر لا۔ ملتان مظفر گڑھ سے بہت دور نہیں ہے لیکن نواب کو تو نوکر چاکر ساتھ لے کر دھوم دھام سے جانا ہوتا تھا۔ ویسے نواب نیک خصلت آدمی تھا، مطلوب یہ کہ شراب، عورت اور جوئے کی لت میں مبتلا نہیں تھا جو جاگیرداروں کے پسندیدہ مشاغل ہوتے ہیں، لیکن وہ بھی افلاس کا مارا ہوا تھا۔ ہندو ساہوکار نواب سے ملاقات کے لئے آتا اور کہتا ''حضور'' میں نے آپ کے آدمی کو سو روپے دیئے تھے اور آپ کے حساب میں پچاس من گندم لکھ لی ہے۔'' منڈی میں پچاس من گندم کی قیمت دو سو ہوتی تھی۔ اس طرح سود کی شرح سو فیصد سالانہ تھی۔ اس کے باوجود نواب نے اصطبل میں پندرہ گھوڑے پال رکھے تھے اور ہر گھوڑے پر ایک سائیس مقرر تھا۔ چھوٹے ہوں یا بڑے، پورے پنجاب میں جاگیرداروں کا یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ملتان کے ایک جاگیردار پر ایک ملتانی ساہوکار بلاقی کا 80 لاکھ روپے کا قرضہ تھا۔ اس کا بیٹا سیاست میں بہت اونچا گیا۔ کچھ عرصہ کے لئے پنجاب کا وزیراعلیٰ بھی رہا۔ اس کا شمار صف اول کیس یاست دانوں میں ہوتا تھا۔ وہ پہلا سیاست دان تھا جس نے یونینسٹ پارٹی کے زوال کا اندازہ کر لیا تھا۔

ایک طرف تو وعدے پر مبنی تحریروں سے حاصل کی جانے والی رقوم کا فیصلہ ہر چھ ماہ بعد فصل کی فروخت کے موقع پر ہوتا، دوسری طرف بڑی بڑی رقوم زمین کو گروی رکھ کر حاصل کی جاتی تھیں۔ ایسا شخص کبھی بھی قرض کی ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہوتا تھا۔ بہت کم ہی جاگیردار ہوں گے جن پر قرض کا بوجھ نہ ہوتا ہو اور جن کی زمین ہندو ساہوکاروں کے یہاں گروی نہ رکھی گئی ہو۔ پنجابی اور سندھی جاگیردار قرض کی ادائیگی میں ناکام رہتے چنانچہ گروی رکھی ہوئی زمینیں ان کے ہاتھوں سے نکل جاتیں۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو کے ایک سابق پروفیسر (تاریخ) ڈاکٹر مبارک علی کا بیان ہے کہ سندھ کے ہندو ساہوکار سندھ کی 27 فیصد اراضی پر 1936ء کے زمانے تک قابض ہو چکے تھے جبکہ 13 فیصد ان کے پاس گروی تھیں یعنی ان کے قبضے میں آنے کے لئے تیار۔ سندھ کی 40 فیصد زرعی اراضی 1936ء تک یا تو ہندوؤں کے قبضے میں تھیں یا ان کے پاس گروی تھیں۔ سندھ کے ہندوؤں کا دعویٰ تھی کہ وہ چونکہ جاگیردار نہیں تھے اس لیے بہتر منتظم اور کاروباری تھے اور ان کا یہ دعویٰ درست تھا۔ سندھ میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب اس وقت 27 فیصد تھا۔

MashalBooks.org

سندھی مسلمان جاگیرداروں کی اراضی پر ساہوکاروں کا قبضہ ممکن ہے، 1936ء تک محض 40 فیصد رہا ہو لیکن آزادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے یہ تعداد 40 فیصد تک پہنچ گئی تھی۔ (5) آزادی کے وقت سندھ کی معیشت کی کیا صورت تھی۔ اس بارے میں پروفیسر سلیم ایم میاں کا ایک مضمون اردو روزنامہ جنگ کے مڈویک میگزین مطبوعہ 15 نومبر 1995ء میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے ایک سرکردہ سندھی جاگیردار کے حوالے سے جو 1990ء کی دہائی میں بہت مشہور تھا یہ لکھا کہ پاکستان کے قیام سے پہلے اس کے خاندان کی 70 فیصد اراضی گروی ہو چکی تھی۔ انہوں نے ضلع دادو کے ایک اور جاگیردار کے حوالے سے لکھا کہ اس کے بقول اگر پاکستان دس برس بعد قائم ہوتا تو سندھ میں کوئی مسلمان جاگیردار باقی نہ رہتا۔ بدانتظامی مشرفانہ طرز زندگی، وسائل سے بڑھ کر خرچ کرنے کی عادت اور دوسرے لایعنی مشاغل کی وجہ سے وہ قرضے کی مد میں اپنی ساری زمینیں گنوا چکے ہوتے۔ پاکستان نے پنجابی اور سندھی جاگیرداروں کو ان کے منطقی انجام یعنی دیوالیے پن سے بچا لیا تھا۔

پنجاب کے جاگیردار احساس محرومی میں مبتلا تھے۔ انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کی قیادت تازہ فکر سے محروم تھی۔ کوئی نئی بات سوچنے، منصوبہ بنانے اور منظم زندگی گزارنے کے تصور سے ان کا ذہن عاری تھا۔ یہ وہ پریشان کن حالات تھے جن میں متوسط طبقے کے ایک نہایت ذہین مسلمان بیرسٹر سر فضل حسین ان کے تحفظ کے لیے آ پہنچے۔ پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی اپریل 1927ء میں قائم ہوئی۔ سر محمد اقبال، سر فیروز خاں نون، سر رحیم بخش، چوہدری ظفر اللہ خاں، سردار سکندر حیات خاں، شیخ عبدالقادر اور نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ تازہ فکر میاں فضل حسین سے ملتی تھی۔ (6)

جب سر فضل حسین نے ان کے مقاصد کی پیروی شروع کی، اس وقت یعنی 1920ء کے عشرے میں بھی جاگیرداروں کے مسائل نہیں تھے۔ خرابی کی علامتیں تو بہت پہلے انہی دنوں ظاہر ہونے لگی تھیں جب آرتھر برانڈرتھ 69-1968ء میں ملتان کے کمشنر تھے ان کی ریونیو رپورٹ اس صورتحال پر خاصی روشنی ڈالتی ہے کہ ہندو ساہوکار طبقے کو اراضی کی ملکیت کی یہ رضاکارانہ منتقلی اپنے اندر سیاسی خطرات رکھتی تھی۔ مالکان اراضی میں ایک آدھ ہی کوئی ہندو ہوگا باقی سب مسلمان تھے اور مسلمان ہنرمندی اور ہوشیاری سے

یکسر محروم تھے جس کے نتیجے میں ان کی زمینیں ہندو تاجروں کے حوالے ہوتی جا رہی تھیں۔ ''ساہوکاروں نے جاگیرداروں میں بہتری پیدا نہیں کی ہو گی لیکن یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے زمینیں حاصل کر کے عام لوگوں پر احسان کیا۔'' برطانیہ کی خواہش تھی کہ پنجاب کی سیاسی روایت کے مطابق معاشرے میں ایک مضبوط دیہی بنیاد قائم ہو اور اسے مستحکم بنایا جائے۔ یہیں سے کسی نوع کے لینڈ ایلیینیشن ایکٹ (انتقال اراضی کا قانون) بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں، انڈین سول سروس کے بہت سے انگریز افسروں نے مثلاً جان مینارڈ نے ایسے کسی قانون کو غیر منصفانہ قرار دیا لیکن سیاسی مصلحت کے تقاضے حاوی رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ لینڈ ایلیینیشن ایکٹ کے تحت زمینداروں سے جو بیشتر مسلمان تھے ہندو ساہوکاروں کی جانب اراضی کا منتقل ہونا نہایت مشکل ہوتا گیا۔ قیام پاکستان کا حاصل یہ تھا کہ سارے قرضے معاف ہو گئے۔قرض وصول کرنے والے ہندو رفو چکر ہو گئے۔ اس طرح پاکستان نے جاگیرداروں کو اور جاگیرداری نظام کو بچا لیا۔ اسی نظام اور انہی جاگیرداروں نے اس کے عوض 1990ء کی دہائی میں پاکستان میں لاقانونیت پیدا کی، سول سوسائٹی یعنی ایک شائستہ شہری معاشرے کو تباہ کر دیا اور پاکستان کے وجود خطرے میں ڈال دیا۔ [7] آرتھر برانڈرتھ اور دوسرے برطانوی سول افسروں کی وہ رپورٹیں جو انہوں نے پنجاب کے دیہی حالات کے بارے میں لکھی تھیں، لاہور کے سول سیکرٹریٹ میں باقیات کے طور پر رہ گئیں۔

سندھ کی طرح پنجاب کے حالات بھی تشویشناک تھے لیکن پنجاب کے پاس ایک عظیم دور اندیش رہنما تھا۔ یہ سر فضل حسین تھے جنہوں نے پنجاب کی قانون ساز اسمبلی میں پنجاب لینڈ ایلیینیشن ایکٹ (Punjab and Alienation) منظور کروایا۔ اس ایکٹ کے تحت پنجاب میں غیر زراعت پیشہ افراد کے لیے زمین کی ملکیت کو ممنوع قرار دیا گیا اور ہندو ساہوکاروں کو غیر زراعت پیشہ قرار دے دیا گیا۔ یہ قانون نہایت غیر منصفانہ تھا لیکن اس نے جاگیرداری نظام کو پوری طرح دیوالیہ ہونے سے بچا لیا۔ سندھ میں ایسا کوئی قانون نہیں تھا۔ اس لئے سندھ کے جاگیردار تیزی کے ساتھ اپنی زمینوں سے محروم ہو جاتے تھے۔

اب چند الفاظ آزادی سے پہلے کے پنجاب اور سر فضل حسین اور ان کے کردار

MashalBooks.org

کے تعلق سے بھی اس سے اس زمانے کی پنجابی سیاست کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ سر فضل حسین اگرچہ یونینسٹ پارٹی کے بانی اور اس کے لیڈر تھے جو بڑی حد تک جاگیرداروں کی پارٹی تھی لیکن نہ تو وہ دیہات کے رہنے والے تھے اور نہ جاگیردار تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے شہری اور مشرق پنجاب میں پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ امرتسر میں 1919ء میں جب انگریزوں کے ہاتھوں جلیانوالہ باغ کارسوائے زمانہ قتل عام ہوا اور اس صدی کا پہلا مارشل لا پنجاب میں نافذ ہوا اس وقت سر فضل حسین کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر تھے۔ اس سانحہ کے وقت وہ جیل میں تھے۔ انہوں نے اپنے سیاسی خیالات پر نظر ثانی کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس ملک کی اور اس صوبے کی خدمت کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اقتصادی اور سماجی ترقی کیلئے انگریزوں سے تعاون کیا جائے۔ سر فضل حسین کے خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ یہی سوچا تھا۔ اس زمانے میں تقریباً تمام بااثر مسلمان مالکان راضی تھے اور ان میں مسلمانوں کی قیادت کرنے کا اہل بمشکل ہی کوئی ہوگا۔ جاگیردار طبقے کی قیادت تو الگ رہی جن میں تعلیم پہلے ہی بہت کم تھی۔ جاگیردار طبقہ چونکہ قیادت سے محروم تھا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ وہ بیشتر مسلمان تھے لہٰذا انہوں نے متوسط طبقے کے ایک شخص کو غالباً خاصے تامل کے ساتھ اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ بعد میں پنجاب کے عوام کی خدمت کرنے کے صلے میں نہیں سرکا خطاب دیا گیا۔ سر فضل حسین کی مدد چھوٹو رام کر رہے تھے۔ جو ادنیٰ طبقے کے ایک ہندو تھے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ دونوں کی فرقہ وارانہ سیاست کو پنجاب میں سیاسی طور پر داخل نہ ہونے دے دیا جائے۔

سر فضل حسین کی سیاست نے پنجاب کے زراعت پیشہ طبقے کی مدد کی، ان میں ہندوؤں کی تعداد بہت کم تھی۔ اگرچہ وہ خطاب یافتہ تھے لیکن وطن سے ان کی محبت مسلمہ تھی۔ انہوں نے دوسرے صوبوں کے لیڈروں کو یہاں تک کہ قومی سطح کے لیڈروں کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ پنجاب میں ہندو مسلم یگانگت کے ماحول کو خراب کریں۔ سر سکندر حیات نے جو سر فضل حسین کے جانشین تھے اور بڑے جاگیردار تھے انہوں نے بھی اپنے پیش رو کی تقلید کی۔ اگرچہ وہ 1940ء میں پاکستان کی قرارداد لاہور پیش کرنے والوں میں شامل تھے لیکن وہ ایک محبّ وطن پنجابی تھے اور ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ پنجاب کی تقسیم تو

دور کی بات تھی۔

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کوئی ایک دن میں، ایک ہفتے یا ایک سال میں بلکہ ایک عشرے میں تو نہیں آیا اسے آنے میں تو سو سال لگ گئے۔ یہ معمول کے حملوں کی طرح نہیں تھا۔ یوں کہئے کہ یہ ایک آسان ٹیک اوور تھا۔ یعنی انگریزوں نے بڑی سہولت سے ہندوستان کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ 1707ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد مغل شہزادوں میں تخت شاہی کے لیے خانہ جنگی شروع ہوگئی اور امن عامہ کی صورت بگڑتی چلی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد بیس سال کے اندر ایک ضابطہ حکومت کا وجود ختم ہو چکا تھا اگرچہ ملک کا انتظام پرانی ڈھیلی ڈھالی وضع کے ساتھ چلتا رہا۔ حکومت تو ڈھیر ہو چکی تھی لیکن بہت کم کسی نے یہ بات محسوس کی کیونکہ بادشاہ خواہ کتنا ہی بے اختیار ہو اقتدار کی علامت کے طور پر تخت پر براجمان تھا، لیکن جب ایران کے لٹیرے نادر شاہ نے 1739ء میں دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو نام نہاد اقتدار کا بھرم بھی جاتا رہا۔

سارے جنگجو گروہ مختلف علاقوں میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑتے رہے۔ ایک شہ زور شخص یا سردار، دوسرے کے خلاف لڑتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی سے کمپنی کی شرائط پر مدد لیتا رہا۔ اس کا آغاز دکن سے ہوا۔ جب حیدرآباد میں نظام کے تخت کے ایک دعویدار نے کمپنی کی مدد سے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت شاید ہی کسی نے کسی اعلیٰ مقصد یعنی ملک کے لئے مادر وطن کے لیے یا اسلام کے لیے نجگ ہو۔ سب اپنے اپنے مفادات کے لئے لڑتے رہے۔ ان میں غالباً دو شخص تھے، ایک حیدر علی جو کمانڈر تھے دوسرا ان کا بیٹا ٹیپو سلطان، جنہوں نے براہ راست اور بڑی دلیری کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کی۔ اس وقت کوئی قوم نہیں تھی۔ کوئی ملک نہیں تھا کوئی سماجی نظام نہیں تھا۔ دراصل کوئی منظم شہری معاشرہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ پھر کسی کے غدار یا حب اوطن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر فرد کی ہمدردی اپنی ذات کے ساتھ تھی یا اپنے خاندان کے ساتھ تھی۔

کمپنی نے 1757ء میں جنگ پلاسی کے بعد دہلی کے بادشاہ سے براہ راست نبٹنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بنگال، آسام، اڑیسہ، بہار اور مشرقی یوپی کے بعض علاقوں میں مال گزاری وصول کرنے کے لئے شاہی فرمان حاصل کر لیا۔ چنانچہ کمپنی نے انتظامات

MashalBooks.org

سنبھال لیے۔ انہوں نے رسمی طور پر ایک اچھی خاصی رقم بادشاہ کو بطور خراج ادا کی حالانکہ درحقیقت وہ پنشن تھی۔ بادشاہ اس کے لئے بہت شکر گزار ہوا کیونکہ وہ اپنی رعیت سے زیادہ لگان وصول نہیں کر پاتا تھا۔ بادشاہ کی رعیت نے بھی اسکا خیر مقدم کیا چونکہ کمپنی کے ماتحت علاقے میں بہت جلد امن بحال ہو گیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔ تجارت، ترقی کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی بہت سے تاجر اپنے علاقوں سے نکل کر کلکتہ منتقل ہونے لگے یا کمپنی کے زیر انتظام علاقوں کا رخ کرنے لگے۔ ہندوستان کے جنگجو سرداروں کے مقابلے میں کمپنی زیادہ جابر نہیں تھی۔

آزادی سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ اور وحشیانہ مظالم کی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں لیکن اس بارے میں کوئی باقاعدہ لکھی ہوئی تاریخ یا کوئی مصدقہ علمی کام دستیاب نہ تھا۔ انہی میں سے ایک کہانی یہ تھی کہ کمپنی کے اہلکاروں نے ڈھاکہ کے مسلمان جولاہوں کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کاٹنے شروع کر دیئے تھے تاکہ وہ ڈھاکہ کی ململ بنانے کے لائق نہ رہیں اور بیروزگار ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 1612ء سے صنعتی انقلاب کے زمانے تک اور 1780ء میں سوتی ملوں کی تنصیب تک یعنی کوئی پونے دوصدی تک روساء کے لئے قیمتی ململ اور عام آدمی کے لئے سوتی کپڑے، ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے انگلینڈ اور یورپ کو برآمد کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی حیثیت دستکاری کی تھی صنعت کی نہیں تھی کیونکہ ایک کاریگر ایک وقت میں ایک ہی سوتی دھاگہ کاٹ سکتا تھا اور ایک شخص ایک ہی کرگھے پر کپڑا بنتا تھا۔ یہ دونوں کام نہایت سست رفتار تھے اور اس بنا پر مہنگے بھی تھے۔ اس کے برعکس ملوں کے اندر ہزاروں دھاگوں کی مضبوطی اور خوبصورتی سے بنت اور ایک پاور لوم پر کپڑا بنتا تھا، اس عمل نے کپڑے کو بہت سست کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہندوستان کا کپڑا مقابلہ نہ کر سکا اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں سوتی کپڑوں کی دکانیں بند ہو گئیں۔ یہ انگوٹھے کاٹنا علامتی تھا حقیقی نہیں تھا۔

1803ء تک سکھوں اور میروں کی بادشاہی کو چھوڑ کر سارا ہندوستان کمپنی کی عملداری میں آ گیا تھا۔ اگرچہ یہ عمل مرحلہ وار ہوا تھا۔ جب کسی علاقے میں خلفشار پیدا ہوتا اور کمپنی کا کاروبار متاثر ہوتا تو اس کے فوجی دستے معمول کا کاروبار بحال کرنے کے لئے اس علاقے میں پہنچ جاتے۔ لوگوں کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کمپنی کے زیر انتظام

MashalBooks.org

علاقے میں ان کے اپنے علاقوں کی بہ نسبت امن اور سکون قائم ہے اول الذکر علاقوں میں زبردست لاقانونیت ڈکیتی اور لٹیرے سرداروں کی سرپرستی میں انتشار کا دور دورہ تھا۔ کمپنی کی فوجوں کو آسانی سے جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اس کا سبب مقامی آبادیوں کا لٹیرے کی حمایت سے انکار تھا اور یوں بھی چونکہ کمپنی کی فوج بھی غالب اکثریت خود ہندوستانیوں کی ہوتی تھی اس لیے ان کو بیرونی حملہ آور نہیں سمجھا جاتا تھا۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے مغلوں کے دور میں سیاسی زمین ریاست کی ہوتی تھی۔ اسے مختلف افراد کو مقررہ مقاصد کے تحت دیا جاتا تھا۔ مثلاً گھڑ سوار فوج کا دستہ رکھنے کے لیے، ایک خاص علاقے کے اندر سڑک کی دیکھ بھال کے لیے اور اسی طرح دوسرے کاموں کے لیے۔ متعلقہ شخص کی وفات کے بعد ریاست کے اہلکار زمین کو وہ قطعہ واپس لے لیتے تھے اور اسے کسی دوسرے شخص کی سپردگی میں دے دیتے، جو مرنے والے کا وارث بھی ہوسکتا تھا۔ اگرچہ زمین پر اس کا موروثی حق نہیں تھا۔ کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے اس طریقے کو مستقبل بندوبست میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح انہوں نے زمین کی نجی ملکیت کو متعارف کیا اور جاگیرداری قائم کی۔ اس طرح جو جاگیردار پیدا ہوئے وہ صرف کمپنی کے وفادار ہوتے تھے۔ یہی وہ جاگیردار تھے جنہوں نے کمپنی کے استحکام کو یقینی بنایا۔ مغلوں کی ریاست نے اورنگزیب کی وفات کے کوئی بیس سال بعد تک زمین پر اپنے مالکانہ حق کو برقرار رکھا، لیکن ریاست کے اختیارات کو جوں جوں زوال آتا گیا بہتوں نے زمینوں کو ذاتی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا اور ریاست کا اختیارات برائے نام باقی رہ گیا۔ ریاست کا زمین کی ملکیت سے محروم ہونا ایک طویل مدت پر محیط تھا اور یہ سارا عمل بہت سست رفتار تھا، وہ مسلمان جن کے پاس زمین نہیں تھی، جن کی بڑی خاصی تعداد تھی انہوں نے ملازمت اور وہ بھی برطانوی عملداری میں سرکاری ملازمت کو ترجیح دی، لیکن ان میں چونکہ تعلیم کی کمی تھی اس لیے معمولی درجے کی نوکریوں تک ہی پہنچ سکے۔ گجراتی بولنے والی مسلمان قومیتوں میں ''میمن'' بوہری اور خوجے یہ صرف تین قومیں ایسی تھیں جن کے ممبئی، گجرات اور کاٹھیا واڑ میں کاروبار کرتے تھے۔ کاروبار کرنے والے مسلمان ہندوستان کے طول وعرض میں صرف چند علاقوں تک محدود تھے۔ ان میں پنجاب کے اندر چنیوٹی شیخ، دہلی میں پنجابی سوداگران اور چند دیگر صوبوں میں مختصر تعداد میں لوگ تھے۔ ان حالات میں

ہندوستانی مسلمان اقتصادی طور پر پسماندہ رہ گئے۔

کچھ مسلمان اعلیٰ درجے کے کاریگر تھے اورا پنے ہنر میں ہندوؤں سے بہت آگے تھے، لیکن وہ حالانکہ ہندو تاجروں کے رحم و کرم پر تھے جو ان کی صناعی اور کاریگری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ خود تو بھاری منافع کماتے لیکن کاریگروں کو چاہے وہ ہندو ہوتے یا مسلمان نہایت معمولی اجرت دیتے۔ بس اس قدر کہ آئندہ کیلئے بچت نہ کر سکیں کیونکہ اگر بچت ہو گی تو دست کار اپنی معاشی آزادی کا حق استعمال کریں گے جو تاجروں کے مفاد کے صریحاً منافی تھا۔ بیشتر حالات میں مسلمان کاریگروں کو مقروض رکھا جاتا تھا تاکہ وہ ہندو تاجروں کے دست نگر اور ان کی خواہشوں کے تابع رہیں جس طرح مسلمان، مالکان اراضی اس مقصد کے تحت انہیں افاس میں مبتلا رکھتے تھے، مزید انہی حالات نے ہندوستانی مسلمان کے معاشرے کو ایک جاگیردارانہ معاشرہ بنائے رکھا۔ ایسا معاشرہ جس کے شہریوں میں کوئی اپج باقی نہیں رہی اور جن میں اپنے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے کارناموں پر اترانے اور جھوٹا غرور جتانے کا رویہ پیدا ہوتا ہے حالانکہ ان میں اپنے اجداد کی خوبیوں کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ مسلمان، معاشی طور پر انتہائی پستی میں تھے۔ یہی حقیقت تھی جس کا اقرار محمد علی جناح نے نومبر 1944ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پلاننگ کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا۔ ازمنہ وسطی کے یورپ کی طرح از منہ وسطی کے ہندوستانی جاگیردارانہ معاشرہ میں بھی ان طبقات کے لئے شدید حقارت پائی جاتی تھی جو زندگی گزارنے کے لئے محنت مشقت کرتے تھے۔ تجارت، کاروبار، دستکاری، صنعت گری اور مالیات کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اسے ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں یہ کیفیت اس لیے بھی زیادہ شدت سے پائی جاتی تھی کہ ہندو معاشرہ ذات پات کی تقسیم کے اصول پر قائم تھا۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی ذات پات کی تقسیم کا نظام اپنا لیا اور اس کے ساتھ ہی کاروبار، صنعت اور کاریگری کے لئے تحقیر آمیز رویہ اپنا لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا کوئی نہ تھا جو یہ بتاتا کہ کوئی اقلیت خواہ مذہبی ہو یا نسلی اس وقت زندہ اور خوشحال رہ سکتی ہے جب وہ اپنی خوبیوں میں اکثریتی آبادی سے آگے نکل جائے۔ اس کے لیے ان میں تخلیقی اپج حوصلہ مندی اور تعلیم کی ضرورت ہو گی اور سرمایہ کاری درکار ہو گی تاکہ ایوان ہائے تجارت قائم کریں۔ صنعتیں لگائیں، بینک کھولیں

اور ایسے باعلم لوگ پیدا کریں جو مسلمان اقلیت کو بصیرت اور رہنمائی مہیا کریں۔

مغلوں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے حالات مایوس کن تھے، اس سے کہیں زیادہ مایوس کن حالات از منہ وسطی یورپ میں یہودیوں کے تھے۔ یہودیوں نے اپنی صلاحیت سے کام لیا، تعلیم حاصل کی۔ تجارت کے شعبے میں داخل ہوئے۔ بینک اور مالیاتی ادارے کھولے، وہ سارے کام کئے جو یورپ کے مسیحی جاگیردارانہ معاشرے میں غیر وقیع سمجھے جاتے تھے۔ یہودیوں نے سمجھ لیا تھا کہ کوئی اقلیت اکثر آبادی کے برابر حقوق حاصل نہیں کر سکتی۔ یہودیوں نے امریکہ پہنچنے کے بعد وہی کیا جو وہ یورپ میں کر رہے تھے یعنی تعلیم، تجارت اور مالیات کے شعبوں میں گھس گئے۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعے اپنی قوم کا مزاج بدل دیا، اس طرح ان کی تقدیر بدل دی۔ بیسویں صدی کے آخر تک یہودیوں نے یہ صلاحیت پیدا کر لی کہ کسی سیاسی کوشش کے بغیر وہ ریاست کی طاقت کو اپنے تصرف میں لے کر اسے حسب منشا استعمال کر سکتے تھے۔

قریب تر مثال آزادی سے پہلے ہندوستان میں انیسویں صدی کے اندر پارسیوں کی ہے انہوں نے بھی وہی کیا جو طریقہ سترہویں اور انیسویں صدی میں یہودیوں نے یورپ میں اختیار کیا تھا۔ سرکردہ پارسیوں نے 1879ء میں بمبئی میں سٹاک ایکسچینج قائم کیا۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ جب پارسیوں کے سٹاک ایکسچینج نے کام شروع کیا اس وقت جاپان میں میجی انقلاب (Meiji Revolution) کو بمشکل گیارہ سال گزرے تھے۔ اس وقت جاپان میں سوت کاتنے کی بمشکل دو تین اسپننگ ملیں تھیں۔ یہ بھی ریاست کی اپنی ملیں تھیں، صنعت کاروں کی نہیں تھیں کیونکہ اس وقت تک ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس وقت کوئی کیپیٹل مارکیٹ نہیں تھی۔ اس معاملے میں ہندوستان ایشیا کے ہر ملک سے آگے تھا کہ اس نے اپنے یہاں ایک کاروباری کلچر قائم کیا۔ سٹاک ایکسچینج کھولا اور اس طرح ایک کیپیٹل مارکیٹ پیدا کی۔ پارسیوں نے جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور کیپیٹل مارکیٹ میں پیش پیش ہوتے ہوئے دور اندیشی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔

مسلمانوں کی کاروباری برادریوں میں، خواہ میمن ہوں، بوہری ہوں یا خوجے ہوں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ انہوں نے پارسیوں کی طرح کاروباری کلچر اختیار کرتے ہوئے سٹاک ایکسچینج میں آگے بڑھنے کا ثبوت دیا ہو بلکہ مسلمان کاروباری تو اور بھی پیچھے

MashalBooks.org

چلے گئے۔ اس بات کی تصدیق جناح صاحب کی تقریروں سے ہوتی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق بیسویں صدی کے اوائل تک ممبئی میں قومی سطح کے چالیس یا پچاس مسلمان تاجر تھے۔لیکن 1945ء میں ایک بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے 5 نومبر 1944ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی پلاننگ کمیٹی میں بڑی دلخراش تقریر کی۔ قائد نے کہا تھا حالیہ برسوں میں مجھے بہت سی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا اور جہاں بھی گیا میں نے مسلمانوں کی معیشت کو ادنیٰ ترین سطح پر پایا۔ یہاں تک کہ ممبئی میں کوئی چالیس سال پہلے تک اور وہ مجھے یاد ہے جب مسلمان شہر کی معاشی زندگی میں نہایت اہم حیثیت کے مالک تھے لیکن رفتہ رفتہ نکال باہر کئے گئے۔ اس زمانے میں جن تین قومیتوں نے ممبئی کی اقتصادی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ وہ تھے، مسلمان پارسی(9) اور انگریز۔ چالیس کے دوران میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں سب سے زیادہ نقصان مسلمان کا ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ مسلمانوں نے کاروبار کے انتظام میں پیش قدمی اور اہلیت کا ثبوت نہیں دیا اور ان خوبیوں سے محرومی کی بنا پر مقابلے سے نکال دیئے گئے۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جناح صاحب نے جن کا تعلق کاروباری برادری سے ہی تھا اور جو مسلمانوں کی اندوہناک صورتحال سے واقف تھے انہیں یہ شعور نہیں دیا کہ کاروبار میں پوری طرح شامل ہوں۔ کاروباری کلچر اختیار کریں۔ تجارت کے جدید طریقے اپنائیں، پیشہ ور ٹیچر ملازم رکھیں اور ساتھ ہی بینک اور صنعتی ادارے کھولیں۔ جناح صاحب ممبئی میں رہتے ہوئے جو ہندوستان کا کاروباری دارالحکومت تھا، یہ کام بہتر طور پر کر سکتے تھے، مسلمانوں کا یہی حال تھا جس کے بارے میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا کہ ''تعلیم یافتہ مسلمان جسے اپنی پرانی تربیت پر پورا پورا بھروسہ ہے اپنے آپ کو اقتدار اور سرکاری مراعات میں اپنے حصے سے جس پر پہلے اس کا اجارہ تھا محروم پاتا ہے اور یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ اور زندگی کے دیگر فائدے قابل نفرت ہندو کے ہاتھوں میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں..... ملکہ کی مسلمان رعیت کے سلسلے میں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ہم ان کی بجا آوری میں ناکام رہے۔ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی یعنی کوئی تین کروڑ مسلمان برطانوی اقتدار کے تحت خود کو غارت ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ وہ وقفے وقفے سے اب تک اپنے پرانے قومی احساس اور جنگجویانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں لیکن دوسرے تمام معاملوں میں یہ وہ نسل ہے جو

MashalBooks.org

برطانوی حکومت میں تباہ و برباد ہو رہی ہے۔"(10)

فاتح اور طاقت ور برطانوی راج کے ہاتھوں مسلمانوں کو جو صدمہ اپنے مفروضہ اعلیٰ منصب کے جانے سے ہوا اور اس خیال نے کہ ان پر بہت ظلم ہو رہا ہے، انہیں مایوسی کی انتہائی پستیوں میں دھکیل دیا۔ یہ وہ حالات تھے جب سید احمد خاں نے جو عدلیہ میں ایک سرکاری ملازم تھے اپنی کتاب اسباب بغاوت ہند لکھی۔ سید احمد نے اس کے باوجود کہ وہ ایک شکست خوردہ قوم کے فرد تھے معذرت خواہی سے کام نہیں لیا۔ نہایت صریح انداز میں اور منطقی استدلال کے ساتھ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ بغاوت کا سبب کمپنی کے ملازموں کی بداندیشی اور ان کا ظالمانہ طرز حکومت تھا۔ مسلمانوں نے بطور خاص اور ہندوستانیوں نے بہ اعتبار مجموعی اس ظالمانہ سلوک کو خاصے عرصے تک بڑے صبر سے برداشت کیا۔ جب خاصے عرصے تک حالات بہتر نہ ہوئے تو لاوا پھٹ پڑا۔ سید احمد خاں نے منطقی اور معقول پیرائے میں یہ ثابت کر دیا کہ آئندہ کسی دھماکے سے بچنے کے لئے انگریزوں کو چاہئے کہ اصلاح احوال کے لئے کوئی بڑی کارروائی کریں۔ انہوں نے اپنی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کرایا اور لندن میں تمام اہم سیاست دانوں کے نام بھیجا۔ اس کے علاوہ مقامی انگری افسروں میں تقسیم کیا۔ اس طرح کسی قدر لیکن موثر طور پر اطمینان کی صورت نکلی۔

سید احمد خاں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ محض اکیلے نو آبادیاتی حکمران اپنے بہترین ارادوں اور کوششوں کے باوجود صورتحال کی اصلاح تادیر نہ کر سکیں گے۔ یہ تو مسلمانوں کو خود ہی کرنا پڑے گا اور اس سے پہلے یہ سمجھنا ہو گا کہ ان کا معاشرہ ایک بوسیدہ اور زوال آمادہ معاشرہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے معاشر کو بہتر بنانا ہو گا۔ اس کام کیلئے مضبوط قوت ارادی اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے پختہ عزم کی ضرورت ہو گی۔ سید احمد خاں کو پختہ یقین تھا کہ یہ کام وہی قوم کر سکتی ہے جس میں ذہنی کشادگی ہو اور جو روادار، کشادہ دل، روشن خیال اور گردوپیش کی دنیا کے حالات سے باخبر ہو۔ سید احمد خاں نے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ مسلمانوں میں یہ ساری خوبیاں ان کے زریں دور میں پائی جاتی تھیں۔ یہ خوبیاں انہوں نے ایک اسلامی سماجی نظام کے تحت تعلیم سے حاصل کی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اپنی خوبیوں کو

MashalBooks.org

دوبارہ پانے کے لئے جدید تعلیم حاصل کریں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے اسلامی تشخص کی تجدید اور اسلامی نظام زندگی کے قیام کی تدبیر، ایک غیر ملکی اقتدار کے تحت رہتے ہوئے جس حد تک ممکن ہو کریں۔

''وہ سید احمد خاں ہی تھے، جنہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو تاکید کی کہ اپنے طرز زندگی پر قائم رہیں لیکن جدید تعلیم کے لوازم کو نظر انداز نہ کریں۔ انہوں نے اس امر پر اصرار کیا کہ مسلمانوں کو اپنی ہر کوشش کرتے ہوئے ایک بڑی برادری اور اس کی تنظیموں میں شامل رہنا چاہئے لیکن انگریز حکمرانوں سے جو زیادہ طاقت ور ہیں جس حد تک ممکن ہو، تعلیم حاصل کرنا اور ان کے تجربوں کو اپنے اندر جذب کرنا چاہئے۔ تعلیم، طاقت کے برابر ہے۔ سید احمد خاں نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمان اپنے ہندو حریفوں کے مقابلے میں اپنا دفاع اس وقت کر سکیں گے جب ان میں ہندوؤں کے برابر اہلیت پیدا ہو گی۔ بہ الفاظ دیگر ایک اسلامی ریاست کو اس وقت بچایا جا سکے گا جب مسلمان یورپی دنیا میں رائج حکمرانوں کے طور طریقوں کو سیکھ کر انہیں استعمال کریں گے۔ (11) دراصل سید احمد کو اس وقت صاف نظر آ گیا تھا کہ اگر انگریز عجلت میں ہندوستان سے نکل گئے تو مسلمان گھاٹے میں رہ جائیں گے کیونکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔'' (12)

سید احمد خاں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد 1871ء میں انگلینڈ چلے گئے۔ وہ ایک جدید مہذب معاشرے کے طرز عمل کو بذات خود سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کا بیٹا تعلیم کی غرض سے پہلے ہی انگلینڈ میں تھا۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ میں اپنی تحریک کا آغاز کیا اور اس کے لئے پہلے ایک سکول کھولا۔ اگرچہ روایتی تعلیم نظام کے تحت خود انہوں نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور درس نظامی سے فارغ ہو کر نکلے تھے لیکن سید ایک مستقبل بین، انتہائی روشن خیال اور کشادہ ذہن کے آدمی تھے۔ ان کی تعلیمی کوششوں کا مقصد مسلمانوں کو روشن خیال بنانا، اور ان میں تحقیق و تلاش کا ولولہ پیدا کرنا تھا۔ تعلیم کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر تعلیم برائے سرکاری ملازمت سے کہیں آگے تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے سائنس پر بہت زور دیا۔ سائنس نے اس وقت تک کاروباری وسعت حاصل نہیں کی تھی۔ اس میں تجارتی قدر و قیمت نہیں آئی تھی۔ سائنس کا مقصد محض روشن خیالی اور انسان میں فطرت شناسی کیلئے تجسس کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اپنی مہم کے آغاز کے

MashalBooks.org

لئے انہوں نے علی گڑھ کا انتخاب کیا کیونکہ کچھ سرکاری عہدیدار سید کی فکر سے اتفاق کرتے تھے اور انہوں نے ایک تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے کئی ہزار ایکڑ زمین دے دی تھی۔ وہ جو ایک سکول تھا بڑھ کر کالج اور پھر یونیورسٹی بن گیا۔علی گڑھ ایک ایسے صوبے میں واقع تھا جہاں مسلمانوں کی آبادی محض 14 فیصد تھی۔ بہرحال سید احمد خان، ان علاقوں سے جہاں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی، یعنی ملتان، بہاولپور، لاڑکانہ اور سانگھڑ سے کسی ایک مسلمان جاگیردار بھی سکول کے قیام میں حصہ لینے کے لیے تحریک پیدا نہ کر سکے۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے آزادی کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قلب بننا تھا۔

سید احمد خاں نے قومی مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے پیغام کو جگہ جگہ پہنچانے کے لئے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ برطانوی حکومت ان کی کتاب سے بہت متاثر ہوئی۔ ان کے نزدیک 1857ء کے غدر جسے واقعہ کے آئندہ امکان کو روکنے کے لئے مسلمانوں کے حالات کو بہتر بنانا، انتہائی اہم کام تھا۔ سید کو کلکتہ کی امپیریل کونسل کا رکن بنایا گیا۔ یہ ایک مشاورتی ادارہ تھا۔ یہ ہندوستانی عوام ا کا ایک ایسا ادارہ تھا جہاں لوگوں کے مسائل کو سامنے لانا اور حکومت کو ان کی طرف توجہ دلانا تھا۔ سر کا خطاب پانے کے بعد اب وہ سر سید احمد خاں تھے۔ حکومت اور رعیت کے درمیان جو بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں، انہیں دور کرنے کے لئے سید احمد کی خدمات کو سراہا اور ان کا اعتراف کیا گیا تھا۔

سر سید کی تحریک مقبول ہونے لگی لیکن سست رفتار کے ساتھ اور محدود سطح پر۔ انہی سے تحریک اور ولولہ حاصل کر کے لاہور میں اسلامیہ کالج، پشاور میں اسلامیہ کالج اور کراچی میں سندھ مدرسے کا قیام عمل میں آیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی ادارہ یونیورسٹی نہ بن سکا۔ البتہ سید احمد کے پیغام کا ہندوستان کے مسلم اقلیتی علاقوں میں اور ان میں پنجاب کا مشرقی علاقہ شامل تھا، پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ بدقسمتی سے اس پیغام نے، پنجاب کے جنوبی، جنوب مغربی اور مغربی علاقے میں کسی کے دل میں کوئی تحریک پیدا نہیں کی اور نہ کوئی اندرون سندھ میں ٹس سے مس ہوا۔ کراچی اگرچہ سیاسی اعتبار سے پسماندہ اور جاگیردارانہ سندھ کا حصہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ گجراتی بولنے والوں کا ایک ترقی پذیر ضلع تھا جہاں تعلیم، تجارت اور کلچر کے شعبوں میں ہندوؤں اور پارسیوں کا غلبہ تھا۔ لاہور اگرچہ سیاسی اور ثقافتی طور پر پنجاب کا حصہ تھا لیکن یہاں مسلمانوں کا محض ایک تعلیمی ادارہ اسلامیہ کالج

MashalBooks.org

تھا۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں اور سکھوں کے بہت سے ادارے تھے۔ بہرطور انیسویں صدی کے آخر تک وہ سکول جسے سید نے قائم کیا تھا ان کی وفات سے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج یا ایم اے او کالج بن گیا۔ یہاں سائنس اور فنون کے کئی شعبوں میں ایم اے تک تعلیم دی جانے لگی تھی۔ سرسید نے کسی ذات پات، رنگ و نسل یہاں تک کہ مذہب کا امتیاز کئے بغیر یہاں ٹیچروں اور پروفیسروں کی ایک بڑی تعداد کو جو مرعوب کن علمیت رکھتے تھے، اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں مشہور انگریز سکالر مثلاً پروفیسر آرنلڈ سر تھیورڈ بیک شامل تھے۔ دونوں مسیحی تھے۔ عظیم شہرت کے مالک ریاضی دان پروفیسر چکرورتی جو ایک بنگالی ہندو تھے اور ایسے ہی دوسرے اساتذہ تھے۔ پروفیسر چکرورتی کے لیے خاص طور پر ایک بنگلہ بنایا گیا جو پچاس سال تک بنگالی کوٹھی کے نام سے مشہور تھا۔ سرسید نے رواداری اور روشن خیالی کو پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

سرسید کا پیغام جنگل کی آگ کی طرح نہیں پھیلا۔ اس سے سارے ہندوستان میں مزید علی گڑھ پیدا نہیں ہوئے اور پورے مسلم معاشرے کی تجدید نو کے سلسلے میں تو ان کے پیغام نے بمشکل کسی میں تحریک پیدا کیا ہو گا۔ مسلمانوں میں تعلیم تو پھیلی لیکن نہایت سست رفتاری سے۔ چیونٹی کی چال کی طرح لیکن کسی میں روشن فکری پیدا نہیں ہوتی۔ سوائے سرکاری نوکری کی خواہش کے۔ مسلمان، سامنے کے فائدے پر نظر رکھنے والے حقیقت بیں تو بن گئے لیکن دور اندیش اور مستقبل بین نہ بن سکے جو سرسید انہیں بنانا چاہتے تھے کیونکہ روشن خیالی سے نہ تو اقتدار حاصل ہوتا تھا اور نہ مالی منفعت اور نہ ایک مادہ پرست اور ہندوستان کے جاگیردارانہ مسلم معاشرے میں اس سے سماجی مرتبہ حاصل ہوتا تھا۔

سرسید نے مسلمانوں پر بہت زور دیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں لیکن انہیں سیاست سے دور رہنے کی تاکید کی اور اس کا سبب ظاہر ہے۔ کوئی فرد تعلیم کے بغیر سوسائٹی میں صحیح سیاسی اور سماجی راستے کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ عام لوگوں میں جب تعلیم نہیں ہو گی، سیاست انہیں بداندیش استحصال پسندوں اور سادہ لوح نعرہ بازوں کے رحم و کرم پر ڈال دے گی۔ اسی طرح تعلیم میں اگر روشن خیالی نہ رہی تو ایسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے جو عام لوگوں کے مسائل کو سمجھیں اور ان کے موثر حل کی دریافت میں ان کی مدد کر سکیں۔

سرسید عمر بھر ایک اختلافی شخصیت بنے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں

MashalBooks.org

نے انہیں سمجھنا شروع کیا اور ان کے الفاظ کو اعتبار حاصل ہونے لگا۔۔اس طرح بہت سے مسلمان سرسید کے بیانات کو اپنے خیالات کی اہمیت منوانے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ انہی میں سے یہ بیان جس کی رو سے سرسید کو ''دوقومی نظریے'' کا خالق قرار دیا گیا، یعنی سارے مسلمان ایک قوم ہیں اور سارے ہندو دوسری قوم۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید نے بہت سے موقعوں پر ہندوستانی مسلمانوں کو ایک قوم کہا تھا لیکن اس کے وہ معنی نہ تھے جو مغرب میں رائج ہیں۔ اس وقت قوم سے ان کی مراد یا تو ذات تھی، یا برادری۔ مثال کے طور پر قوم راجپوت تھی، قوم براہمن تھی، قوم سید، قوم مغل اور ایسی ہی دوسری ذاتیں تھیں۔ سرسید کی تحریروں میں قوم کے لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ جدید پولیٹیکل سائنس میں اس کی تعریف کی گئی ہے۔

اس صورت حالات نے مسلمانوں کی قیادت کو، اس وقت وہ جیسی تھی، سوچنے پر مجبور کردیا۔ بدقسمتی سے یہ قیادت تمام تر اشرافیہ پر مشتمل تھی۔ پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں نے سرسید کے مقلدین میں اپنی شمولیت سے انکار کر دیا۔ یہی حالات تھے جب ڈھاکہ کے نواب خواجہ سر سلیم اللہ نے 1906ء میں مسلمان اکابر کو ڈھاکہ میں مدعو کیا کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کے بارے میں سوچیں اور ان کا حل تلاش کریں۔

مسلمان نوابوں اور اشرافیہ نے مسلمانوں کے لئے سرسید کا یہ پیغام فراموش کر دیا کہ جب تک وہ تعلیم کے کم سے کم معیار تک نہ پہنچ جائیں اور جب تک عام لوگ سیاست کے عوامل کو سمجھنے کے اہل نہ ہو جائیں، وہ سیاست میں شامل نہ ہوں۔ مسلم اشرافیہ اور جاگیرداروں نے سرسید کی وفات کے بعد دس ہی سال کے اندر ایک مسلم پولیٹیکل پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے قائم کر لی۔ یہ ایک ایسی جماعت تھی جس کی تشکیل میں کسی عام مسلمان کو یہاں تک کہ درمیانہ طبقے کے مسلمانوں کو بھی شرکت کے لئے مدعو نہیں کیا گیا۔ درمیانہ طبقے کے معدودے چند مسلم نوجوانوں نے مبصرین اور سامعین کے طور پر شرکت تو کی لیکن وہ جاگیرداروں کی طرح بات چیت میں شامل نہیں تھے۔ انہی میں سے ایک ابوالکلام آزاد تھے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں یہی خیال تھا کہ ان کے ناپختہ ذہن کوئی نقطہ نظر پیش کرنے کے اہل نہ تھے۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کے سابقہ حکمران طبقے کے فرزند یہ کہہ رہے تھے کہ آپ کی بہتری کے لئے کون سی بات مفید ہو گی؟ یہ صرف ہمیں

معلوم ہے اس لیے تم سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

مسلمان اشرافیہ اور جاگیرداروں کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کیلئے الگ کوٹہ مانگا اور وہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ گویا انہوں نے مسلمانوں سے کہہ دیا کہ مقابلے کے لیے لیاقت، اہلیت اور قابلیت کی پرواہ نہ کرتا، تم ان کے بغیر بھی سرکاری ملازمتوں میں لے لئے جاؤ گے لہٰذا تمہیں اہلیت پیدا کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہئے اور زندگی میں خاص طور پر تعلیم کے شعبے میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے سخت محنت میں اپنی اہلیت پیدا کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور زندگی میں خاص طور پر تعلیم کے شعبے میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے سخت محنت میں اپنی اہلیت کو تلف نہیں کرنا چاہئے۔ اصل بات یہ تھی کہ مسلمان نوابین کو اپنے طبقاتی مفادات کے حصول کے لیے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی لیکن نوابوں کو جو بالائی طبقے کے ایک چھوٹے سے گروہ کے افراد تھے، بھلا کون سنجیدگی سے خاطر میں لاتا اور ان کے دعوے کی کیا پرواہ کرتا لہٰذا بالائی طبقے کے مفادات کو وہ اس وقت موثر انداز میں فروغ دے سکتے تھے جب اپنا مطالبہ مسلمانوں کی پوری برادری کی طرف سے کرتے، لہٰذا انہوں نے مسلم آبادی کے تناسب سے سرکاری ملازمتوں میں کوٹے کا مطالبہ کیا حالانکہ ان میں تعلیم کی سطح پست تھی۔ اس سے منسلک انہوں نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ مسلم عوام کیلئے چونکہ ملازمتوں کا الگ کوٹہ ان کی کوشش سے منظور کر لیا گیا ہے لہٰذا ممنونیت کے جذبے کے تحت وہ انہیں ووٹ دے کر اسمبلیوں میں بھیج دیں گے۔ اس طرح ان کے جاگیردارانہ مفادات پوری طرح مضبوط اور مستحکم ہوں گے۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں 1945ء تک مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے نواب اور جاگیردار منتخب ہوتے رہے۔ بڑی حد تک یہی صورت حال اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اب تک موجود ہے۔

1906ء میں مسلم لیگ قائم کرنے کے بعد مسلمان جاگیرداروں نے اس امر کو گویا یقینی بنا لیا تھا کہ متوسط طبقے کا مسلمان نوجوان، سرکاری ملازمتوں میں کوٹہ حاصل کرنے کے صلے میں ان کا ممنون احساس رہے گا اور ان کے بعد انہی کے بیٹے اور پوتے اسمبلیوں میں منتخب ہوتے رہیں گے۔ ریکارڈ سے کہیں بھی اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ آل انڈیا

مسلم لیگ کے بالائی اور جاگیردار طبقے والوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور سماجی بھلائی کے لئے سنجیدگی سے کوئی قدم اٹھایا ہو۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلم لیگ نے ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرہ کے گہرے مطالعے کی خاطر کمیٹیاں اور کمیشن قائم کئے ہوں تا کہ یہ تو معلوم ہو کہ ان میں کمی اور کوتاہی کیوں رہ گئی مسائل کے حل کی بات تو دور کی رہی۔

ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم، معیشت اور معاشرے میں چند سنگین مسائل درپیش تھے، جسے کسی مسلم لیگی لیڈر نے یا کسی اور مسلمان سیاسی رہنما نے لائق توجہ نہیں سمجھا۔ تعلیم کے شعبے میں مسلمانوں کے اندر ناخواندگی کی شرح دوسری تمام قومیتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلم لیگ نے سارے ہندوستان میں خاص طور پر بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلم اکثریتی صوبوں میں ایسی تحریکیں چلائی ہوں کہ مسلمان اپنی سنگین نااہلی کا احساس کریں۔ بنگال میں فضل الحق نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے لئے خاصا کچھ کیا لیکن پھر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ فضل الحق نے جو کام کیا وہ مسلم لیگ کی تحریک سے نہیں کیا۔

بہت سے ہندو لیڈروں نے باقاعدہ ادارے قائم کر کے ہندوؤں کے اندر تعلیم پھیلانے کے لیے دور و نزدیک ملک کے ہر گوشے میں بہت کام کیا۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے اواخر میں گوپال کرشن گوکھلے نے ممبئی میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی بنائی۔ بہت سے مشہور سکالر اس کے رکن بن گئے اور انہوں نے محض گزارے کے معاوضے پر اس کے لئے کام کیا، جو کچھ ممبئی میں گھوکھلے نے کیا، وہی کام ایشور چندرود یا ساگر، بنگال میں بہت پہلے شروع کر چکے تھے۔ کیرالا میں نہایت مخلص سماجی کارکنوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے تعلیم پھیلانے کا کام دور دور تک دیہات میں بھی کیا چنانچہ آزادی سے بھی پہلے کیرالا میں خواندگی کی شرح 90 فیصد اور سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ تھی۔ آزادی کے بعد یہ شرح سو فیصد ہو گئی۔ اس کے بعد تامل ناڈو اور کرناٹک کے نام آتے ہیں باقی ہندوستان پیچھے رہ گیا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں سے پھر بھی آگے تھا۔ مسلمانوں کا صرف ایک ادارہ علی گڑھ میں قائم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھا ورنہ لاہور کے مسلم اکثریتی آبادی کے شہر میں اور پورے مغربی پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت

تھی ہندوؤں اور سکھوں کے متعدد کالجوں کے مقابلے میں لے دے کر ایک اسلامیہ کالج تھا۔

کوئی معاشرہ جب بات کا احترام کرتا ہے اور جس کا آرزو مند ہوتا ہے، افراد اسی کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔اسلام کے زریں دور میں مسلمانوں نے عالم بننے اور معاشرے میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے کے لئے سخت محنت کی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں معاشرہ کے اندر عالموں کو قدر اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ مغرب کے جدید معاشرے میں آج کل ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا معاشرہ سرکاری عہدیداروں، دولت مند لوگوں اور اعلیٰ سیاسی شخصیتوں کا احترام کرتا تھا۔سکول کے مدرس کیلئے ایک طرح سے حقارت پائی جاتی تھی اور کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو بس گوارا کر لیا جاتا تھا۔ عالموں کو سرے سے لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا طلبہ کا پہلا انتخاب ہندوستانی سول سروس میں شمولیت تھی۔ اس کے بعد صوبائی سول سروس کی ملازمتوں یا پھر پولیس کی ملازمت اور اگر ان میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا تو کوئی اور سرکاری نوکری، یہاں تک کہ طلبہ بھی جو سائنس پڑھتے، وہ بھی پری انجینئرنگ یا پری میڈیکل کا انتخاب کرتے اس لیے نہیں، کہ اعلیٰ درجے کی تحقیق کریں یا سائنس دان بنیں۔

اب معیشت کے شعبے کی طرف آتے ہیں۔ اقتصادی زندگی میں زوال صاف نظر آنے لگا تھا۔ جناح نے 1940ء کے اوائل میں اس حقیقت کو اپنی تقریروں میں اکثر دہرایا۔ اگر اس زوال کا سبب انگریزی راج تھا یا ہندو اکثریت کی چالبازی یا سازش تھی تو کیا مسٹر جناح کی زیر قیادت مسلم لیگ کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ اس چالبازی یا سازش کا قلع قمع کرتے؟

شمال میں یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش اور جنوب کی ریاست میں، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ان کی اراضی کی ملکیت ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ تھی۔ ان میں زیادہ تر مالکان اراضی چھوٹے یا درمیانہ درجے کے قطعات کے مالک تھے۔ اپنی معاشی بدحالی کے باوجود انہوں نے اپنی زمینیں ہندو کسانوں کو معمولی لگان کے عوض کاشت کیلئے دے رکھی تھیں۔ زرعی معیشت کے شعبے میں مسلمان کسانوں اور کچھ چھوٹے مسلمان مالکان اراضی کو جو اپنی زمین پر خود کاشت کرتے قرض کے مسائل ہمیشہ درپیش رہتے وہ بالعموم

MashalBooks.org

مقروض اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔

مسٹر جناح کا شمار نہایت روشن دماغ رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ ان دنوں میں بھی جب وہ کانگریس کے ایک اہم لیڈر مانے جاتے تھے مسلمانوں کا مفاد ان کے دل سے بہت قریب ہوتا تھا اور وہ 1930ء کے عشرے کے وسط تک کانگریس کے ایک اہم لیڈر تھے۔ اس سے بھی پہلے انہوں نے ہندوستان کی مرکزی کمیٹی میں وقف ایکٹ منظور کروایا اور اس طرح کچھ غیر حاضر مالکان اراضی کو نقصان سے بچا لیا تھا۔ وہ اپنی تقریروں میں مسلمانوں کے افلاس کی ہمیشہ شکایت کرتے اور 1937ء میں لیگ کی قیادت سنبھالنے کے بعد ان کے بیان میں زیادہ شدت آ گئی تھی لیکن ریکارڈ پر ایسی کوئی بات موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ انہوں نے ہنر مند مسلمان دست کاروں کے افلاس کو دور کرنے کے لئے کوئی تدبیر کی ہو، جس طرح انہوں نے وقف ایکٹ کے ذریعے خون چوسنے والے جاگیرداروں کیلئے کی تھی۔ انہیں چاہئے تھا کہ ایک مہم کے ذریعے مسلمان دستکاروں اور کسانوں کو امداد باہمی کی انجمنوں میں منظم کرتے اورا پنی کوآپریٹو کریڈٹ (امداد باہمی کے تحت قرضے) کی سوسائٹیاں بنانے میں ان کی مدد کرتے تا کہ وہ ساہوکاروں کے جبر سے آزاد ہوتے۔

مسلم لیگ کی قیادت سے اور ان میں جناح بھی شامل تھے، چند نہایت نمایاں کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ وہ اقتصادی شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی میں ناکام رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت کو یا کسی بھی مسلم قیادت کو مسلمانوں کے مسائل کا گہرا ادراک اور سرسری علم بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں میں کوئی قرار واقعی سیاسی قیادت تھی ہی نہیں۔

سماجی شعبوں میں ہندوستان کی مسلم معاشر نے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کو اپنا لیا تھا جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ کسی بھی مہذب معاشرے کے لئے نہایت حقیر اور ذلت آمیز تھا۔ مسلمانوں میں ذات پات کی تخصیص کئی صدیوں تک برقرار رہی۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اس سماجی لعنت کو دور کرنے کے لئے کوئی بھرپور مہم کسی مصلح نے حتیٰ کہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ نے بھی کی ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ لعنت خوفناک حد تک پھیل چکی تھی۔

دوسرے صوبوں سے زیادہ پنجاب میں ذات پات کی زبردست تخصیص پائی جاتی ہے یہاں پنجابی اور پٹھان یا سندھی کے درمیان اتنا امتیاز نہیں برتا جاتا، جتنا راجپوت،

MashalBooks.org

جاٹ اور آرائیں کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس بیان کو غالباً اس طرح بہتر سمجھا جا سکتا ہے کہ پنجاب 13 ایک کثیر اللسان صوبہ ہے۔ اردو، پنجاب کے شہری مراکز میں بڑے پیمانے پر قبول کر لی گئی ہے اور بولی جاتی ہے لیکن دیہی علاقوں میں یہ تین بولیاں زیادہ سنائی جاتی ہیں، وسطی پنجاب میں عام استعمال کی زبان پنجابی ہے۔ ملتان اور بہاولپور سرائیکی علاقے ہیں اور راولپنڈی کے نواحی علاقوں میں بول چال کی زبان پوٹھوہاری ہے۔ اس سلسلے میں ایک مبصر کا قول ہے کہ پنجابی اس وقت پنجابی ہوتے ہیں جب وہ اپنے صوبے سے باہر جاتے ہیں۔

دوسری پاکستانی قومیتوں کے مقابلے میں پنجابی زیادہ جفاکش اور سیاسی اعتبار سے مستحکم ہیں۔ ان کی زمین کی زرخیز اور وافر پیداوار نے انہیں آزادی کے ساتھ کامرانی کا وہ احساس دیا ہے جو دوسرے صوبوں میں بہت کم ہی لوگوں کو میسر ہے۔ پنجابی روایات کے بھی بڑے پابند ہیں اور ان کا سماجی ڈھانچہ ان کے زرعی حالات سے بہت جڑا ہوا ہے۔ (14) قومی اقتصادی ترقی کے لئے یہاں کی قیادت نے پنجابیوں کو اس زبردست خوبی کو سمجھا ہی نہیں اس کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ پنجابیوں کو ذات پات کی اس تنگ دلانہ تفریق سے نجات دلائی جاتی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو زبردست اقتصادی ترقی بروئے کار آتی۔

ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے میں ذات پات کی رسم سے کچھ اور بھی سماجی برائیاں پیدا ہوئیں۔ سماجی طور پر بٹی ہوئی ایک سوسائٹی ایک مربوط سیاسی طاقت یا مستحکم سیاسی طاقت کبھی نہیں بن سکتی۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ 1857ء کے سانحے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت نے اس سماجی لعنت سے نجات پانے کی کوئی کوشش کی ہو۔ اس کے بعد شواہد نہیں ملتے کہ اس غیر اسلامی، غیر انسانی اور ہولناک رسم کے خلاف مسلمانوں کی قیادت میں کوئی تشویش پائی گئی ہو۔ اس بارے میں سارا الزام تمام تر اشرافیہ پر اور جاگیرداروں پر نہیں ڈالا جا سکتا جو مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔ زیادہ الزام علماء، اسلام کے فقہی ماہرین خاص طور پر جمعیت العلمائے ہند کے سر جاتا ہے جن میں دیو بندیوں کا غلبہ تھا اور جن کا یہ دعویٰ تھا کہ آزادی سے قبل کے ہندوستان میں اسلام کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا ہراول دستہ وہی ہیں اور عام مسلمانوں کے ساتھ انہی کا مستقل رابطہ تھا۔ اس کے بعد احرار اور دوسرے سیاسی گروہ آتے ہیں جو نوابوں کی زیر قیادت مسلم لیگ کے

MashalBooks.org

مقابلے میں عام مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے۔ بالائی طبقے کے مسلم لیگیوں کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے سماج میں اس سرطان سے تجاہل برت گئے۔ ذات پات کی تخصیص کا یہ نظام جس میں بہت زیادہ درجہ بندی کی گئی ہو خود اسلام کے سماجی نظام کے منافی ہے اور یہ کوتاہی تمام تر دیو بندیوں کی نہیں تھی۔ بریلوی اپنی روحانی قیادت صوفی مسلک کے توسط سے حاصل کرنے کے دعویدار تھے لیکن وہ لوگ جن کا دعویٰ ہو کہ جب رسولؐ کے تنہا اجارہ دار وہی ہیں (وہ جو دنیا میں بلند و پست کا فرق مٹانے کے لیے آیا تھا) ان کا اس تمام تر غیر اسلامی رسم کو دور کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا حیران کن ہے اور رسم بھی اسی کہ جہاں انسان کا مرتبہ اس کے تقویٰ سے نہیں بلکہ اس کی حادثاتی پیدائش سے ہوتا آیا ہے۔

ذات پاس کے اس غیر انسانی اور غیر اسلامی نظام نے سندھ اور پنجاب کے جاگیرداروں کے علاقے اور بلوچستان کے قبائلی علاقے میں جاگیردارانہ سماجی نظام کو آگے لے جانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سندھ کے ہاری اور پنجاب میں جاگیرداروں کے مزارع، مالکان اراضی کی ملکیت شمار ہوتے تھے۔ وہ آزاد شہری شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ ذاتی حقوق کی بنا پر تو وہ انسان بھی نہیں تھے۔ انسانی حقوق کی یہ صریح پامالی ان علاقوں میں عین انگریزی راج کے زمانے میں ہوئی جیسے اپنے حقوق کے ریکارڈ پر ہمیشہ بہت ناز رہا۔ یہ سلسلہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی برقرار رہا۔ ان اجڈ جاگیرداروں سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ انسانی اقدار کی بحالی کا یہ سماجی اصلاح کا کام کریں گے۔ جن سے خود ان کے اختیارات پر زد پڑتی اور ان کے مفادات کو بلکہ ان کی پرتعیش زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا۔

نواب آف ڈھاکہ کی طرح مسلم لیگ کے لیڈر ویسے تو جاگیردار تھے لیکن کم از کم شائستہ اور مودب اشرافیہ تھے اور ان میں انسانی قدروں کا کچھ لحاظ تھا۔

پاکستان کی سیاسی پسماندگی کے حوالے سے سوچیں تو اس کا تقاضا یہ ہو گا کہ آزادی سے پہلے کے مسلم ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلوں کا مطالعہ کیا جائے اور اس میں مسلم قیادت کے کردار کو پرکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں اس نے کیا کردار ادا کیا، پھر اس کے ساتھ ہی یہ طے کرنا ضروری ہو گا کہ پاکستان سیاسی طور پر پسماندہ کیوں رہ گیا۔ جمہوریت میں اقتدارِ اعلیٰ اجتماعی طور پر عوام کی

MashalBooks.org

ملکیت ہوتا ہے جو اپنی طاقت کا استعمال منتخب نمائندوں کے ذریعے کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ جمہوریت کی کامیاب کارکردگی کا انحصار عوام کی اس اہلیت پر ہوگا کہ وہ ایسے نمائندے منتخب کریں جن میں رائے دہندوں کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرنے اور موثر حکمرانی کے ذریعے ان مسائل کو حل کرنے کا ملکہ ہو۔ اس کے صریح معنی یہی ہوں گے کہ لوگوں میں سیاسی شعور اور سیاسی تعلیم کے ذریعے سماجی بیداری ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم اور علمی تربیت کے ذریعے ان میں دانش ورانہ بصیرت ہونی چاہئے۔ سیاسی تعلیم کے ذریعے انہیں اپنے اور معاشرے کے مسائل کا علم ہوگا اور یہ کہ انہیں کیسے حل کیا جائے۔ سیاسی تعلیم سے ہی ان میں یہ اہلیت پیدا ہوگی کہ بہت سی سیاسی پارٹیوں اور بہت سے امیدواروں کے درمیان وہ صحیح پارٹی اور صحیح امیدوار کا انتخاب کریں۔ مسلمانوں نے جو لٹریچر اور کتابیں لکھی ہیں اگرچہ بہت کم ہیں لیکن ان میں بھی لفاظی اور چرب زبانی، مقبول عام فقرے، جذباتی نعرے اور خوب و خیال کی بہتات ہے جن کا مقصد انہیں ٹھنڈے دل سے سوچنے اور مربوط انداز سے معاملات کو سمجھنے پر مائل کرنا نہیں بلکہ جذبات اور احساس کو بھڑکانا ہے۔ زیادہ تر کتابوں میں انگریزوں کو لٹیرے کہا گیا ہے جو تجارت کرنے آئے تھے لیکن مغل بادشاہت کو ہڑپ کر گئے۔ عملی اعتبار سے سیاسی لٹریچر نے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کیا اور وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگے۔ درحقیقت مسلمانوں کو اس سے بہت نقصان ہوا۔

یہ بھی ایک المیہ ہے کہ آزادی سے پہلے عام مسلمانوں کے لیے جناح جو یقیناً ایک بڑے لیڈر تھے، محض ایک وکیل تھے اور قانون کی عدالت میں ان کی آزادی کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ اس امر کے شواہد نہیں ملتے کہ خود مسٹر جناح نے اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ ان کی بڑی ناکامی تھی۔

ترکی میں خلافت کو بچانے کے لیے، وہ خلافت جسے خود ترکوں نے اپنے کاندھے کا بوجھ سمجھ کر اتار پھینکا تھا، مسلمانوں کو احتجاج پر آمادہ کیا گیا اور جلوس نکالنے کے لیے بھڑکایا گیا۔ گویا خود ہندوستانی مسلمانوں کے اپنے کوئی مسائل نہیں تھے۔ بجائے اس کے کہ اپنے مسائل پر توجہ کرتے مسلمان لیڈروں نے ان کو ترکی بلقان جنگ کی خاطر غریب مسلمانوں کو چندہ اکٹھا کرنے پر لگا دیا اور خواہ مخواہ کے مسائل کی تو کوئی انتہا نہیں تھی۔

MashalBooks.org

ہندوستانی مسلمانوں کو جو بھیانک دشواریاں درپیش تھیں ان سے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے گویا خلافت تحریک کافی نہ تھی کہ کچھ لیڈروں نے انہیں یہ مشورہ دینا شروع کیا کہ ہندوستان سے ترک وطن کر کے افغانستان چلے جائیں۔ جو ان لیڈروں کے خیال میں ایک مثالی اسلامی ریاست تھی۔ یاد رہے کہ افغانستان میں اس وقت سخت گیر بادشاہت قائم تھی۔ جہاں بادشاہ کی صوابدید ہی ملک کا قانون تھا لیکن بادشاہ کی حکومت بھی چند بڑے شہروں تک ہی محدود تھی۔ باقی ملک میں قبائلی سرداروں کی حکمرانی تھی جنہیں اپنے مقبوضہ علاقے پر مکمل اقتدار حاصل تھا کہ جیسے چاہیں بندوبست کریں۔اسلام کو حسب ضرورت استعمال کیا جاتا تھا۔ اسلام کا کوئی سماجی نظام قائم نہیں تھا اورسردار قبائلی روایات کے مطابق حکومت کرتے تھے۔مختصر یہ کہ افغانستان میں زمانہ وسطی کا معاشرہ پوری طرح برطانیہ کی نگہداری میں قائم تھا۔ وہ بیشتر لوگ جو ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے افغانیوں نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے سخت اذیت دی۔ ان کی ایک بڑی تعداد کو قابل رحم حالت میں ہندوستان واپس آنا پڑا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ساری خرابیوں کا ذمہ دار محض مسلم لیگ کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے مسلمان گروہوں اور جماعتوں نے بھی مثلاً خلافت تحریک نے مسلمانوں کے جذبات پر بہت کاری وار کیا اور ان کے جذبات اور حوصلوں کو بری طرح پامال کیا۔ یہی کام علماء نے کیا اور یہی کچھ صوفیوں اور دوسروں نے کیا۔مسلمان اس وقت بے سمتی میں سفر کرتے رہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں یعنی سیاسی، سماجی اقتصادی اور مذہبی امور میں بھی جو مسائل درپیش تھے ان کے متعلق ان کی واقفیت بہت ہی کم تھی۔ 1920ء کے عشرے تک یہی صورتحال پائی جاتی تھی۔

اگرچہ وہ اشراف اور نوابین جنہوں نے مسلمانوں کی نگہداشت کی ذمہ داری لی تھی انہیں اس طرح متاثر نہ کر سکے کہ وہ جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہوتے، تاہم پنجاب کے جاگیرداروں نے 1920ء کے ابتدائی برسوں میں اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی لیکن وہ جاگیرداروں کے علاقوں کے لوگ تھے۔ ان میں ایک ممتاز شخصیت لاہور کے میاں سر محمد شفیع کی تھی لیکن وہ ایک اجڈ جاگیردار نہیں بلکہ ایک نفیس طبع رئیس تھا۔مسلم لیگ کی سیاست میں تازہ ہوا کا پہلا جھونکا ڈاکٹر محمد اقبال کی آمد تھی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے

ایک مسلمہ شاعر تھے اور انہیں 1930ء کے الہ آباد سیشن میں جو پارٹی کا سالانہ سیشن تھا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اقبال پیشے کے لحاظ سے ایک قانون دان اور دانشور تھے وہ سیالکوٹ کے ایک باعزت متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس کے قیام کے 25 سال بعد پہلی بار ایک حقیقی سیاسی ایجنڈا، متوسط طبقے کے ایک مسلمان کی زیر قیادت پیش ہوا تھا۔ یہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مسلم اکثریتی صوبوں میں خودمختاری کا مطالبہ تھا۔ یہ مطالبہ اقبال کے صدارتی خطبے میں شامل تھا۔ خودمختاری کے مطالبے کی اساس صاف طور پر مسلمانوں کا یہ اندیشہ تھا کہ ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہوتے ہوئے ان کی آواز دب کر رہ جائے گی۔ نقطہ نظر میں وہ یہ تبدیلی تھی جو ایک نان فیوڈل یعنی ایسے شخص نے پیدا کی تھی جو جاگیردار طبقے سے نہیں تھا۔ اقبال کے حقیقت پسندانہ خطبہ الہ آباد کو بعض لوگوں نے کھینچ کرا سے جداگانہ مسلم قومیت یا مسلمانوں کے جداگانہ وطن کے مطالبے کی بنیاد بنا دیا۔ یہ خطبہ پاکستان کی سبھی اہم لائبریریوں میں دستیاب ہے اور ہر شخص اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ خودمختاری کے لیے حقیقت پر مبنی یہ ایک قابل عمل مطالبہ تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس سے مسلمان اپنے اندر یہ اعتماد محسوس کریں گے کہ اپنی زندگیوں کو اپنے کلچر کے مطابق ڈھال سکیں، نہ اس سے زیادہ کوئی بات تھی اور نہ اس سے کم۔ یہ تھا ایک سیاسی مسائلہ کے حل کی طرف ایک سیاسی اقدام۔ بدقسمتی سے اقبال بھی اپنی قوم کی ناکامیوں کو نہ سمجھ سکے جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اگرچہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نہیں پھر بھی محمد علی جناح نے اپنے چودہ نکات پیش کیے۔ اس میں بھی تمام صوبوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خودمختاری پر زور دیا گیا تھا، صرف شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے نہیں۔ یہ نکات قوم کے سامنے نہرو کمیٹی رپورٹ کے جواب میں پیش کیے گئے تھے جس میں انتہائی مرکزیت پر مبنی سیاسی بندوبست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس بندوبست کے نتیجے میں مسلم شناخت ووٹ کی طاقت سے محروم ہو کر ختم ہو جاتی اور مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچا۔ جناح خود بھی نہ تو کوئی نواب تھے اور نہ کوئی جاگیردار رئیس۔ وہ ایک بیرسٹر تھے اور ان کی جڑیں متوسط طبقے میں پیوست تھیں اس کے باوجود کہ وہ بالائی طبقے کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ جناح کو اپنی سیاسی فراست اور راست رویے پر ہندوستان کی تمام قوموں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

MashalBooks.org

جناح کو ہندو مسلم اتحاد کا اعلیٰ ترین سفیر مانا جاتا تھا۔ وہ بیسویں صدی کے اوائل میں گجرات کے ایک پارسی دادا بھائی نوروجی اور ایک مرہٹہ ہندو گوپال کرشن گوکھلے کے مداح کی حیثیت سے آل انڈیا کانگریس کے ذریعے ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے۔ جب مسلمان نوابوں کی بنیاد رکھی اس وقت وہ ڈھاکہ میں موجود نہیں تھے۔

مسلم لیگ اگرچہ تمام تر مسلمانوں کی سیاسی پارٹی تھی لیکن مذہبی معاملات میں وہ کلیتاً سیکولر تھی۔ اس نے صرف مسلمانوں کے سیاسی معاملات سے رابطہ رکھا۔ ہندوستان میں مذہب کو سیاست میں اس وقت تک داخل نہیں کیا گیا تھا تا آنکہ موہن داس کرم چند گاندھی جنوبی افریقہ سے یہاں آ گئے۔ اس وقت انگریزی فوج میں بھرتی ہو رہی تھی۔ پہلی عالمی جنگ جاری تھی۔ گاندھی نے اس بھرتی میں انگریز حکومت کی مدد کی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں انگریزوں نے ہندوستان کی سیاست میں داخل ہونے کی ترغیب دی تاکہ وہ ترقی پسند اور انقلابی رجحانات کا تدارک کرتے رہیں۔ انہی لوگوں کے بقول گاندھی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کا کھیل کھیل رہے تھے لیکن یہ نظریات ایم این رائے جیسے مٹھی بھر دانشوروں کے تھے۔ رائے ایک مارکسی مفکر اور نظریہ دواں تھے اور ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ انگریز ہندوستان میں بڑھتے ہوئے باغیانہ رجحانات سے خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ اس کا ثبوت وائسرائے پر بم سے حملہ تھا یا پھر نوجوان آزادی پسندوں کے گروہ تھے جو سارے ہندوستان میں جگہ جگہ اور ان میں بنگال خاص طور پر شامل تھا، دہشت خیز وارداتیں کر رہے تھے۔ ان رجحانات کا تدارک کرنے کے لیے گاندھی کو یہاں لایا گیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ مذہب اور عدم تشدد کے حربے استعمال کر کے باغیانہ رجحانات کا مقابلہ کریں۔ اس دعوے کے ساتھ تمام کھلے ذہن کے لوگوں کے لیے اس امر کا یقینی ثبوت موجود ہے کہ گاندھی نے انڈین نیشنل کانگریس کے سیکولر پلیٹ فارم سے مذہب کو ہندوستان کی سیاست میں داخل کیا۔ گاندھی نے ہندو مذہب کی اصطلاحات اور علامات مثلاً مستقبل میں آزاد ہندوستان کے لیے رام راج کے الفاظ بکثرت استعمال کیے۔ رام راج ہندوؤں کی مذہبی حکومت تھی جس کے دیو مالائی راجہ رام چندر تھے۔ مہاتما کا لقب ہندوؤں نے ان کے لیے استعمال کیا اور انہیں مذہبی اعتبار سے مہا گرو تسلیم کیا۔ مہاتما وہ لقب تھا جسے سنت، سادھو اور بڑے گرو کے لیے وہ استعمال کرتے تھے۔ گاندھی نے اس

لقب کے استعمال کو اپنے لیے بخوشی گوارا کیا۔ اگر گاندھی نے رام راج جیسی اصطلاحات برتیں اور خود کو نہایت معصومیت کے ساتھ ایک ہندو مہاپرش قرار دیا جانا گوارا کر لیا تو بھی کسی لیڈر کو ایسی کوتاہی کے لیے معاف نہیں کیا جا سکتا جس کا نتیجہ ہندو بنیاد پرستی کی تجدید کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس کے ردعمل میں مسلم بنیاد پرستی ابھر آئی۔ ایک سیکولر لیڈر کے ہندو مہاگرو بن جانے کے وہی نتائج ظاہر ہوئے جو بعد میں سامنے آئے یعنی پوری طرح تباہ کن۔

بیشتر ہندو اس زمانے میں اور آج بھی گاندھی کو ایک عظیم انسان دوست بلکہ ایک بڑا سماجی مصلح سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں سے بھی کہیں زیادہ ذات پات کی تفریق کی بنا پر غیر انسانی اور جابرانہ سلوک برداشت کیا۔ ہندو دھرم کی سب سے پستہ ذات کے لوگ اتنے گندے سمجھے جاتے تھے کہ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا چنانچہ وہ اچھوت کہلائے۔ جہاں ادنیٰ ذات کے مسلمان کم از کم اونچی ذات والوں کے ساتھ مسجد میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اور کاندھے سے کاندھا ملا کر نماز پڑھ سکتے تھے اور اب بھی پڑھتے ہیں ہندو اچھوت مندر کا مقدر جانور سے بھی بدتر تھا کیونکہ کسی جانور کو چھو کر کوئی ناپاک نہیں ہو جاتا تھا اور ایک اچھوت کا حال تو گائے بھی کہیں بدتر تھا جو ہندوؤں کے لئے نہایت مقدس تھی۔ گاندھی، اس کے باوجود کہ وہ ایک عظیم انسان دوست اور بہت بڑے مصلح تھے لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اچھوت کی غیر انسانی تفریق کو ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور اس کے لیے تحریکیں نہیں چلائیں حالانکہ یہ صورتحال انسانی وقار کے سخت منافی تھی۔ اس معاملے کو مبہم انداز میں برتتے ہوئے انہوں نے اچھوتوں کو ہریجن کہنا شروع کر دیا یعنی بھگوان کے اپنے بیٹے لیکن یہ لقب ملنے کے بعد بھی اچھوت اچھوت ہی رہے۔

یہ بات عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے کہ جناح 1937ء کے اواخر میں اس زمانے کے معمول اور رویے کے مطابق (اپنی بیٹی) وینا کے اس فیصلے سے کچھ خوش نہ تھے کہ اس نے نویل واڈیا سے شادی کی۔ واڈیا پارسی تھے پھر عیسائی ہو گئے لیکن اس ذاتی صدمے اور کسی قدر سیاسی نقصان کے باوجود جناح نے اس کی خواہش اور دلیل کے آگے سر جھکا لیا اور اس کے راستے میں حائل نہیں ہوئے اور زیادہ حیران کن اور لائق تحسین بات

یہ ہے کہ انہوں نے باقی تمام عمر ایک باپ کا کردار ادا کیا۔

اس تعلق سے یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان کے سیاسی حریف اور دیو قامت سیاسی شخصیت گاندھی نے اس واقعے کو کس طرح قبول کیا، جب ان کی پوتی نے ایک مسلمان نوجوان سے شادی کا فیصلہ کیا۔اس بارے میں انکشاف ان بہت سارے خطوط سے ہوتا ہے جو گاندھی نے ضلع فرید پور (اب بنگلہ دیش) کے قاضی اشرف محمود کو لکھے۔ ان کے علاوہ رام داس گاندھی سمترا گاندھی اور دوسروں نے بھی ایسے ہی خطوط بھیجے تھے۔محمود نے وہ سارے خطوط اپنی کتاب ایک نامعلوم آدمی کا لیٹر بکس LETTER, BOX AN UNKNOWN MAN مطبوعہ ڈھاکہ 1970ء کے نام سے مرتب کئے۔ یہ خطوط ایک نہایت دلچسپ کہانی کا انکشاف کرتے ہیں جسے سرسری طور پر ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

محمود کے رام داس کے ساتھ گہرے خاندانی مراسم تھے۔ رام داس گاندھی کے تیسرے بیٹے تھے اور وہ ان دنوں ناگ پور میں مقیم تھے۔ پھر یہ ہوا کہ رام داس کی بیٹی سمترا محمود کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ محض اس لیے نہیں کہ رام داس کے گھرانے میں محمود کی بڑی ساکھ تھی بلکہ لڑکی کے والدین نے بھی محسوس کیا کہ سمترا محمود کے بغیر زندگی میں کبھی خوش نہیں رہے گی اور یہ بات ان کے لیے زیادہ اہم تھی، لہٰذا انہوں نے اس رشتے کی اجازت دے دی، لیکن گاندھی نے جو ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کرتے رہے اور جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم سمجھتے تھے صاف اور دوٹوک طور پر اپنی رضا مندی دینے سے انکار کر دیا۔

یہ بات عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے کہ گاندھی کو جب اپنے علانیہ بیانات اور فیصلوں کو ماننے سے انکار کرنا ہوتا تو انہیں جواز تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ سمترا اور محمود کے معاملے میں جس بات نے رکاوٹ پیدا کی وہ ''محبت کی شادی'' کیلئے ان کی مفروضہ مخالفت تھی۔

اپنے موقف میں ثابت قدمی گاندھی کا ایسا اصول ہے جسے کوئی احمق ہی تسلیم کرے گا چنانچہ اس شادی سے انکار کرتے ہوئے انہیں کوئی ضمیر کی خلش محسوس نہیں ہوئی حالانکہ ماضی میں وہ ایسی کتنی ہی محبت کی شادیوں کو آشیرواد دے چکے تھے۔ مثال کے طور

MashalBooks.org

پر رام داس گاندھی اور اندرا نہرو کی شادی۔

یہ آخر الذکر شادی خاص طور پر اہمیت رکھتی تھی کیونکہ دو الگ فرقوں کے افراد کے درمیان تھی۔ 26 فروری 1947ء میں فیروز گاندھی اور اندرا نہرو کی منگنی ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن (8 مارچ 1947ء) میں لکھا کہ مجھے خفگی اور گالیوں سے بھرے ہوئے بہت سے خطوط ملے ہیں لیکن کسی بھی مراسلہ نگار نے یہ نہیں بتایا کہ بطور انسان فیروز گاندھی میں کیا خرابی ہے۔ ان لوگوں کی رائے میں ان کا یہی ایک جرم ہے کہ وہ پارسی ہیں۔ فیروز گاندھی کئی سال سے نہرو خاندان میں ایک فرد کے طور پر رہتے آئے ہیں۔ یورپ میں اندرا کی بیماری کے دنوں میں وہ ان کے لیے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ اس طرح فطری طور پر ان دونوں میں قربت پیدا ہو گی۔ ان کی دوستی پاکیزہ اور قابل عزت ہے۔ آپس کی کشش سے ان کی پختگی آئی ہے انہیں جواہر لال نہرو نے بھی آشیر واد دی ہے اور اس کی اجازت انہوں نے اس وقت دی جب انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کی محبت ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ میں نے بھی دونوں فریقوں سے بات کی۔ اس منگنی کی اجازت دینے سے انکار کرنا نہایت بے رحمی کی بات ہوتی۔ (The Collected Works of Mahatama Gandhi Vol 75 Page 375)

اوپر کی سطور میں جو معیارات مقرر کئے گئے ہیں ان پر محمود بھی پورے اترتے تھے۔ سوائے اس بات کے کہ وہ ایک مسلمان تھے اور فیروز ایک پارسی تھے۔ ایک کو شادی کی اجازت نہ دینا اور دوسرے کو شادی سے انکار کرنے کو بے رحمی قرار دینا آخر ان دونوں کے درمیان نہایت باریک اختلافی نکتہ کیا تھا؟ لیکن لائق صدر احترام گاندھی جی سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ محمود سمترا کی مجوزہ شادی کی اجازت دے دیتے۔ جب کہ وہ اس سے پہلے سروپ (وجے لکشمی) اور حسین کی شادی میں کھنڈت ڈال چکے تھے۔ اصول اور رائے میں استحکام بہر حال عام لوگوں کے سلسلے میں اہم ہوتا ہے لیکن گاندھی تو مہاتما تھے پھر بھی محمود اور حسین کے معاملوں میں انہوں نے اپنی مستقل مزاجی ثابت کر دی، کیا اس لیے کہ وہ دونوں اتفاق سے مسلمان تھے؟ اگر تیندوئے اپنی کھال کے نشان نہیں بدل سکتے تو ایک فیصلہ کن لمحے میں کوئی شخص اپنی جبلت کے اظہار سے کس طرح باز رہ سکتا ہے؟

جناح نے کانگریس میں ہونے والی ناپسندیدہ تبدیلیوں کے پیش نظر نہایت بے

دلی سے 1930ء میں ہندوستان چھوڑ دیا تھا۔ اب کے انہوں نے 1937ء میں ہندوستان واپس آ کر مسلمانوں کی قیادت کا فیصلہ کیا۔ گاندھی نے جس طرح ہندومت کی علامتوں کو سیاست میں متعارف کرانا شروع کیا تھا، وہ کانگریس کے انداز فکر میں بنیادی تبدیلی کا اشارہ تھا چنانچہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے لئے اب کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا تھا۔

1937ء میں جناح کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ مسلم لیگ اپنے قیام کے تیس سال بعد نوابوں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے چنگل سے آزاد ہو کر مسلم عوام کی پارٹی بن گئی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ نواب باقی نہیں رہے تھے وہ تو موجود تھے خود اس کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان تھے۔ اس کے خزانچی راجہ امیر احمد خان آف محمود آباد تھے اور نواب اسماعیل خان کچھ دوسرے مقتدر رئیسوں کے ساتھ لیگ کی کونسل کے ارکان تھے لیکن اب صرف انہی کا حکم نہیں چلتا تھا۔ اس کے باوجود لیگ ایک لحاظ سے اشرافیہ کی ہی جماعت رہی۔ عام لوگ اس کے پیچھے چلنے والوں میں تھے۔

جناح نے پہلا کام یہ کیا کہ پارٹی کی تنظیم بالکل ابتدائی سطح سے شروع کی۔ اس وقت تک مسلم لیگ کسی تنظیم سے محروم تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ مراعات یافتہ گروہوں کی پارٹی کو سب سے الگ رکھتے ہوئے آسانی کے ساتھ چلایا جا سکتا تھا۔ جناح نے رکنیت سازی کی مہم چلانے کے لیے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جہاں بھی کافی تعداد میں رکن بن جاتے وہیں مسلم لیگ کا ایک یونٹ بنا دیا جاتا اور عہدیدار منتخب کئے جاتے۔ جب بہت سے یونٹ بن جاتے تو ایک شہری مسلم لیگ قائم کر دی جاتی۔ پھر اسے ترقی دے کر ضلع مسلم لیگ کی تشکیل عمل میں آتی اس کے بعد ضلعی لیگیوں کو جوڑ کر صوبائی مسلم لیگ بنائی جاتی جو آل انڈیا مسلم لیگ کے تسلسل کے ساتھ برقرار رہی۔ رہی یہ بات کہ وہی لوگ سال کے سال منتخب ہوتے رہے۔ اس سے کسی کو کوئی تشویش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

مسلم لیگ جب تک بنیادی سطح سے اوپر تک ایک منظم تنظیم بنتی۔ 1939ء کا سال ختم ہونے کو پہنچا اور دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز تو شروع ہی سے بھاگنے کے چکر میں تھے۔ ایم این رائے جیسے دانشوروں پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی راج کے دن عنقریب پورے ہونے کو ہیں۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے

MashalBooks.org

اور باوجود یہ کہ اس کی ایک عالمگیر سلطنت تھی دو عالمی جنگوں کا بار اٹھانا اور وہ بھی بیس سال کے اندر اس کے امکان سے باہر تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایم این رائے نے خبردار کیا تھا کہ برطانوی شہنشاہیت کی جگہ کسی اذیت کے بغیر امریکی استعماریت لے گی۔ رائے نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کی بنیاد سرمائے اور تجارت پر ہو گی نو آبادیت پر نہیں اور بے ضرر ہوتے ہوئے بھی کچھ زیادہ اذیت ناک ہو گی۔ یہاں تک کہ وہ بھی جو اس رائے سے متفق نہ تھے اور ان میں جناح بھی شامل تھے جانتے تھے کہ جنگ برطانیہ کو اتنا کمزور کر دے گی کہ اس کے لیے اپنی سلطنت کو سالم اور یکجا رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ جناح ایک ذہین سیاستدان تھے وہ مسلمانوں کی سیاسی کمزوری سے واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اب ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ وہ کانگریس کی قیادت سے مل کر کوئی ایسا سیاسی معاملہ طے کرنا چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کا آبرومندانہ مستقبل محفوظ ہو جائے۔ یہ محض میرا قیاس ہے کیونکہ ریکارڈ پر ایسی کوئی بات نہیں ملتی۔

میرا خیال ہے کہ جناح نے قرارداد لاہور کا متن اس حقیقت کے پیش نظر منظور کروایا تھا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی سیاسی پتے نہیں تھے اور مسلمانوں کے پاس ایک ہی ماہر سیاستدان جناح تھے۔ قرارداد لاہور میں ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی دو خودمختار علاقوں کے لیے آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس دعوے کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان کی دو قوموں میں ایک مسلمان تھے اور دوسرے ہندو، اس طرح قرار داد لاہور کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ نہرو رپورٹ میں ہندو اکثریت کی بالادستی ثابت تھی چنانچہ لیگ کی قیادت کے نزدیک اس کے معنی ہوں گے مسلمانوں کی دائمی محکومی۔ جناح نے جو ایک ماہر مدبر تھے اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ نکالا کہ دوسرے فریق پر بھی سخت شرائط عائد کی جائیں اور کانگریس پر دباؤ ڈالا جائے کہ کوئی درمیانہ راستے کا حل جو فریقین کے لئے قابل قبول ہو تسلیم کر لے۔ غالباً جناح کا خیال تھا کہ ان کے ہاتھ میں کوئی سیاسی پتے نہیں لہٰذا بلف چال چلنے کا خطرہ مول لیا جائے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ جناح کے خیالات اور قرارداد لاہور کی یہ ایک غیر روایتی تشریح ہے۔ (15)

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں جونہی قرارداد منظور ہوئی ہندو پریس اور کانگریس

کے لیڈروں نے اس قرارداد کو ''ہندوستان کی تقسیم کی سازش'' قرار دیتے ہوئے شدید مخالفت کی اور مذمت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اخبارات نے پاکستان کے مطالبے کو ناپاک قرار دیتے ہوئے رد کر دیا اور مذمت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اخبارات نے پاکستان کے مطالبے کو ناپاک قرار دیتے ہوئے رد کر دیا حالانکہ قرارداد میں ایسا کوئی ذکر نہیں تھا۔ لاہور کی قرارداد کو ایک مقبول عام نام دینے کا سہرا ہندو پریس کے سر جاتا ہے۔ پاکستان کا لفظ عوام کی زبان پر چڑھ گیا حالانکہ ہندو پریس نے یہ نام قرارداد لاہور کی تضحیک کے لئے استعمال کیا تھا۔ ادھر مسلم لیگ کو منظم کرنے میں جناح کی کوششیں تیزی سے بارآور ہوتی جا رہی تھیں۔ ادھر جنگ میں تیزی آ رہی تھی۔ فرانس اور ناروے نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پورا یورپ جرمنی کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ سپین بھی جرمنی کا حلیف بن گیا تھا اور سویڈن غیر جانبدار تھا۔ گاندھی کے زیر قیادت کانگریسوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت عنقریب ختم ہونے والی ہے۔ سبھاش چندر بوش نے جو پہلے کانگریس کے صدر رہ چکے تھے چپکے سے جرمنی کا سفر اختیار کیا تا کہ جنگ کی کوششوں میں جرمنی کی مدد کریں۔ زیادہ تر کانگریسیوں کو برطانیہ کی شکست کا اتنا کامل یقین تھا کہ جب برطانیہ نے جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو آزاد کر دینے کی پیشکش کی تو انہوں نے س پیشکش کو حقارت سے رد کر دیا۔ گاندھی نے کہا کہ یہ تو ایک ایسے دیوالیہ بنک کا چیک ہے جس پر آئندہ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے تاریخ اس کو ایک احمقانہ اقدام قرار دے گی۔ جنگ کے بعد ہندوستان کے لیے آزادی اور حکومت میں شرکت کی پیشکش ایک برطانوی وزیر سر اسٹیفورڈ کرپس لے کر آئے تھے جو کانگریس کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے کے لیے مشہور تھے۔ ایک مختصر سی تعداد جن کی قیادت کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے ان کے ساتھ سی راج گوپال اچاریہ بھی تھے زیادہ ذی فہم تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کرپس کی اس پیشکش کو ردوبدل کے ساتھ قبول کر لیا جائے اور اس بارے میں مسٹر جناح سے بھی مشورہ کیا جائے۔ کانگریس نے انہی حالات کے پس منظر میں ممبئی کے اجلاس منعقدہ 8 اگست 1942ء کو ایک قرارداد میں کہا کہ انگریزی حکومت اقتدار چھوڑے اور ملک سے نکل جائے۔ اسے بعد میں کوئٹ انڈیا ریزلیوشن (ہندوستان چھوڑ دو کی قرارداد) کے نام سے یاد کیا گیا۔ راج گوپال اچاریہ نے جو اپنے ساتھیوں میں راجہ جی کہلاتے تھے اس قرارداد کی

مخالفت میں ووٹ دیا۔

جاپانی فوج نے برطانیہ کی بلکہ دراصل یورپ کی نو آبادیات کو جو ہندوستان کے مشرق میں تھی ہندوستان سمیت بشمول برما اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ برطانیہ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ انہوں نے راج گوپال کو چھوڑ کر جنہوں نے اس قرارداد کی مخالفت کی تھی کانگریس کی پوری مرکزی قیادت کو گرفتار کر لیا۔ مولانا آزاد نے بھی جو کانگریس کے صدر تھے۔ قرارداد سے اتفاق نہیں کیا لیکن اس فیصلہ کن لمحے میں یہی طے کیا کہ اس صف میں شامل رہیں۔ اس بات کی وضاحت انہوں نے اپنی خودنوشت انڈیا ونز فریڈم (India Wins Freedom) میں کر دی ہے۔ کانگریس کے حلیف سخت برہم تھے۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلا دی جو انتہائی پرتشدد تھی اور کہیں کہیں تو خونریزی بھی ہوئی۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی گئیں اور مواصلات کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشنوں کو آگ لگا دی گئی۔ مشرقی یوپی کے چند اضلاع پر کانگریس نے قبضہ کر لیا جو کئی دنوں تک برقرار رہا۔ وہی کچھ ہوا جس کی پیشن گوئی آزاد نے کر دی تھی۔ گاندھی کی عدم تشدد کی پالیسی کی دھجیاں اڑا دی گئی تھیں۔

برطانیہ کا ردعمل اس سے بھی زیادہ پُرتشدد تھا جو سمجھ میں آتا تھا۔ ایسے وقت میں کہ جاپان دروازے پر دستک دے رہا تھا، وہ کوئی پرتشدد شورش برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس شورش کو سختی سے کچل دیا اور ان شہری حقوق کا بھی لحاظ نہیں کیا جس پر برطانیہ کو بڑا فخر تھا ویسے ہی جیسے گاندھی کو ان پر ناز تھا۔ ہنگامی صورت حال میں برطانیہ نے انسانی حقوق کے احترام کو فراموش کر دیا اور گاندھی کے ماننے والوں نے اپنے لیڈر کے مسلک یعنی عدم تشدد کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اگرچہ شورش کو دبا دیا گیا تھا لیکن انگریزوں نے جو ایک زیرک حکمران تھے سمجھ لیا تھا کہ اب ان کی سلطنت ٹھہرنے والی نہیں۔ کانگریس کی قیادت کا پورا پورا احترام کیا گیا۔ انہیں کال کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا جیسا کہ ملک دشمنوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ گاندھی کو پونا کے آغا خاں پیلس میں رکھا گیا تھا آزاد اور نہرو احمد نگر کے قطعہ میں اسیر تھے۔ دوسرے رہنماؤں کو بھی ایسی ہی جگہوں پر رکھا گیا تھا لیکن ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک سے جناح کو کچھ مہلت مل گئی۔ انہوں نے مسلم لیگ کو منظم کرنے کے لئے دگنی بلکہ تگنی کوششیں کیں۔ 1944ء کے ختم ہونے تک ہندوستان میں جہاں بھی

مسلمان موجود تھے۔ مسلم لیگ کی شاخ قائم ہو گئی۔ یہاں تک کہ مدارس میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دس فیصد اور اڑیسہ میں جہاں تقریباً تین فیصد تھی لیگ کی شاخیں کھل گئیں۔

1944ء کے اواخر تک جنگ میں برطانیہ کی شکست نہیں بلکہ کامیابی صرف نظر آنے لگی تھی۔ ادھر جرمنی اور جاپان دونوں میدان چھوڑ رہے تھے۔ بجائے اس کے کہ کامیابی کے امکان سے انگریزوں کے سر پھر جاتے انہوں نے جنگ کے بعد مستقبل کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ انہوں نے منصوبہ یہ بنایا کہ آزاد ہندوستان کو اپنے ساتھ ملا لیں اس طرح وہ انگریزی مال کی ایک بہت بڑی منڈی ہوگا۔ اس کی حیثیت ایک دشمن اور خلفشار میں مبتلا نو آبادی کی نہیں ہو گی۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انگریز تو یہاں پہلے آئے بھی اس لیے تھے۔ اب انگریز پر امریکہ کا بڑا دباؤ تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرو۔ اس کا تذکرہ آزاد نے اپنی کتاب انڈیا ونز فریڈم میں کیا ہے۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے دوران میں کانگریسیوں کی گرفتاری کو انگریزی عوام نے پسند نہیں کیا تھا۔

1945ء کے وسط تک کانگریس کی سرکردہ قیادت کو رہا کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت نے دارالعلوم میں اعلان کیا کہ ہندوستان کو اس جنگ میں ایک آزاد قوم کے طور پر شرکت کے لئے پوری کوشش سے آمادہ کیا جائے گا۔ مستقبل کے تجارتی امکانات اور امریکی عوام کا دباؤ دونوں نے اپنا کام کیا چنانچہ اس مقصد کے تحت شملہ میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس کی صدارت وائسرائے لارڈ ویول نے کی، طویل بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کابینہ میں شرکت کے لئے پانچ پانچ نامزد ارکان کی فہرست پیش کریں گے اور وائسرائے اپنی پسند کے چار ارکان نامزد کریں گے۔ کانگریس نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی فہرست میں ہندو ارکان صرف دو تھے باقی تین پارسی، عیسائی اور مسلمان تھے۔ یہ گویا یہ ثابت کرنے کے لئے تھا کہ کانگریس ایک سیکولر اور قومی تنظیم ہے۔

بدقسمتی سے کانگریس نے 1937ء میں جب صوبائی وزارتیں بنائی تھیں۔ اس وقت یہ اصول پیش نظر نہیں رکھا۔ مثال کے طور پر ممبئی پریزیڈنسی میں ایک ہندو کے بی کھیر کو وزیراعظم بنا دیا تھا حالانکہ ان سے زیادہ موزوں امیدوار ایک پارسی نریمان موجود تھے اور

کانگریس کے لیے ان کی خدمات بھی زیادہ تھیں۔ اسی طرح بہار میں ایک ہندو سنہا کی طرف داری کرتے ہوئے ایک مسلمان اور زیادہ موزوں امیدوار ڈاکٹر محمود کو نظر انداز کر دیا گیا۔ 1937ء میں دوسرے صوبوں کے اندر بھی ایسی ہی مثالیں پیش کی گئیں۔ کانگریس کی یہ فیاضی 1945ء میں محض سیاسی تھی۔ وائسرائے کی فہرست میں انتہائی وفادار امیدوار شامل تھے یعنی سر خضر حیات خان ٹوانہ ان کے علاوہ ایک سکھ اور دو نچلے طبقے کے ہندو۔

جناح نے کانگریس کی جانب سے ایک مسلمان کی نامزدگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے خضر حیات ٹوانہ کی شمولیت کی بھی سختی سے مخالفت کی اور یہ مخالفت فطری تھی ورنہ خضر حیات ٹوانہ ایک نہایت ایماندار شخص اور نہایت اچھے منتظم تھے اور انہوں نے برطانیہ سے اپنی گہری وفاداری کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ خضر حیات کے لئے وائسرائے کی حمایت سمجھ میں آتی تھی۔ اگر کانگریس میں کچھ بصیرت اور دانشمندی بلکہ دیانت ہوتی تو وہ مسلم لیگ کے نقطہ نظر کو فراخدلی سے تسلیم کر لیتی کیونکہ اس وقت مسلم لیگ کی حمایت میں مسلمانوں کا ایک سیلاب امڈ چلا آ رہا تھا۔ کانگریس نے بصیرت اور فراخدلی تو کیا دور اندیشی سے بھی کام نہیں لیا۔ چنانچہ شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

ہندوستان میں سیاسی پارٹیاں تو بہت سی تھیں لیکن عوامی حمایت صرف کانگریس اور مسلم لیگ کو حاصل تھی۔ وائسرائے کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے معلوم کرے کہ عددی اعتبار سے کس جماعت کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا تعین کرنے کے لئے انہوں نے 1945ء کے آخری اور اس سے کچھ عرصہ بعد 1946ء کے اوائل سرما میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ کے لیے فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی۔ اب مسلم لیگ کو اپنی یہ اہلیت دکھانی ہو گی کہ عوامی تائید کو انتخابی کامیابی میں بدل دے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی قیادت کو اپنی سیاسی مہارت، کارکنوں کو اپنی پختگی اور مسلمان عوام کو سیاسی آگہی کا ثبوت ہو گا۔

عوامی تائید کو پولنگ بوتھ پر کامیابی میں تبدیل کرنے کا انحصار سیاسی پارٹیوں کی بنیادی شاخوں کی طاقت پر ہوتا ہے۔ بنیادی سطح پر مسلم لیگ کی تنظیم کیا تھی؟ اسے سمجھنے کے لئے میں اپنے مشاہدے اور تجربے سے مثال پیش کروں گا۔ میرے والد پیشے کے اعتبار

سے وکیل اور ضلع کے سرکردہ لیگی لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ لیگ کے سالانہ انتخابات سے چند روز پہلے میرے والد کے دفتر میں جو ہمارے مکان سے قریب ہی تھا بڑی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ہر مسلمان ملازم اور میرے والد سے متعلق ہر شخص مسلم لیگ کی رکنیت کے فارم پر اپنا انگوٹھا لگا رہا تھا یا دستخط کر رہا تھا۔ رکنیت کے فارم پر دستخط کرنے کے نام دو آنے کی رسید کاٹ دی جاتی جو میرے والد ادا کر رہے تھے۔ اس طرح لیگی ارکان کی اچھی خاصی تعداد جو لیگ کی بنیادی یونٹ بنانے کے لیے ضروری تھی تیار ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ سارے شہر میں اور سارے اضلاع میں اسی طرح ہو رہا تھا۔ جب یونٹ لیگوں کا انتخاب ہو گیا تو ان کے نمائندوں کو ملا کر شہری لیگ اور شہری لیگ کے نمائندوں کو ملا کر ضلعی لیگ بنا دی گئی جس نے صوبائی لیگ کے بھی چند نمائندے منتخب کر لیے لیکن میں ایک بات نہیں بھولوں گا، وہی افراد سال کے سال منتخب ہوتے رہے۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچا تو اسی طرح کی تنظیم سازی کی مثالیں سارے ہندوستان سے سننے میں آئیں اور ہر جگہ مسلم لیگ کی تشکیل اس طرح ہوئی۔ ایک سیاسی پارٹی کو ایک عوامی پارٹی بنانے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں تھا۔ چونکہ پارٹی کے اندر صحیح معنوں میں انتخابات نہیں ہوئے اس لیے مسلم لیگی عہدیدار منتخب کرنے کے باوجود ایک الگ تھلگ سی پارٹی بنی رہی۔

ایک اور بات جو مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے یہ تھی کہ زیادہ تر عہدیدار متوسط طبقے کے افراد تھے جن پر پیشہ ور وکیلوں کی بالادستی تھی۔ عام آدمی کہیں بھی لیڈر نہیں تھا، مقلد یا پیچھے چلنے والا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مسلم لیگ مسلمان وکیلوں کی ایک جماعت ہے جسے انہوں نے بالائی طبقے کے مسلمان رؤسا سے چھین لیا ہے۔ اس کے باوجود ایسے رئیس مثلاً نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب اسماعیل خان، راجہ صاحب محمود آباد اور ایسے ہی کئی اور افراد مسلم لیگ کے بالائی درجے پر اپنا غلبہ رکھتے تھے۔ ان میں بہت سے نفیس لوگ بھی تھے لیکن تھے تو طبقہ اشرافیہ کے۔ ان کی طبقاتی ساکھ کچھ بھی رہی ہو لیکن مسلم عوام تو دور رہے ان کی کوئی ملاقات سیاسی تربیت اور آگہی کی خاطر بنیادی مسلم لیگ کے ارکان کے ساتھ کبھی نہیں ہوئی۔ پبلک جلسہ اسی وقت ہوتا جب کوئی مسلم لیگی لیڈر علاقے میں آتا تھا۔ یہ کہنا کہ ان جلسوں میں اچھی خاصی حاضری ہوتی تھی حقیقت کو کم کرنا ہوگا۔ زبردست اور پرہجوم جلسے ہوتے تھے لیکن مقرر جو ایک کے بعد دوسرے آتے محض کانگریس اور ہندوؤں کو

برا بھلا کہتے اور اس سے بھی کہیں زیادہ شدت سے اور بھونڈے انداز میں ان مسلمان گروہوں اور پارٹیوں کی مذمت کرتے جو مسلم لیگ سے متفق نہ تھے۔ کبھی کبھی ان کا مذمتی بیان بڑا فحش ہوتا۔ ان میں جو گروہ اور پارٹیاں نشانہ بنتیں وہ تھی جمعیت العلمائے ہند، کانگریسی مسلمان، خاکسار، احرار اور وہ لوگ جو قوم پرست مسلمان کہتے تھے۔ کبھی کبھی تو جناح بھی بہک جاتے۔ مثلاً انہوں نے آزاد کو کانگریس کا صدر اور مسلم ''شوبوائے'' کہہ دیا۔ ان کی پارٹی کے نچلے لوگوں نے اس عدم رواداری کی مثال کو اپنا لیا اور بڑی وفاداری سے اس پر عمل پیرا رہے۔

بدقسمتی سے سیاسی مخالفوں کے باب میں فحش گوئی محض مسلم لیگ کا اجارہ نہیں تھی اگرچہ مسلم عوام پوری طرح لیگ کی گرفت میں تھے۔ جمعیت کے چند سرکردہ رہنماؤں اور کچھ کانگریسی اور قوم پرست مسلمان لیڈروں کو چھوڑ کر باقی تمام لیڈر نہایت بے ہودہ ننگی اور ناقابل تحریر زبان شاید لیگیوں سے بھی زیادہ شدت سے استعمال کر رہے تھے۔ اس سے مسلمانوں کے سیاسی کلچر میں بہ اعتبار مجموعی عدم رواداری داخل ہوگئی اور شائستگی کم رہ گئی۔ مسلم عوام بھاری تعداد میں لیگ کے ساتھ تھے۔ ان کے مخالفین دوسری جانب معمولی اقلیت میں تھے اور صرف مخالف جماعت یا گروہ کی خرابیوں اور رسوائیوں سے واقف تھے۔ رہنماؤں کے اپنی سیاسی فہم سے قطع نظر مسلم عوام سیاسی تعلیم اور بیداری سے اور درپیش مسائل کی حقیقت سے نابلد رہے، چنانچہ ان مسائل کے حل کی خواہش بھی ان میں پیدا ہوئی۔ جو کچھ تقریروں میں کہا جاتا تھا وہی مسلم سیاسی لیڈروں اور گروہوں کی کتب میں شائع ہوتا رہا اور وہ بھی نہایت کم تھا بمشکل کوئی سنجیدہ کتابچہ یا کتابیں لکھی گئی ہوں گی اور جو تھیں وہ لفاظی اور چرب زبانی سے بھری ہوئی۔ دلائل سے خالی اور زیادہ تر شائستی سے تہی۔

سیاسی تربیت سے محرومی کا نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ جدید جمہوریت کیا ہے۔ یہ کس طرح کام کرتی ہے۔ اس میں حقوق و فرائض کی کیا نوعیت ہے۔ رہنماؤں میں کون سی خصوصیات ہونی چاہئیں اور رہنماؤں کی تربیت کن مراحل میں ہوتی ہے۔ انہیں تو صرف یہ معلوم تھا کہ مسائل خدا کی طرف سے ہیں اور انہیں حل کرنا ان کے قائدین کے اختیار میں ہے۔ اللہ کی مرضی میں عام لوگوں کا کیا دخل اور نہ قائدین

کے احاطہ فکر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہیرو کی تلاش تھی اور ایسے نجات دہندوں کی طلب تھی جو آئیں اور ان کے مسائل حل کر دیں چنانچہ وہ ہیرو کی قلت کا شکار تھے۔

مسلم لیگ کے حمایتی اپنے لیڈر کے بارے میں کیا قیاس کرتے تھے۔ اس کے بارے میں یہاں ایک نہایت موثر مثال پیش کی جاتی ہے۔ ہر مسلمان پان فروش، چائے خانے اور ایسی تمام جگہوں پر جہاں عام مسلمانوں کا کثرت سے آنا جانا ہوتا تھا ایک تصویر نمایاں طور پر آویزاں ہوتی تھی۔ یہ جناح کی تصویر تھی۔ سر پر تاج پہنے ہوئے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تلوارا ور گلے میں لٹکا ہوا قرآن کریم کا نسخہ۔ مسلمان اپنے ہیرو جناح کو اس طرح اپنے تصور میں لاتے تھے۔ وہ ایک نجات دہندہ تھے۔ روایتی سینٹ جارج جنہوں نے اژدھے کا مقابلہ کیا۔ ان لوگوں کی تربیت اس طرح نہیں ہوئی تھی کہ خود سیاست کے بارے میں جناح کے کردار اور افکار اور جمہوریت کے متعلق ان کی فکر کے متعلق معلومات حاصل کرتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی کہ سوالات کریں۔ ان کے مقلدین کو ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا جس بات کے سلسلے میں وہ سب سے زیادہ فکرمند رہتے وہ جناح کے لیے احترام اور ان کے خیر مقدم کے آداب تھے۔ کوئی شخص ان کے نام کے ساتھ اگر پورے القلاب استعمال نہ کرتا یعنی قائداعظم نہ کہتا تو اس کی سختی سے تنبیہہ کی جاتی۔

لفظ قائد کے استعمال میں کیا مضمرات ہیں؟ مناسب ہو گا اس پر بھی گفتگو ہو جائے۔ قائد عربی کا لفظ ہے مراد یہ ہے کہ وہ شخص جو اونٹ کی نکیل پکڑ کر آگے آگے چل رہا ہو یعنی ایک خاص رہنما جس کے پاس یہ طاقت ہوتی ہے کہ اپنی منشا کے مطابق اونٹ کو مقررہ راستے پر چلنے پر مجبور کرے۔ اب وہ لوگ جن کی قیادت کی جا رہی ہو ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں کہ قائد کی تقلید میں اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اس لفظ کا صحیح متبادل کو زیادہ صحیح ہے وہ رہنما ہے یعنی وہ جو راستہ دکھاتا ہے۔ اس وقت کہا گیا کہ جناح کو قائداعظم کا لقب ظفر علی خاں نے دیا تھا۔ مولانا اردو اور عربی زبان کے عالم تھے اور دونوں الفاظ کے معانی اور ان کے استعمال کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ لفظ قائد کے انتخاب سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو مقلدین کی صف میں اسی طرح دیکھنا چاہتے تھے جیسے قائد اونٹ

کی نکیل کو پکڑ کر چلتا ہے اور اونٹ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ پیچھے چلتا رہے۔ جناح کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں پر بھی یہی کچھ گزری۔

اس باب میں جناح کے اپنے خیال کی بہترین وضاحت اس مثال سے ہوتی ہے۔ 1940ء کی دہائی کے آغاز میں ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کو ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے شائستگی کے ساتھ یہ اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں صرف مسٹر جناح رہنا پسند کروں گا۔ میں اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا۔ روزنامہ ڈان کے نہایت محترم کالم نگار اردشیر کاؤس جی نے اپنے ہفت روزہ کالم (مطبوعہ 3 مارچ 1999ء) میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے نام مسٹر جناح کے خط کا متعلقہ حصہ نقل کیا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ''جہاں میں اس جذبے کی نہایت قدر کرتا ہوں جس نے یونیورسٹی کو اس فیصلے پر آمادہ کیا وہیں میں نہایت تامل کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنی زندگی محض مسٹر جناح رہتے ہوئے بسر کی ہے اور امید کرتا ہوں کہ مرتے وقت بھی محض مسٹر جناح رہوں گا۔ میں کسی قلب یا اعزازات سے سختی کے ساتھ احتراز کرتا ہوں اور اس وقت مجھے زیادہ خوشی ہو گی جب میرے نام کے ساتھ کوئی لقب نہیں ہو گا۔

یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ جناح کے پیروکاروں نے انہیں تاعمر اس خوشی سے اور مرنے کے بعد بھی اس آسودگی سے محروم رکھا کہ وہ صرف مسٹر جناح رہتے۔ ان کے بعض فدائی قسم کے مقلد اگر کہیں لقب کے بغیر ان کا نام سنتے تو تشدد پر آمادہ ہو جاتے۔ یہ طرز عمل ان کی وفات کے بعد بھی برقرار رہا۔ جناح کے بارے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا کیا نظریہ تھا اس کی وضاحت دو مثالوں سے ہو جاتی ہے۔

ایک واقعہ تو آزادی سے پہلے سارے ہندوستان کے تقریباً تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ایک بار حسرت موہانی جو ایک صوفی مسلمان رہنما تھے اور اپنے آپ کو اشتراکی مسلم کہتے تھے دہلی میں مسٹر جناح کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بہت رات گئے مولانا حسرت موہانی کی آنکھ کھل گئی اور وہ جناح کے بیڈ روم میں چلے گئے انہوں نے دیکھا کہ جناح سجدے میں پڑے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کے لیے خیر کی دعا مانگ رہے ہیں وہ صلوٰۃ تہجد ادا کر رہے تھے، یہ نماز پچھلی رات میں فجر کی نماز

سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ جناح ایک اچھے مسلمان بلکہ بہتوں سے کہیں زیادہ اچھے تھے لیکن وہ صوفی تو کبھی نہیں رہے۔ جناح کا نظریہ یہ تھا کہ ہر فرد کو اپنی پسند کے مذہب اور اپنے طریقے سے عمل کرنے کا حق حاصل ہے جیسا کہ ان کی گیارہ اگست کی تقریر سے ظاہر ہے۔ اس سیکولرازم کا انہوں نے علانیہ اظہار کیا اور اس کی پیروی کی۔

کچھ دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے کہا کہ جناح ایک وکیل تھے انہیں مسلم قوم نے برطانوی شہنشاہت کی عدالت میں اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے منتخب کیا تھا۔ جو لوگ اس کردار کی تائید کر رہے تھے بظاہر ان کا مقصد جناح کے قد و قامت کو بلند کرتا تھا۔ ایسے لوگ یا تو بیچارے معصوم تھے یا سادہ لوح یا پھر دونوں ہی تھے۔ آزادی کے لئے لڑنے کے معنی عدالت میں مقدمہ لڑنا نہیں اور ایک لیڈر کا مرتبہ ایک وکیل سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے لیکن ان کی رائے سے اس حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے کہ مسلمان اپنی عملی شرکت کے ساتھ آزادی کے لئے سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد نہیں کر رہے تھے۔ وہ اس قصے سے الگ تھے اور اس کام کے لئے ایک وکیل کر لیا تھا۔ آزادی کی جدوجہد ان کے خیال میں محض ایک قانونی لڑائی تھی۔ لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ خود مسٹر جناح نے یا ان کے کسی نائب نے مسلم عوام کے اس نظریے کو درست کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

جہاں تک مخالف رہنماؤں کے بارے میں عام مسلمانوں کے خیالات کا تعلق تھا اس کی بھی نہایت موثر مثالیں موجود ہیں۔ کانگریس کے صدر کے طور پر آزاد کی تنخواہ مقرر تھی جیسا کہ دوسرے صدور کو بھی ملتی آئی تھی۔ ان کو بڑی حقارت سے کانگریس کا تنخواہ دار مولوی کہا جاتا تھا۔ کانگریس جاگیرداروں کی جماعت نہیں تھی جس میں اوپر کے عہدے محض نوابوں کے لئے مخصوص ہوں جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر پلتے تھے۔ اگر کانگریس ان کو جن میں سے کئی متوسط طبقے کے لوگ تھے، تنخواہ نہ دیتی تو بہت سے صدر بھوکے مر جاتے۔ وہ لوگ کل وقتی سیاستدان تھے۔ ظاہر ہے کہ مسلم عوام کے نزدیک صرف دولت مند نواب جنہیں کسی اجرت کی ضرورت نہ تھی رہنمائی کرنے کے اہل تھے۔ وہی نواب جن کے لیے سیاست ایک جز وقتی کام تھا نہ تو سیاست ان کی زندگی کا مشن تھی اور نہ پیشہ۔ جناح ایک دولت مند وکیل تھے انہیں گزر اوقات کے لئے تنخواہ کی ضرورت نہیں تھی لیکن کوئی اور متوسط طبقے کا فرد ہوتا تو اس کو یقیناً اس کی احتیاج ہوتی، اس کے باوجود جناح کا ایک مشن تھا اور

MashalBooks.org

ایک عہد تھا جس کے لیے وہ زندہ رہے اور اپنے لوگوں کے لئے جان دیدی۔ یہ ایک بڑا سبب تھا جس کے باعث مسلم لیگ کی قیادت متوسط طبقے کے رہنماؤں نے نہیں کی۔ مسلمان اپنی قیادت کے لئے ثروت مند نوابوں کو ترجیح دیتے تھے۔ جدید دور میں سیاسی عمل کیا ہوتا ہے۔ وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔

مسلمان خواہ وہ مسلم لیگ میں ہوتے یا مخالف پارٹیوں میں، حزب اختلاف کے رہنماؤں کے لیے تحقیر اور نفرت کے سوا کوئی جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ سارے گروہ دوسرے لیڈروں کو غدار کہتے، جس طرح مسلم لیگ اپنے مخالفوں کو ہندوؤں کا تنخواہ دار کہتی اور ان کے اپنے لیڈروں کو انگریز کا تنخواہ دار کہا جاتا تھا، مسلم عوام کی تربیت کھوکھلے نعروں اور رٹے رٹائے فقروں پر ہوئی تھی۔ اس کیفیت نے ان کو سیاسی تفکر کی اہلیت سے محروم کر دیا تھا اور وہ اپنے طور پر خود سوچنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے تھے۔ ان کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ ذہنی اعتبار سے اپنے لیڈروں پر انحصار کرتے رہیں۔

تاہم ان مسلمانوں میں استثنا ایک چھوٹا سا اور ناقابل لحاظ گروہ خان عبدالغفار خاں کا تھا وہ صوبہ سرحد کے پختون تھے اور کانگریس کے لیڈر تھے انہوں نے اپنے ریڈشرٹس (سرخ پوش) اور خدائی خدمت گاروں کی تربیت کلی طور پر سیاسی افکار کی نہج پر کی تھی۔

ہندوستان کے سارے لوگوں میں پختون سب سے زیادہ تند خو تھے۔ وہ ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ غفار خاں نے انہیں عدم تشدد کا حامی بنا دیا۔ انہوں نے اپنی سیاست کی بنیاد تمام تر سیاسی مسائل پر رکھی مذہبی مسائل پر نہیں۔ انہوں نے اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے کلیتًا گریز کیا۔ مسلمانوں کو ایک بڑ نقصان وہ اٹھانا پڑا جس کا اظہار جناح اور غفار خاں کے ماننے والوں کی مختلف سیاسی تربیت سے ہوا۔ جناح اگرچہ غفار خاں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند قد و قامت کے لیڈر تھے لیکن وہ اپنے لوگوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ لوگ ان کے پاس آسانی سے پہنچ نہیں سکتے تھے لہٰذا ان کی شخصیت قیاس آرائیوں اور تصوراتی باتوں کا مرکز بن گئی اور ان کا براہ راست اثر ان کے نائبین میں سے کسی کی بھی زندگی پر نہیں ہوا۔ غفار خاں نے زندگی اپنے لوگوں کے درمیان گزاری چنانچہ ان کے کردار، طرز زندگی اور پیچھے چلنے والوں کے ساتھ ان کے سلوک نے غفار خاں کے ماننے والوں کو متاثر کیا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیسے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں جناح

MashalBooks.org

کی شبیہہ حقیقی نہیں بلکہ خیالی تھی حالانکہ اصل جناح کا قد و قامت بہت سے ''تصوراتی جناح'' سے کہیں بلند تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک لیڈر سے امید کی جاتی ہے کہ وہ جن لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے انہیں بہت قریب سے جانتا ہو۔ ان کے رہن سہن، ان کے خیالات، مشکلات اور عادات سے واقف ہو، جناح سے یہ سب کچھ جاننے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ وہ اپنے لوگوں سے دور رہے۔ وہ انہیں صرف ٹیلر (ذاتی ملازم) باورچی مالی اور خاکروب کے طور پر جانتے تھے۔ لیکن جناح اور مسلم لیگ کے عمائدین اگر عوام سے دور رہے تو اس کے لیے انہیں ذمہ دار ٹھہرانا مناسب نہ ہوگا۔ کانگریس بھی معمولی فرق کے ساتھ اس سے مختلف نہ تھی۔ گاندھی بظاہر ایک عام آدمی کی طرح رہتے تھے لیکن آشرم میں انہیں ساری آسائشیں میسر تھیں۔ درجنوں افراد ان کی خدمت پر مامور ہوتے اور بھی بڑی بات یہ تھی کہ وہ مہاتما ہوتے ہوئے بھی ایک سنت سادھو تھے۔ انہیں بڑا تقدس حاصل تھا لوگ ان کے پاس بڑے انکسار اور عاجزی سے پہنچتے تھے جو ایک مذہبی شخصیت کے روبرو ضروری تھا۔ میں نے 1940ء کے عشرے کے دوران اخبارات میں گاندھی کے بارے میں جو کچھ پڑھا، گاندھی کی زندگی کو انہی معلومات کی بنیاد پر بیان کر رہا ہوں، مجھے یاد ہے کہ سروجنی نائیڈو نے گاندھی کی افلاس میں بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں کیا کہا تھا۔ ایک ہندو اخبار نویس سنندا کے دتہ رائے لندن کے نہایت موقر اخبار آبزرور کے لئے لکھتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا، اس تفریق سے ہندوستان کے غیر حقیقی اگرچہ پسندیدہ مفروضے پر روشنی پڑتی ہے کہ سیاست کا تعلق روپے سے نہیں بلکہ نیک خصلت سے ہے۔ اس طرح کی خوش فہمی موہن داس کرم چند گاندھی تک جا پہنچتی ہے جو مہاتما بھی ہیں اور جن کی نمائشی سادگی کے بارے میں اس طرح کے فقرے سنے گئے کہ انہیں افلاس میں رکھنا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر تیسرے درجے کا ایک پورا ریل کا ڈبہ ان کے لئے تیار رکھا جاتا تھا کیونکہ اس سے بہتر کسی ذریعے سے سفر کرنا ان کے لئے ایک گناہ آلود عیاشی تھا۔ جب وہ لندن کی آئینی کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو ہندوستانی وفد میں ایک بکری بھی شامل تھی کیونکہ عام دیہاتیوں کی طرح گاندھی کچھ اور نہیں، صرف بکری کا دودھ پیتے تھے۔'' یہ تھا سنندا کے دتہ رائے کے حساب سے ''افلاس کا مسلک''۔

یہ سب بہت اہم معاملات تھے لیکن زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان کی سیاست ذاتی

نوعیت کی تھی، بہ اعتبار مجموعی ہندوستان کے معاشرے کا حصہ نہیں تھی پھر بھلا مسلمانوں کے لئے قابل قبول کس طرح ہوتی۔ پیروکار محض لیڈر کے پیچھے چل رہے تھے وہ مقامی، صوبائی یا قومی سطح پر کسی پارٹی یا اصولوں کے تابع نہیں تھے اگر ان کا پسند کا لیڈر الگ ہو جاتا، تو ان کے بہت سے ماننے والے بھی چھوڑ جاتے۔ مزید یہ کہ کبھی کسی لیڈر نے اپنا جانشین نہیں چھوڑا، دوسرے تیسرے، یا چوتھے درجے کی قیادت بھی پیدا نہیں کی، جو ان کے پیچھے کام کرتی رہتی۔ ایک لیڈر مر جاتا تو خلا پیدا ہو جاتا، خواہ قائدین میں اس کی حیثیت کچھ بھی ہوتی۔ اوپر کی قیادت میں یہ صورتحال تو اور بھی سنگین تھی مسلم سربراہ اپنے جانشین پیدا کرنے میں ناکام ہو گئے۔ تاریخ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کو اس کوتاہی پر کبھی معاف نہیں کرے گی کہ آزادی سے پہلے انہوں نے اور پھر آزادی کے بعد پاکستانی قائدین نے سیاسی قیادت پیدا نہیں کی۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہر درجے اور ہر سطح پر بہت سے جانشین تیار کئے جاتے ہیں اس کے بعد ہی قیادت کا تسلسل یقینی طور پر برقرار رہتا ہے اور پارٹی کا پیغام دور دور تک پہنچتا ہے۔

مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد نے 1940ء کے بعد مسلم لیگ کی قیادت قبول کی جو جاگیرداروں، مسلم اکثریتی صوبے کے غیر حاضر زمینداروں اور مسلم اقلیتی صوبے اور بنگال سے جن میں اشرافیہ کے بلند مرتبہ لوگ شامل تھے۔ نکل کر آئی تھی۔ یہ آخر الذکر اپنے رویے میں قدرے انسان دوست تھے۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے اندر کچھ تفریق موجود تھی پنجاب کے تطف مشرقی حصے کی حیثیت جو اب ہندوستان کی ہریانہ ریاست اور اس کے پنجاب کا حصہ ہے، اقلیتی صوبوں جیسی تھی۔ بلوچستان تمام تر قبائلی تھا، صوبہ سرحد بعض حیثیتوں سے اقلیتی صوبوں سے بھی زیادہ آزاد خیال اور روادار تھا۔

ایک جاگیردار کا رویہ اپنے کسانوں کی تعلیم اور انسانی وقار کے بارے میں کیا تھا؟ اس سے متعلق میں نے ایک عجیب وغریب کہانی سنی، جو ایک کسان کے بیٹے کے بارے میں تھی۔ کسان کا بیٹا انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نیا نیا وطن واپس آیا تھا۔ بیٹے جو جاگیردار کے آگے پیش کیا گیا کہ خراج عقیدت پیش کرے جاگیردار خود بھی تعلیم یافتہ اور ایک ریٹائرڈ کرنل تھا۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا، السلام علیکم، سلام کرنے کا اسلامی طریقہ یہی ہے لیکن جاگیردار نے اسے صریح گستاخی اور اپنی توہین پر محمول کیا۔ ایک

کسان کا بیٹا اس کے آگے برابر کی حیثیت میں کیسے پیش آ سکتا تھا۔ کرنل نے کسان کے اس انگریزی خواندہ بیٹے کو بالوں سے پکڑ اور اس کی ناک کو اپنے جوتے پر رگڑا، پھر بولا ٹھیک ہے، تم نے انگلینڈ میں پڑھا ہو گا لیکن یہاں تو تم ہمارے غلام ہو۔ مجھے السلام علیکم نہیں کہہ سکتے۔

دیہی پنجاب اور سندھ میں کسانوں کی تعداد آبادی کا 80 تا 90 فیصد تھی، لیکن جاگیردار ان کو صرف اپنا غلام سمجھتے تھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ سیاستدانوں نے لاہور میں یا پنجاب کے نصف مشرق میں، جہاں ان میں سے چند قومی حیثیت کے مالک تھے اس اسلام دشمن سماجی طرز عمل کا سنجیدگی سے نوٹس لیا ہو۔ مسلمانوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے کتابیں نہیں لکھیں یہاں تک کہ مولانا ظفر علی خاں کا کثیر الاشاعت اخبار زمیندار بھی اس سلسلے میں خاموش ہے۔ یہ آئندہ ظہور میں آنے والی ایک اسلامی جمہوریہ کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

پنجاب کے نصف مشرق میں اور اقلیتی صوبوں میں جاگیردار تو تھے لیکن کسان جو زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے اور جن کی آبادی اسی فیصد تھی، وہ غلام کی طرح نہیں تھے۔ یہاں جاگیردار زیادہ جابر نہیں تھے، بلکہ مہربان تھے حالانکہ انہوں نے کسانوں کی تعلیم کے لئے یا تعلیم کے ذریعے ان میں سیاسی بیداری پھیلانے کے لئے کوئی تحریک نہیں چلائی تھی۔ بالعموم ہندوستان کے دیہات میں جاگیردار سیاست دان گورا صاحب کے آگے یعنی مشرقی پنجاب میں ڈپٹی کمشنر اور باقی صوبوں میں ڈپٹی کلکٹر کے روبرو کسانوں کے معاملات کی پیروی کرتے تھے۔ ان علاقوں میں بھی لوگوں کو اپنے اوپر اعتماد نہیں تھا اور وہ بھی بیشتر جاگیردار لیڈروں پر تکیہ کرتے تھے۔ جہاں کہیں متوسط طبقے کی قیادت ہوتی وہاں وکلا ان کی درخواستیں پیش کرتے تھے۔ وہاں کے لوگ اپنے بارے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے، ان کو یہی تربیت ملی تھی کہ جو کچھ کہا جائے، وہی کرتے جائیں۔ ان میں سیاسی شعور نہیں تھا اس لئے ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ ایسے لیڈروں کا انتخاب کریں جو ان کے مسائل حل کر سکیں، نہایت اہم نوعیت کے معاملات میں بھی ان کا جو غیر معمولی کردار ہو سکتا تھا، وہ ان سے بھی ناواقف تھے۔ وہ سماجی اور ذہنی توانائی سے محروم تھے۔ انہیں ذرا بھی یہ شعور نہ تھا کہ ان کی سیاسی پارٹی میں اور پارٹی کے لیڈروں میں کون سی خصوصیات ہونی چاہئیں۔

MashalBooks.org

سوائے سرکاری نوکری کے ان کو کوئی اور مسئلہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ وہ صرف نعروں پر زندہ تھے، جیسے ''اسلام خطرے میں ہے یا'' اسلام کے خلاف ہندو انگریز سازش''

دوسری عالمی جنگ کے آخر میں ہندوستان کے مواقع بہت روشن ہو گئے تھے۔ درحقیقت وہ تھوڑے سے لیڈر جن میں فراست اور دور بینی تھی یہ سمجھ گئے تھے کہ برطانیہ کے پاس اب ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ آزادی صاف نظر آ رہی تھی اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی خاص طور پر ہندوستان کے مسلمان اس آزادی کے لئے کس طرح تیار تھے؟ یہ عام فہم بات ہے کہ ہندوستانی معاشرہ، خاص طور پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے۔

حوالے

1۔ مصنفہ کلیم صدیقی

Conflict cricis and war in Pakistan.

پاکستان گل اکنامسٹ کے شمارہ 5 تا 11 اگست 1995ء میں مطبوعہ سلیم علوی کا مقالہ۔

2۔ Doing things the wrong way

3۔ Chiefs and families of note in the Punjab from Major conran and H.D Craig (Punjab Government 1909.)

4۔ سیاسی اتار چڑھاؤ، مطبوعہ آتش فشاں پبلی کیشنز، مصنف منیر احمد منیر۔

5۔ سندھ، خاموشی کی آواز، پروگیسیو پبلشرز لاہور، مصنفہ ڈاکٹر مبارک علی۔

6۔ پروفیسر کے عزیز، پروگریسیو پبلشرز لاہور۔

The Murder of History in Pakistan.

7۔ Ohm vandon Dungen: The Punjab Tradation: Influence and Anthority in Nineteenth century india George Allen and Unwin LTD London.

MashalBooks.org

8۔عرفان حبیب

Agrarian system of the Mughals.

9۔ Quaid-e-Azam Unrealised Dream (Shamsul Hasam Foundation Karachi.)

مصنفہ خالد شمس الحسن

10۔مصنفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر

The Indian Musalmans Trubner and Co Ltd 1871.

11۔مصنفہ لارنس زائرنگ

The Enigima of Social Development.

12۔مصنفہ جی الانہ کراچی

Our Freedom Fighters (1562-1947).

13,14۔مصنفہ لارنس زائرنگ

The Enigima of Social Development.

15۔مصنفہ عائشہ جلال

The Sole Spkkesman jinnah, The Muslim League and Demand for Pakistan. Cambrige Universty (Press 1985).

MashalBooks.org

باب نمبر 3

آزادی نے ہندوستانی مسلمانوں کو آ لیا

جدید جمہوریت کا تقاضا ہے کہ اگر انتخابات میں مؤثر طور پر کامیاب ہونا اور مسائل کو مؤثر انداز سے حل کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے منظّم سیاسی پارٹیوں کی موجودگی ضروری ہو گی جن میں عوام شد و مد سے شریک ہوں۔ کسی سیاسی پارٹی کو خواہ کتنی ہی بھرپور حمایت حاصل ہو، صرف ایک منظّم جماعت ہی اس حمایت کو ایک محکم نامے کی صورت میں بدل سکتی ہے۔ سیاست دان اپنی سیاسی حکمت سے عوام کی اس محکم تائید کو پالیسیوں میں بدل دیتا ہے۔ اس طرح جو پالیسیاں بنائی جاتی ہیں، انہیں لائق سیاسی لیڈروں کی ہدایت کے مطابق ایک تجربہ کار اور آزمودہ بیوروکریسی یا انتظامیہ عملی جامہ پہناتی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں ان میں سے کوئی بھی خصوصیت نہیں تھی حالانکہ اسے ہندوستانی مسلمانوں کی بھاری حمایت حاصل تھی۔ مسلم لیگ کے پاس نہ تو ایک مؤثر تنظیم تھی نہ کل وقتی تربیت یافتہ اور تجربہ کار سیاسی کارکن تھے اور نہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار کل وقتی سیاسی لیڈر تھے۔ علاوہ ازیں جو لیڈر تھے وہ بڑے جاگیرداروں اور اونچے اور متوسط طبقے کے متمول وکیلوں کے درمیان سے آئے تھے۔

یہ وہ حالات تھے کہ انہیں ایک امداد مل گئی۔ یہ امداد بالکل غیر متوقع طور پر اور واقعی جس کا کوئی امکان نہیں تھا، ایک ممنوعہ علاقے سے آئی کمیونسٹ پارٹی پاکستان کی حمایتی بن گئی۔ ایک ایسے اشتراکی نظریے کی بنیاد جس کا اب تک انکشاف نہیں ہوا تھا، وہ یہ کہ ہندوستان میں بہت سی قومیں آباد ہیں اور ہر قوم کو حق خود اختیاری حاصل ہے۔ ہندوستانی کمیونسٹوں کے نظریے کی رو سے مسلمان ایک قوم تھے۔ چنانچہ پارٹی کی ہدایات کے تحت

MashalBooks.org

مسلمانوں کمیونسٹ سب کے سب انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ کی مدد کو آ گئے۔

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی ایک بہت ہی چھوٹی سی پارٹی تھی لیکن انتہائی درجہ منظّم اور سیاسی جذبے سے سرشار تھی۔ تاہم ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد کے تناسب سے مسلمان کمیونسٹوں کی تعداد تو اور بھی کم تھی۔ بہرحال پاکستان کے قیام کے لئے مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں کمیونسٹ مسلمان پوری طرح شامل ہو گئے۔ انہوں نے بھرپور کام کے لیے پنجاب کا انتخاب کیا۔ انڈین کمیونسٹ پارٹی نے پہلے ہی میاں افتخار الدین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں یقیناً یہ مشورہ پارٹی کی اعلیٰ قیادت کی طرف سے آیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے پاس لیڈروں اور کارکنوں کی ایک نہایت موثر تعداد موجود تھی، ان میں انیس ہاشمی، عطاء اللہ جہانیاں، دانیال لطیفی، عبداللہ ملک، سی آر اسلم، مرزا محمد ابراہیم اور دیگر بہت سے افراد شامل تھے۔ پنجاب کے انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی کے مسلمان کارکنوں کا کیا کردار تھا اور جو یقیناً نہایت اہم بلکہ فیصلہ کن تھا، اسے خود ایک کمیونسٹ کارکن سی آر اسلم نے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو ''پاکستان کے تاریخ ایک فراموش کردہ ورق (A Neglected Leaf of the History of Pakistan) کے عنوان سے 27 اگست 1994ء کے دی فرنٹیئر پوسٹ میں شائع ہوا۔

انیس ہاشمی مسلمہ طور پر ایک نہایت وفادار سیاسی کارکن تھے جو بعد میں پاکستان کے اندر ترقی پسند تحریک کے سرکردہ ارکان میں شامل ہوئے۔ اس وقت انہیں دہلی میں مسلم لیگ کا سیکرٹری بنایا گیا۔ ہندوستان کے اس بڑے شہر میں مسلم لیگ کو منظّم کرنے کے لیے انہوں نے اپنی بہترین کوششیں صرف کیں۔ مسلم لیگ کے مقاصد کو عام کرنے کے لئے انہوں نے دہلی سے ایک اخبار بھی نکالا۔ بیرسٹر دانیال لطیفی ایک ممتاز اور مشہور وکیل تھے اور اب بھی وہ بمبئی میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ (اب ان کا انتقال ہو گیا ہے مترجم) انہیں پنجاب مسلم لیگ کا آفس سیکرٹری بنایا گیا۔ دفتر قائم کرنے اور پارٹی کو پورے پنجاب میں متعارف کرانے کے لئے انہوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کا ایک کارنامہ مسلم لیگ کے انتخابی منشور کی تدوین تھی جسے لیگ کی مجلس عاملہ نے منظور کیا تھا۔ اس دستاویز میں مسلم لیگ کا آئندہ نقطۂ نظر بیان کیا گیا تھا جس کی بنیاد پر ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گا جو

MashalBooks.org

جاگیردارانہ رشتوں کے استحصال سے پاک ہوگا اور اس میں سماجی انصاف کے حصول شامل ہوں گے۔ اس منشور کی بدولت لیگ کو پورے پنجاب میں عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی اور یہ اسی منشور کا نتیجہ تھا کہ 1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ نے کانگریس کے برابر اور نہایت مؤثر کامیابی حاصل کی۔

عطاء اللہ جہانیاں کسانوں کے مقاصد کے لئے سرگرم ایک مقبول سیاسی کارکن تھے۔ وہ کسان کمیٹی کے ایک اہم لیڈر بھی تھے۔ دیہی علاقوں میں مسلم لیگ کو متعارف اور مقبول بنانا ان کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ وہ ایک پرجوش مقرر تھے اور یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ پنجاب میں یونینسٹوں کے خلاف دیہی عوام کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ عبداللہ ملک ایک نہایت لائق اور پاکستانی صحافت میں آزمودہ اور پختہ کار شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ سے متعلق مسلم لیگ کی اندرونی تنظیم کے کلیتاً ذمہ دار تھے۔ مسلم لیگ کے نام اور اس کے عزائم کو روشن کرنے کے لئے انہوں نے بڑی ذہانت سے کام کیا۔

بدقسمتی سے یونینسٹ پارٹی کے جو جاگیردار اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے، انہوں نے یہ خیال رکھا کہ وہ ایک ایک لفظ جو کمیونسٹوں نے لیگ کے منشور میں لکھا، انتخابات میں کامیابی اور پاکستان کے قیام کے بعد انہیں چن چن کر نکال دیا جائے۔

1945ء کے انتخابات میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی حیثیت زیادہ امید افزا نہیں تھی۔ کانگریس اور اس کے حلیف خدائی خدمت گار کے رضا کار نہایت منظّم تھے اور ان میں جوش و خروش بھی بہت تھا۔ سندھ میں نہ تو لیگ منظّم تھی اور نہ جاگیردار منظّم تھے۔ پنجاب میں کم از کم یہ تو تھا کہ جاگیردار یونینسٹ پارٹی کے اندر منظّم تھے۔ بلوچستان صوبہ نہیں تھا۔ چنانچہ 1945ء کے انتخابات میں اس کا کوئی بڑا کردار نہیں تھا۔

مسلم اکثریتی صوبوں میں صرف بنگال مسلم لیگ قدرے بہتر حالت میں تھی۔ ان کے پاس تجربہ کار سیاسی لیڈر تھے۔ خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی بالائی طبقے سے تھے۔ ابوالہاشم درمیانہ طبقے کے، کچھ تربیت یافتہ پارٹی کارکن بھی تھے۔ مثلاً شیخ مجیب الرحمان جو بعد میں بنگلہ دیش کے بانی ہوئے۔ مسلم لیگ کے دوسرے علاقوں کے کارکنوں

کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ تربیت یافتہ تھے۔ اس کے علاوہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بنگال کی حیثیت بہت اہم تھی۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت معمولی تھی یعنی 54 فیصد پھر بھی ہندوؤں کے مقابلے میں اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے اندر ان کی نمائندگی صرف پانچ فیصد تھی۔ یہاں برطانیہ کے تجارتی مفادات کا بڑے پیمانے پر خیال رکھا گیا تھا اور لیبر اور دوسرے گروپوں کے لئے نشستیں الگ رکھی گئی تھیں۔ مسلم لیگ کو ایک بڑا چیلنج مولوی اے کے فضل الحق اور ان کی کریشک پرجا پارٹی کی صورت میں درپیش تھا اور انہی کے قریبی ساتھی بوس برادرز تھے، جنہوں نے فارورڈ بلاک کے نام سے اپنا الگ گروپ بنا رکھا تھا جس میں کانگریس کے منحرف ارکان شامل تھے۔ فضل الحق نے خدمتِ خلق کے کاموں میں طویل عرصہ گزارا تھا اور عوام میں مقبول تھے۔ انہوں نے 1943ء میں جناح کی ہدایت کے برعکس وائسرائے کی ڈیفنس کونسل میں شرکت کر لی اور مسلم لیگ کی حکم عدولی کے باوجود کامیاب رہے۔ یہاں بھی کمیونسٹ ایک بار پھر مسلم لیگ کی مدد کو آ پہنچے۔ خواجہ ناظم الدین وزیراعلیٰ تھے اور سہروردی لیگ کے اندر ان کے خلاف اپنا گروپ بنانے میں مصروف تھے۔ چند نوجوان پرجوش کارکن سہروردی کے ساتھ تھے۔ مثلاً شیخ مجیب الرحمان، شیخ ظہیر الدین اور ابو الہاشم جن کی بینائی تقریباً ختم ہو چکی تھی، ان کا میلان بائیں بازو کی طرف تھا اور کمیونسٹوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے جن کی بنگال میں اچھی خاصی طاقت تھی۔ سہروردی نے ابوالہاشم کو صوبائی مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کرا دیا۔ چنانچہ فضل الحق کی تمام تر مقبولیت کے باوجود مسلم لیگ نے زبردست انتخابی کامیابی حاصل کی۔

مسلم لیگ نے ہر مسلم نشست جیت لی اور بہت سی جگہوں پر قوم پرست مسلمان امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ کانگریس نے غیر مسلم انتخابی حلقوں میں 91.3 فیصد اور مسلم لیگ نے مسلم انتخابی حلقوں میں پڑنے والے ووٹوں کے 86.6 فیصد حاصل کئے۔ (2)

1945ء کے انتخابت نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ کو مسلم رائے عامہ پر پوری بالادستی اور کانگریس کو ہندوؤں پر غلبہ حاصل ہے۔ اس سے ہمارے کچھ (کانگریسی) لیڈروں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں تھیں جو یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ جناح کو مسلم عوام پر کامل دسترس حاصل ہے۔ (3) مسلم لیگ نے کمیونسٹوں کی مدد سے کچھ عام نشستیں بھی

حاصل کر لیں اور اچھوت ارکان کی مدد سے حکومت بنا لی۔ جن دنوں کیبنٹ مشن کے ساتھ بڑے اہم نوعیت کے مذاکرات ہو رہے تھے، مسلم لیگ کی ایک مستحکم حکومت صرف بنگال میں تھی لیکن حکومت کے سربراہ لیگ کی اعلیٰ کمان کی خواہش کے برعکس حسین شہید سہروردی تھے۔ لیگ تو ان کے مقابلے میں ناظم الدین کو ترجیح دیتی تھی۔

قرارداد لاہور میں شمال مغرب اور شمال مشرق میں ریاستوں کی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان میں بہت سے بنگالیوں کو اپنے لیے ایک علیحدہ ریاست کا وجود نظر آیا۔ جب بنگال کی تقسیم ناگزیر نظر آتی تو ہندوؤں اور مسلم لیگی لیڈروں نے آخری لمحے تک تقسیم سے بچنے کی کوشش کی۔ سہروردی نے اس کے لیے ایک فارمولا متحدہ خود مختار بنگال کی صورت میں پیش کیا اور اس کے لیے بہت سے غیر مسلم لیڈروں مثلاً سرت چندر بوس، کرن شنکر رائے اور سریندر موہ کھوش کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے جناح سے بھی یقین دہانی حاصل کر لی کہ اگر بنگال کے ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے لیڈر اس تجویز پر متفق ہوں گے تو ان کی طرف سے مخالفت نہیں ہو گی لیکن کانگریس کے لیڈروں نے اس تجویز کو رد کر دیا اور بنگال کو بالآخر ہندوستانی بنگال اور پاکستانی بنگال میں تقسیم کرنا پڑا۔ یہ کانگریس کا نہایت منفی کردار تھا لیکن یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی نہیں تھا۔ مشرقی بنگال مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے خواجہ ناظم الدین کو اپنا قائد چن لیا اور وہ مشرقی بنگال یا مشرقی پاکستان کے وزیر بن گئے۔

اعلانِ آزادی کے معاً بعد فرقہ وارانہ فسادات نے برصغیر کے پورے شمالی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سہروردی کلکتہ میں ٹھہرے رہے، وہ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے میں گاندھی کے ساتھ تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ پورے بنگال کو فسادات کے اس آتش فشاں سے بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ پاکستان آئیں گے اور یہاں آئین سازی کے عمل میں حصہ لیں گے تو نہایت عملیت سے ایک بل منظور کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی سے ان کی رکنیت خارج کر دی گئی۔ اس کے باوجود وہ پاکستان آئے اور عوامی لیگ کو حزب اختلاف کے طور پر منظم کرنے کی کوشش کی۔ وہ بہت سے اہم لیڈروں مثلاً خان عبدالغفار خان، پیر صاحب مانکی شریف جنہوں نے 1947ء کے ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی کے لئے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ جی ایم

سید، پیر الٰہی بخش، نواب زادہ نصر اللہ خان اور کچھ دوسرے لیڈروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن صوبہ سرحد میں خان عبدالغار خان اور کچھ دوسرے صوبوں کی انتظامیہ نے انہیں آزادی سے کام کرنے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ کہ عوامی پارٹی ایک علاقائی پارٹی کی طرح سمٹ کر رہ گئی اور اس کا منطقی نتیجہ ایک آزاد اور خودمختار بنگلہ دیش کی صورت میں ظاہر ہوا۔

250 ارکان پر مشتمل بنگال اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے 115 نشستیں مقرر تھیں جن میں سے مسلم لیگ نے 112 نشستیں حاصل کر لیں۔ یہ مسلم ووٹوں کا 93.5 فیصد تھا۔ 127 غیر مسلم نشستوں میں کانگریس کو 62 نشستیں یعنی ہندو ووٹوں کے 50 سے قدرے کم ووٹ ملے۔ پنجاب اسمبلی کے 175 ارکان میں مسلمانوں کے لیے 88 نشستیں مختص تھیں، مسلم لیگ کو 75 نشستیں حاصل ہوئیں۔ حکومت بنانے کے لئے مسلم لیگ کو 88 ارکان کی حمایت حاصل کرنی تھی گویا 13 ارکان کی کمی تھی۔ ان نشستوں پر یونینسٹ اور ان کے معاون کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان کے لیے جو شدید جذبہ بنگالی مسلمانوں میں پایا جاتا تھا، پنجاب کے مسلمانوں میں یہ جذبہ ان سے کہیں کم تھا۔ پنجاب کے نصف مشرقی حصے میں جسے پاکستان میں شامل نہیں ہونا تھا، لیگ کا ریکارڈ کہیں بہتر تھا اور وہاں کے مسلمانوں کی تائید پاکستان کے لئے تقریباً مکمل تھی۔ پنجاب کے نصف مغرب میں جسے پاکستان کا ایک حصہ بننا تھا، مسلمانوں کی حمایت نیم دلانہ تھی۔ بااثر جاگیرداروں کے درمیان جن کا 80 تا 90 فیصد دیہی آبادی پر تسلط تھا، پنجابی مسلمانوں میں پاکستان کے لیے بمشکل کوئی جوش و خروش نظر آتا تھا۔ جاگیردار نہ صرف یہ کہ 80 فیصد دیہی آبادی کو اپنے تابع رکھتے تھے بلکہ ان کی پوری معیشت اور سماجی زندگی پر ان کا تسلط تھا۔ آزادی سے پہلے مغربی پنجاب میں کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی اور معیشت کا تمام تر انحصار زراعت اور دیہی وسائل پر تھا۔

اب جو پاکستان بنے گا، اس میں پاکستانی پنجاب کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر مسلم لیگ کا بمشکل کوئی اختیار ہو گا۔ یہ سب کچھ جاگیرداروں کی صوابدید پر ہو گا۔ پنجاب کی بدحالی کا احوال عبدالحمید دستی نے اپنے انٹرویو میں بخوبی بیان کیا تھا۔[5] انٹرویو کرنے والے منیر احمد منیر تھے۔ دستی نے اپنے انٹرویو میں کہا ''1920ء میں مظفر گڑھ میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب 95 فیصد تھا لیکن وہاں کے گورنمنٹ ہائی سکول میں 125 طلبہ کے

MashalBooks.org

درمیان مسلمان طلبہ کی تعداد صرف 25 تھی۔ ہندوؤں نے اپنا ایک الگ سکول بھی کھولا تھا۔ وکلاء کی تعداد 23 تھی، ان میں مسلمان صرف 3 تھے۔ ان میں بھی ایک لاہور کا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ یا میونسپل کمیٹی آفس میں ایک بھی مسلمان کلرک نہیں تھا، کوئی مسلمان اگر خوش قسمتی سے مڈل پاس کر لیتا تو سکول کی مدرسی اس کی سب سے بڑی آرزو ہوتی۔(6)''

پروفیسر میاں سلیم کے بیان کی رو سے سندھ کے مسلمانوں کی حالت اگر کچھ تھی تو اس سے بدتر تھی۔ پروفیسر کی معلومات کا ماخذ جی ایم سید کی کتاب ہے۔ اس کا موضوع ہے ''سندھی مسلمانوں کا حال جاننے کے لیئے'' یہ کتاب 1943ء میں شائع ہوئی تھی۔ جی ایم سید آزادی پہلے ایک سرکردہ مسلمان لیڈر تھے۔ آزادی کے بعد وہ قوم پرست سندھی لیڈر کی حیثیت سے ایک مرتبے پر فائز ہوئے۔ سید کا بیان ہے کہ 1943ء میں 92 فیصد مسلمان بالکل ان پڑھ تھے۔ ہندو نہ صرف یہ کہ زرعی اجناس کی تجارت پر کلیتاً قابض تھے بلکہ تمام سرکاری ملازمتوں پر انہی کی اجارہ داری تھی۔ خاص طور پر اعلیٰ عہدے تو انہی کے تصرف میں تھے۔ سولہ آئی سی ایس افسروں میں ہی ایک مسلمان تھا اور وہ بھی اس وقت دہرہ دون کی سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت تھا۔ سندھی مسلمانوں کا متوسط طبقہ انتہائی کمزور اور وہ بھی اپنے معاشی مسائل میں الجھا رہتا تھا۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہاریوں پر مشتمل تھی جو دیہات میں آباد تھے۔

سندھ اور سرحد دو ہی ایسے صوبے تھے جن میں مسلمان اپنے منتخب ارکان کی اکثریت کی بنا پر بطور خود وزارت بنا سکتے تھے۔ سندھ اسمبلی میں ارکان کی تعداد 60 فیصد تھی جن میں مسلمانوں کے لئے 35 نشستیں مخصوص تھیں۔ ان میں دو شہری تھیں، باقی دو دیہی۔ 1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے دونوں شہری نشستیں جیت لیں لیکن 33 دیہی نشستوں میں سے صرف 26 پر کامیاب ہوئی۔ ساٹھ ارکان کے ایوان میں لیگی ارکان کی تعداد 28 تھی۔

صوبہ سرحد میں لیگ کا معاملہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ AIML/SHC/6 FILE NO 29 صوبہ سرحد جلد اول کے مطابق جناح نے 2 مئی 1945ء کو سردار عبدالرب نشتر سے خط میں پوچھا ''کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ لیگ وہاں کیا کر رہی ہے اور لیگی وزارت کی شکست کے بعد آپ وہاں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ چار مسلم لیگی

MashalBooks.org

وزراء میں سے کسی ایک سے بھی میں نے کچھ نہیں سنا۔'' جناح کا سوال اورنگزیب وزارت کی شکست کے حوالے سے تھا جو محض برائے نام ایک لیگی وزارت تھی۔ یہ کسی اصول کے تحت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا سبب سعد اللہ خان کے ذاتی عزائم تھے جو لیگ اسمبلی پارٹی سے ٹوٹ کر الگ ہوئے تھے۔ خان غفار خان کی وجہ سے صوبہ سرحد کانگریس کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ 1939ء میں جب کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دی تھیں اور بعد میں ان کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے، اس وقت مسلم لیگ کسی عوامی حمایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ جوڑ توڑ سے حکومت میں آ گئی تھی۔ نشتر اور قیوم دونوں سربراہی کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر ایک اپنے حمایتیوں سے کہتا تھا کہ دوسرے فریق کو نیچا دکھاؤ۔ ایسے میں اگر کانگریس نے انتخابات جیت لیے تو اس میں حیران ہونے کی کیا بات تھی؟ اس نے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے صوبہ سرحد کی مسلم نشست جیت لی۔ صوبائی اسمبلی کی 19 مسلم نشستوں پر اور 14 غیر مسلم نشستوں پر (جن میں سے 11 نشستیں کانگریس کی، 2 آزاد مسلمان امیدواروں کی اور ایک نشست پینتھی سکھ کی تھی) ان کا قبضہ ہو گیا۔ 36 مسلم نشستوں میں سے لیگ صرف 17 نشستیں جیت سکی۔ (7) لیگ صوبہ سرحد میں نصف سے بھی کم مسلم نشستوں پر کامیاب ہو سکی۔

1945ء کے انتخابات چونکہ محدود رائے دہی کی بنیاد پر ہوئے تھے، عوام پورے طور پر ان میں شریک نہ تھے اس لیے مسلمان اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی کامیابی واضح تھی اور وہ اپنے طور پر وزارت بنا سکتی تھی لیکن وہ صرف بنگال میں وزارت بنا سکی۔ 1945ء کے انتخابات کے بعد لیگ کی حیثیت دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں میں واقعی قابلِ رحم تھی۔ سندھ میں مسلم لیگ اپنی وزارت بنا سکی اول اس لیے کہ گورنر نے ایک خطاب یافتہ مسلمان سر غلام حسین ہدایت اللہ کو اپنی حکومت بنانے کے لیے کہا۔ جاگیردارانہ روایت کے مطابق کوئی بھی فرد چاہے وہ سر غلام حسین کی طرح جاگیردارانہ ہوتا یا اقتدار میں معمولی حیثیت کا آدمی ہوتا، سودے بازی کر کے اتنے ووٹ ضرور حاصل کر لیتا کہ اقتدار کی کرسی پر براجمان رہتا۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گورنر کے پاس مسلم لیگ کی وزارت کی مدد کرنے والے تین یورپی موجود تھے۔ (8) اگر گورنر فرانسس موڈی نہ ہوتے تو لیگ سندھ میں ایک سیاسی طاقت کے طور پر ختم ہو گئی ہوتی۔ اس کے باوجود لیگ کی وزارت

برقرار نہ رہ سکی۔ ایک رکن نے اپنے ووٹ کا سودا کر لیا اور اس کی وزارت ٹوٹ گئی۔ البتہ آئندہ انتخابات میں گورنر فرانسس موڈی نے یہ خیال رکھا کہ مسلم لیگ کامیاب ہو جائے۔

صوبہ سرحد میں جہاں 55 ارکان کے ایوان میں مسلم نشستیں 36 تھیں، مسلم لیگ صرف 17 پر کامیاب ہوسکی۔ ان 17 کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ جو کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ دو آزاد امیدوار کانگریس کی خوشنودی کے نتیجے میں کامیاب ہوئے اس طرح ان کی تعداد 19 ہوگئی پھر کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے غیر مسلم بھی تھے۔

صوبہ سرحد میں جہاں کانگریس نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی تھی، ہندوؤں کی بالادستی کا نعرہ بے معنی ثابت ہوا۔ مسلمان پختونوں کی بھاری اکثریت تھی اور وہ سب بڑے طاقتور تھے۔ انہوں نے 1920ء کے عشرے کے آخری برسوں سے حال تک خدائی خدمت گار تحریک کے اندر رہتے ہوئے طویل سیاسی تربیت حاصل کی تھی۔ پختونوں میں اتنا شعور موجود تھا کہ وہ سیاسی معاملات کو سیاسی نظر سے دیکھتے تھے اور جذباتی نعروں میں بہہ جانے والے نہیں تھے۔ ان باتوں کے باوجود پختونوں میں تعلیم کی کمی تھی اور ان کی قیادت انہیں علم اور تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے میں ناکام رہی۔ باقی رہے ان کے قبائلی ہم زاد جن کی کوئی سیاسی تربیت نہ تھی، وہ اب تک بندوق پر ہی یقین رکھتے تھے اور پاکستان کے نعرے میں ان کے لیے صرف ایک جذباتی اپیل تھی۔

صوبہ سندھ کی کیفیت یہ تھی کہ کانگریس وہاں جیت نہیں سکی اور مسلمان بھاری اکثریت سے کامیاب نہ ہو سکے۔ سندھ میں بھی اکثریتی آبادی مسلمانوں کی ہی تھی۔ تاہم یہاں دو شہروں کراچی اور حیدرآباد کو چھوڑ کر ہر جگہ ہندوؤں کی موجودگی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ تعلیم، تجارت اور مالیات میں ان کی بالادستی واضح تھی۔ دیہی سندھ کلیتاً ایک زمانہ وسطیٰ کا جاگیردارانہ ملک تھا یہاں جاگیرداروں کا اپنے محکوم کسانوں پر پورا پورا تسلط تھا۔ انگریزوں کے زیر سایہ وہ یہاں ہر شے کے مالک و مختار تھے۔ ان میں نہ تعلیم تھی اور نہ شعور تھا اور نہ وہ ہندوؤں کی دانشوری اور معاشی بالادستی سے مرعوب تھے۔ دراصل ہندوؤں کی انہیں اس لیے ضرورت تھی کہ اپنی پرتعیش زندگی کے لیے ان سے قرض لیتے تھے۔ کوئی ذی شعور مسلمان متوسط طبقہ نظر نہیں آتا تھا۔ مقتدر جاگیردار اتنے لاعلم تھے کہ انہیں سیاسی

معاملات کا کوئی ادراک نہیں تھا۔ حالانکہ آبادی میں ان کی تعداد بہت معمولی سی تھی لیکن لے دے کر انہی کا وجود تھا جو شمار میں آتے تھے اور وہ کلکٹر صاحب کی نوازش یا لاٹ صاحب کی مہربانی سے کہ سندھ 1930ء کے عشرے کے وسط میں الگ صوبہ بن گیا تھا۔ ایک دوسرے کے اکھاڑ پچھاڑ میں لگے ہوئے تھے۔

پنجاب کا صوبہ سرحد یکسر مختلف اور بعض معاملات میں سندھ سے بھی الگ تھا۔ پنجاب میں ایک تعلیم یافتہ، شہری اور اپنی بات کرنے والا متوسط طبقہ موجود تھا۔ البتہ سیاسی طور پر بالادست نہیں تھا۔ پنجاب کے جاگیردارانہ سندھی جاگیرداروں کی ہی طرح تھے لیکن ان میں سے چند ایک صوبائی اور ملکی سطح پر اقتدار کے کھیل میں نمایاں طور پر شامل تھے۔سندھی جاگیرداروں کے مقابلے میں انہیں ایک اور طرح سے برتری حاصل تھی۔ وہ انگریزی راج کو نسبتاً زیادہ عزیز تھے کیونکہ ان کے آباؤ اجداد نے 1857ء کی بغاوت کو کچلنے میں اور سکھوں کی شکست کے بعد راج کو مستحکم بنانے کے لیے خدمات انجام دی تھیں۔ سندھ پر قبضے اور وہاں اپنے اقتدار کے لیے انگریز سندھی جاگیرداروں کے کچھ زیادہ مرہونِ احسان نہیں تھے۔لیکن سندھ اور پنجاب کے جاگیرداروں کے درمیان طبقاتی اعتبار سے ایک اور بہت بڑا فرق تھا۔ پنجابی جاگیردار آپس کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے کسی حد تک آزاد تھے اور یونینسٹ پارٹی کی صورت میں ایک متحدہ محاذ بن گئے تھے لیکن سندھی جاگیرداروں کے درمیان ایک دوسرے سے اتنی بے اعتباری تھی کہ وہ اپنے طبقاتی مفادات کی خاطر بھی ایک سیاسی پارٹی نہیں بنا سکے۔ علاوہ ازیں پنجاب کے مسلمان برطانیہ کی شاہی فوج کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی طرح تھے۔ سندھ کے مسلمانوں کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ پختونوں کا درمیانہ طبقہ تعداد میں بہت مختصر سا تھا لیکن اس کے برعکس پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ نسبتاً بڑا ہونے کے باوجود سیاسی فہم سے عاری تھا۔ اس کے باوصف وہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کے خلاف برابر بولتا رہتا تھا اس طبقے کے مسلمان نوجوانوں کو جب کالجوں میں خاص طور پر پیشہ وارانہ تربیت کے کالجوں میں داخلے نہیں ملتے تھے تو وہ اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے تھے۔ تجارت پیشہ مسلمانوں کو جب تجارت، بینکاری اور صنعت کے شعبوں میں اپنا وجود کہیں نظر نہیں آتا تھا تو وہ اس پر احتجاج کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انہیں یہ بات ناگوار ہوتی تھی کہ لاہور کے متمول

MashalBooks.org

علاقوں کی طرح مال روڈ پر تمام عمارتیں ہندوؤں اور سکھوں کی ہیں اور انارکلی کی دکانوں میں بھی وہی نظر آتے تھے۔ مال روڈ پر مسلمانوں کی صرف دو عمارتیں تھیں۔ تقریباً یہی صورتحال پورے پنجاب میں تھی۔ مسلمانوں کو ہر جگہ اپنے خلاف امتیازی سلوک نظر آتا تھا۔ پنجابی مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں بھی تقریباً یہی مسائل درپیش تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ان کے احساسِ محرومی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پنجاب میں اسے زیادہ محسوس کیا گیا کیونکہ وہاں مسلمانوں کا ایک تعلیم یافتہ طبقہ موجود تھا اور انہیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ اکثریت میں تھے۔ چاہے وہ اکثریت کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں کو بھی یہی مسئلہ درپیش رہتا تھا۔ بیشتر کو صرف ان کے کوٹے کی بنیاد پر نوکریاں ملتی تھیں۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب 1940ء میں قرارداد لاہور منظور کی گئی جس سے مسلمانوں کے درمیانہ طبقے کو زبردست تقویت ملی۔ انہوں نے بڑے جوش سے اور بھاری تعداد میں پاکستان کی جو حمایت حاصل کی، اس کے جذباتی اسباب بھی تھے۔ ان کے تحت الشعور میں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے امتیازی رویے کا خوف موجود تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی قیادت نے خاص طور پر مسلمان سرکاری ملازموں نے پاکستان کی جذباتی حمایت اس شدت سے کی کہ اسے ایک نظریہ بنا دیا۔ اس سے انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ پاکستان ان مسائل کا حل ہوگا یہاں ان کی سیاسی بالادستی کی بدولت ہندوؤں اور سکھوں کے امتیازی رویے پر قابو پایا جا سکے گا۔ انہیں کالجوں میں داخلے ملنے لگیں گے، وہ تجارت اور صنعت کے شعبوں میں داخل ہو سکیں گے اور وہ بھی عمارتوں کے مالک ہوں گے۔

بنگال کا معاملہ اس مطالعے کے ضمن میں نہیں آتا۔ تاہم پنجاب کے متوسط طبقے اور چھوٹے کاروباری طبقے کی طرح پاکستان کی حمایت کا سبب ان کے یہاں بھی تقریباً یہی تھا۔ پنجاب اور سندھ کی طرز پر بنگال میں نمایاں طور پر مسلمانوں کا کوئی جاگیردار طبقہ موجود نہیں تھا، کوئی جاگیردارانہ مفاد وابستہ نہیں تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی طرف داری کرتے یا پاکستان کی مخالفت کرتے۔ بنگالی اشرافیہ تعلیم یافتہ اور شائستہ تھی اور ان میں سیاسی شعور بھی تھا۔ پاکستان پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی عددی اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا کیونکہ جناح کو بھاری تعداد میں مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی۔ یہ تعداد اتنی زیادہ تھی کہ صوبہ سرحد اور سندھ میں جو مخالفت ہوئی تھی اس کا اثر بھی معتدل ہو گیا۔ پنجاب میں جہاں جاگیردار

MashalBooks.org

ہی کسی شمار میں تھے، ان کی جزوی حمایت کے نتیجے میں بھی مخالفت کا اثر دب کر رہ گیا۔ البتہ مشرقی پنجاب میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، پاکستان کے مطالبے کو بھرپور تائید حاصل ہوئی جاگیرداروں نے مسلم لیگ کی حمایت تمام تر اپنے طبقاتی مفاد میں کی تھی۔ البتہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے پاکستان کے مطالبے کی حمایت اس قدر جوش وخروش سے کیوں کی تھی حالانکہ اس میں ان کے لیے براہ راست فائدے کی بھی کوئی بات نہیں تھی یہ بات سمجھانے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔

مسلم اقلیتی صوبوں میں سے بعض ایک مثلاً اڑیسہ میں مسلمانوں کی تعداد نہایت معمولی تھی۔ اس سے کچھ زیادہ مدراس اور بمبئی میں تھی جس میں گجرات اور کاٹھیا واڑ شامل تھے۔ سنٹرل پراؤنسز (سی پی) میں مسلمانوں کی فی صد شرح قدرے زیادہ تھی۔ ان صوبوں میں سیاسی اثر ان کی محدود تعداد کے تناسب سے ہی تھا۔ البتہ دہلی، یوپی اور بہار میں یہ بات نہیں تھی حالانکہ مسلمان ان جگہوں پر بھی اقلیت میں ہی تھے۔ دہلی میں، جہاں کی آبادی دو لاکھ سے کچھ زیادہ تھی، مسلمان 26 فیصد کی تعداد میں تھے۔ یوپی میں جہاں کی آبادی دس کروڑ تھی، مسلمان 14 فیصد تھے اور بہار کی سات کروڑ آبادی میں مسلمان 11 فیصد تھے لیکن یہ مراعات یافتہ طبقے کے لوگ تھے کیونکہ ان مراکز میں مسلمانوں نے تقریباً 8 سو برس تک حکومت کی تھی۔ یوپی، بہار حتیٰ کہ سی پی کے شمال میں مسلمانوں کے پاس اراضی ان کی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ تھی، اس لیے ان کا سیاسی دبدبہ ان کے عددی تناسب سے زیادہ تھا۔

مسلمان محض مراعات یافتہ نہیں تھے۔ خود ہندوؤں نے بھی ان کی تہذیب اپنا لی تھی۔ سری پرکاش نے جو پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر تھے، اپنے تجربات قلم بند کیے ہیں۔ ان کے بقول مسلمانوں کی تہذیب نے ہندوؤں کی اکثریتی آبادی کو متاثر کیا تھا اور وہ مسلمانوں کی معاشرت کے زیر اثر آ گئے تھے۔ تعلیم یافتہ ہندو خاص طور پر کشمیری پنڈت اور کائستھ ہندی زبان کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنی فارسی اور عربی دانی پر فخر کرتے تھے۔ سری پرکاش نے بھرتندو ہریش چندر کی مثال پیش کی جو ہندی زبان کو فروغ دینے کے لئے جہاد کر رہے تھے۔ وہ عربی اور فارسی خوب جانتے تھے لیکن انہیں سنسکرت نہیں آتی تھی، ان کے اپنے خاندان کے افراد اردو بولتے تھے اور وہ خود اردو اخبار پڑھتے تھے۔ یہ

MashalBooks.org

بات کسی ایک خاندان یا ایک علاقے تک محدود نہیں تھی۔ مسلم تہذیب نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سری پرکاش کے بقول یوپی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب مشترک تھی۔ اسے بجا طور پر ہندوستانی مغل تہذیب کہا جائے گا۔

مسلمان کو ہندوؤں پر کچھ برتری حاصل تھی لیکن اس سے بھی سوا وہ اپنے آپ کو حکمران طبقے کے لوگ سمجھتے تھے۔ ہندو ان کی اس حیثیت سے انکار بھی نہیں کرتے تھے۔ کیا آگرہ اور دہلی کے شاہی درباروں میں بھی مسلمانوں کی یہی حیثیت تھی۔ یہ بات اختلافی اور بحث طلب ہوسکتی ہے لیکن آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کا جتنا حق بنتا تھا، وہ اس سے کہیں زیادہ زمینوں کے مالک تھے۔ البتہ معاشی طور پر طاقتور نہ تھے کیونکہ زمیندار خواہ دہندہ ہوں یا مسلمان، دونوں معاشی طر پر کمزور اور ہندو ساہوکاروں کے مقروض تھے۔

برطانوی راج میں بھی مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ یہ صورت پولیس میں خاص طور پر تھی۔ یوپی میں تقریباً پچاس فیصد پولیس کے ملازم مسلمان تھے۔ ضلعی انتظامیہ میں مسلمان ان کی آبادی کو دیکھتے ہوئے استحقاق سے زیادہ بلکہ دگنی اور تگنی تعداد میں عہدوں پر مقرر تھے۔ بہار میں بھی صورتحال کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ مسلمانوں کو کس قدر مراعات حاصل تھیں اور وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ تعلیم میں اور فہم و فراست میں وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں جہاں داخلے کیلئے اہلیت اور لیاقت درکار تھی، مسلمان ہندوؤں کا پوری طرح مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں جب آزادی کے امکانات نظر آنے لگے تھے، مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کا اضطراب ہر روز بڑھتا جاتا تھا۔ دراصل ان کی تشویش کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کانگریس نے 1937ء میں یوپی اور بہار کے اندر وزارتیں بنائیں اور لگان داری کے قوانین نافذ کیے۔ یہ قوانین کوئی انقلاب نوعیت کے نہیں تھے لیکن غیر حاضر زمینداروں پر اس کا بڑا اثر پڑا، جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اب ان پر یہ بات کھل گئی کہ انہیں جو ناواجب مراعات حاصل کر رہی ہیں، آزادی ان کا حساب کتاب برابر کر دے گی۔ انہیں کانگریس کے ہاتھوں ایک خیالی تعذیب کا خوف دامن گیر ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد اگرچہ شاید ہی کبھی ہوتے ہوں لیکن ان میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی

MashalBooks.org

جانیں ضائع ہوتی تھیں۔ مقامی مسلم لیگی لیڈروں نے مسلمانوں کے خوف میں ان پر مظالم کی فرضی کہانیاں سنا کر اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہی وہ حالات تھے جب لکھنو میں 1937ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اس سے پہلے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ہندوستان میں منتخب صوبائی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ مسلم لیگ کے لکھنؤ سیشن میں تقریر کرتے ہوئے شعلہ بیاں مقرر اے کے فضل الحق نے کہا تھا مسلمانوں کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے ان پر ہونے والے مظالم کا بدلہ ہم بنگال میں لے لیں گے۔ یہ واہ واہ حاصل کرنے کے لئے ان کی کھوکھلی لفاظی تھی کیونکہ بنگال میں مولوی صاحب اور ہندو مہاسبھا کی مخلوط حکومت تھی۔ اس بات سے مسلمانوں میں ایک جھوٹی امید بندھ گئی۔ ان کے جذبات میں خواہ مخواہ ابال آ گیا اور ہندو مسلم تفریق اور بھی بڑھ گئی۔

1940ء کی قرارداد لاہور، مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں ایک الگ وطن کے قیام کی خاطر اس مفروضے پر منظور کی گئی تھی کہ سارے مسلمان ایک قوم ہیں۔ اس قرارداد میں آبادیوں کا تبادلہ ہرگز شامل نہیں تھا۔ قرارداد لاہور سے صرف مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنا تھا اور مسلم اقلیتی صوبوں میں حسب سابق ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا رہنا ان کا مقدر ٹھہرا اور اس بات کا انہیں بخوبی علم تھا۔ اس کے باوجود مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی جانب سے قرارداد لاہور کی حمایت حیران کن تھی۔

مرکز میں حکومت کی ملازمتوں پر فائز مسلمانوں کا معاملہ اقلیتی صوبوں میں ویسا ہی تھا جیسا کہ پنجابی حکومت کے ملازموں کا تھا۔ پاکستان کی حمایت کا سبب ان کے یہاں وہی تھا جو مرکزی حکومت میں پنجابی مسلمانوں کا تھا یعنی اپنا کیریئر (عہدے اور ترقی) البتہ اقلیتی صوبوں کے مسلمان ملازمین میں کچھ استثنائی مثالیں بھی تھیں جیسا کہ پنجابی مسلمانوں میں تھیں۔ البتہ ایسے لوگ اکا دکا ہی تھے۔

اقلیتی صوبے کے مسلمانوں کو یہ خوش گمانی تھی کہ ہندوستان کے دونوں سروں پر واقع ریاستوں میں جہاں مسلمانوں کی بالادستی ہو گی، انہیں ہندوؤں کی انتقامی کارروائیوں کے خلاف تحفظ حاصل ہو گا کیونکہ ہندو ماضی بعید میں مسلمان حکومتوں کے ماتحت رہ چکے تھے اور مسلمانوں کو جو مراعات حاصل تھیں، ان پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال

تھا کہ بالفرض ہندوؤں نے زیادتی کی تو وہ پاکستان سے مدد لے سکیں گے۔ کیا لکھنؤ میں فضل الحق نے جو تقریر کی تھی اس سے اس طرح کی غلط اندیشی کو تقویت نہیں ملی؟ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے چھوٹے سے مراعات یافتہ مالکان اراضی کو اور مسلمان کے متوسط طبقے کو یہاں تک کہ مسلمان جاگیرداروں اور بالائی طبقے کے مقتدار اشرافیہ میں بھی یہ تحریک ہوئی کہ پاکستان کے مطالبے کی بھرپور حمایت کریں۔ پاکستان نے انہیں نفسیاتی طور پر احساس تحفظ دیا تھا جو حقیقی یا واقعیت پر مبنی نہیں تھا۔ یہ احساس اس مفروضے پر قائم تھا کہ پاکستان، ہندوستان سے زیادہ طاقتور ہوگا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یوپی، بہار، دہلی اور سی پی کے مراعات یافتہ طبقے اور متوسط طبقے کے لوگ حتیٰ کہ بالائی طبقے کے جاگیردار بھی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت سے یکسر محروم تھے۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان جاگیردار سندھ اور پنجاب کے جاگیردار دوستوں ہی کی طرح برطانوی حکومت کو ترجیح دیتے تھے اور مسلم لیگ کو اتنی بھاری تعداد میں ووٹ دینے کا محرک کوئی اعلیٰ اقدار نہ تھیں۔ پنجاب کے متوسط طبقے کے لوگوں اور مسلمان سول ملازمین کی طرح ان کا رویہ بھی خودغرضی پر مبنی تھا۔

جن صوبوں میں، مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، مثال کے طور پر اڑیسہ میں ان کے یہاں ماضی کے حوالے سے کوئی تشویش لاحق نہیں تھی۔ ان کا تعلق زیادہ تر تاجر طبقے سے تھا، ان کی حمایت صرف اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ خیر سگالی کے طور پر تھی۔ مدراس، اڑیسہ اور ایسے ہی دوسرے صوبوں میں پاکستان کی حمایت بے لوث اور کسی غرض کے بغیر تھی۔

آیئے اب عام مسلمانوں کے مقصد کا تجزیہ کرتے ہیں۔ سندھ یا پنجاب دونوں صوبوں میں کسانوں کی ایک بھاری تعداد کو دور دور تک پتہ نہ تھا کہ سیاسی طور پر کیا ہونے جا رہا ہے اور جب پاکستان بن جائے گا، تب کیا ہوگا۔ جس طرح متوسط طبقے یا چھوٹی سطح کے جاگیرداروں کو سرے سے کوئی علم اس بارے میں نہیں تھا۔ ان میں سے ایک طبقہ تو معاشی، سماجی اور اخلاقی طور پر بہت ہی کچلا ہوا تھا اور دوسرے کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ جاگیردار جو تقریباً سبھی مسلمان تھے، ہاریوں اور مزارعوں کا استحصال کرتے اور ان پر ستم توڑتے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے بے غرضی کے ساتھ پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی، ان میں انجینئرنگ اور روز مرہ استعمال کا سامان تیار کرنے والے مزدور، چھوٹے سرمایہ کار،

MashalBooks.org

کاریگر اور محنت کش طبقے کے دوسرے افراد شامل تھے۔ انہیں یہ علم تھا کہ جیسے ہیں، ویسے ہی رہیں گے لیکن آزادی کی فضا میں سانس تو لیں گے۔ ان کے کوئی ذاتی مفادات نہیں تھے جنہیں حاصل کرتے اور بچاتے لیکن انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کے مسلمان بھائی پاکستان میں آزادی سے زندگی گزاریں گے۔ یہی سوچ سارے ہندوستان میں عام مسلمانوں کی تھی۔ صرف ہندوستانی مسلمان عوام پاکستان کی حمایت میں بے لوث تھے۔ اگرچہ ان کے پاس کوئی ووٹ پاکستان کے لئے نہیں تھا۔

یہ بات یاد رہے کہ 1945ء کے عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے کا حق نہ تو شہری عوام کو حاصل تھا اور نہ دیہات کے کسانوں کو۔ مسلم لیگ کے لئے شہری عوام کی حمایت بہت مفید ثابت ہوئی جس کا اظہار ووٹوں میں نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ رائے دہی محدود تھی۔ تاہم انتخابات اہم سیاسی مسائل کی بنیاد پر نہیں ہوتے تھے یعنی یہ کہ پاکستان میں کس طرح کی حکومت ہو گی، کیسی سماجی تبدیلیاں ہوں گی، اقتصادی پالیسی کیا ہو گی، جاگیرداری کے خلاف کیا کیا جائے گا، معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ اور ذات پات کے نظام کے خلاف کیا تدبیر ہو گی اور یہ کہ افلاس، ناخواندگی اور بیماریوں کے ازالے کی کیا تدبیریں ہوں گی۔ انتخابی تقریروں کے دوران میں نہ تو اہم سیاسی مسائل اٹھائے گئے اور نہ ان پر کوئی بحث ہوئی۔

پیروں کے مزے تھے۔ اس طرح مسلم لیگی مولویوں کی بن آئی تھی۔ ہندو مسلم تعلقات کو خراب کرنے اور مسلم لیگ کے لئے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی انہوں نے ہر ممکن کوشش کی اور اس قدر کامیابی حاصل کی جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے تھے، ان کی ایک طویل مشترکہ تاریخ تھی، بہت سی مشترکہ مجلسی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار تھیں اور کچھ باہمی روحانی اقدار بھی تھیں جن کا حوالہ داتا گنج بخش، معین الدین چشتی، بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا اور کبیر اور گرونانک جیسی روحانی شخصیتیں تھیں۔ ان سب کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے۔

میں یہاں اپنا ذاتی مشاہدہ پیش کروں گا۔ سیاست دانوں اور مولویوں کی شعلہ بار تقریروں کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔

MashalBooks.org

کانگریس کے لیڈر تقسیم کا مطالبہ کرنے والوں کو دیش درد ہی یعنی قوم دشمن یا غدار قرار دے رہے تھے اور لیگ کے لیڈر تقسیم کے مخالفوں کو اسلام دشمن کہہ رہے تھے، ان کی تقریروں سے نفرت اتنی بڑھ گئی اور فضا اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ ہندو مسلم فسادات پھیل گئے، ان میں پہلا فساد گڑھ مکتیشور میں ہوا۔ ضلع میرٹھ (یوپی) میں گنگا کے کنارے یہ ہندوؤں کا ایک متبرک مقام ہے۔ گڑھ مکتیشور آنے والے بہت سے یاتریوں نے وہاں رہنے والے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا جو بچ گئے، وہ بھاگ کے میرٹھ آ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نوجوان سماجی کارکنوں کے ایک گروپ نے جن میں میں بھی شامل تھا، یہ ارادہ کیا کہ ہندو اور مسلمان آبادی میں مفاہمت ہو جائے اور وہ مسلمان جو بے گھر ہو گئے ہیں پھر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں۔ اس بنا پر کہ ہندو اور مسلمان کئی نسلوں سے ساتھ رہتے آئے تھے اور ان میں دوستی تھی۔ ہمارے گروپ نے بھی ہندوؤں کی مفاہمت پر آمادہ پایا۔ دراصل گنگا اشنان کے لیے باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں نے یہ فساد کیا تھا۔ مقامی ہندوؤں نے نہیں کیا تھا۔ لیکن ہمارے گروپ کے لوگوں کو یہ دیکھ کر شدید مایوسی ہوئی کہ مسلم لیگی لیڈروں نے مسلمانوں کی آبادکاری میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالی کیونکہ اس طرح مسلم لیگ ہندوستان کی تقسیم کے ایک جواز سے محروم ہو جاتی۔ دراصل انہیں ثابت یہ کرنا تھا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ان کے خیال میں پاکستان کے مقصد کی خاطر سو سے اوپر افراد کا قتل ایک ''معمولی قربانی'' تھی۔

آبادی کا تبادلہ اس وقت تک ان کا مقصود نہیں تھا۔ پاکستان کے قیام کا موجب اسلام نہیں تھا ورنہ وہ اسے اسلام کے لیے معمولی قربانی قرار دیتے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ گروپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا اور بے گھر ہونے والے مسلمان گڑھ مکتیشور میں اپنے گھروں کے اندر بسا دیئے گئے اور یہ کام ان کے ہندو دوستوں نے کیا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ گڑھ مکتیشور میں اس کے بعد پھر کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ اس موضوع سے متعلق بات یہ ہے کہ لیگ کی قیادت میں شامل کچھ لوگ قیام پاکستان کی خاطر چاہتے تھے کہ فسادات ہوں۔ ان میں اتنی بصیرت نہیں تھی کہ ہندو مسلم تعلقات میں خرابی ان مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ ہو گی جو ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ اگر یہ سب بے گھر ہو گئے تو پاکستان ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو اپنے یہاں نہیں رکھ سکے گا۔

MashalBooks.org

تشدد کے خلاف جناح نے سخت نفرت کا اظہار کیا اور اس کی مذمت کی اس کے باوجود لیگ کی قیادت اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ ان کو یقین تھا کہ پاکستان ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پھیلانے اور یہ ثابت کرنے سے ہی بن سکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اسلام کو بھی استعمال کیا۔ اس بات کو اس ایک واقعے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو انہی دنوں رونما ہوا۔ ایک کانگریسی مسلمان لیڈر لیاقت علی خان کے انتخابی حلقے میں ایک چھوٹے سے مجمع سے مخاطب تھے اور یہ سمجھا رہے تھے کہ انہیں کانگریس کے امیدوار کو کیوں ووٹ دینا چاہیے اور لیاقت علی خان کو نہیں دینا چاہیے۔ ایک دیہاتی ماحول تھا اور وہاں کے مسلمان کسان بھی ہندو کسانوں ہی کی طرح غریب تھے۔ لیڈر نے یہ بتایا کہ اگر کانگریس جیت گئی تو زمینداری ختم کر دی جائے گی اور زمین کسانوں میں بانٹ دی جائے گی پھر وہ غریب نہیں رہیں گے۔ مجمع میں کچھ مسلم لیگ کے ہمدرد بھی تھے، ان میں سے ایک جو اپنی ناداری کے باعث نہایت پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھا، لپک کر سٹیج پر پہنچا اور نفرت سے مقرر کے منہ پر تھوک کر بولا ''دو روٹی کے لیے ہم ایمان نہیں بیچیں گے۔'' لہٰذا ایک عام مسلمان جو لیگ کی حمایت کر رہا تھا اس کے لیے افلاس میں رہنا بہتر تھا اور مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دینا گویا اپنا ایمان بیچ دینا تھا۔

سیاست دانوں کے درمیان اس شدید کشیدگی کے باوجود عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کاروباری لین دین اور سماجی تعلقات متاثر نہیں ہوئے تھے۔ افراد میں باہمی کشیدگی بھی بہت کم تھی۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ تعلقات خوشگوار تھے۔ میرے والد کے محرر منشی شیو چرن لال تھے۔ محرر ایک وکیل کا نائب ہوتا ہے۔ میرے والد یوپی کے ایک ایسے ضلع میں جو دہلی سے زیادہ دور نہ تھا، ضلعی سطح کے لیڈر تھے۔ ہمارے ضلع کے بعض دور افتادہ علاقوں میں جب ہندو مسلم فساد شروع ہوئے تو میرے والد نے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسلحہ فراہم کیا۔ ان میں خاص قسم کے ہتھیار شامل تھے اور اس زمین پر جہاں ہم رہتے تھے، بنائے گئے تھے۔ میرے والد کو ان کی مشکوک سرگرمیوں کی بناء پر 1946ء میں چھ مہینے کے لیے قید کر دیا گیا۔ ان کی نظر بندی کے عرصے میں منشی شیو چرن نے کاروبار سنبھال لیا۔ بعض ذرائع نے منشی کو متنبہ کیا کہ پولیس کا چھاپہ پڑنے والا

ہے۔ انہوں نے اسلحہ سازی کا سارا سامان اور جس قدر ہتھیار تیار ہوئے تھے، دو میل دور ایک نہر میں پھنکوا دیئے۔ جب پولیس کے سربراہ کوتوال نے جو ایک مسلمان تھا، ہمارے گھر پر چھاپہ مارا تو وہاں کچھ نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے آس پاس کے سارے کنویں چھان مارے لیکن وہاں کیا ملتا؟ بعد میں یہ قصہ مجھے کوتوال نے اس وقت سنایا جب میں علی گڑھ گیا تھا۔ کوتوال نے جو پٹھان تھا، کہاں مجھے یقین ہے کہ میری اطلاع بالکل صحیح تھی لیکن منشی مجھ سے زیادہ چالاک نکلا اور ہر کام اس ڈھنگ سے کیا کہ میں کچھ بھی نہیں نکال سکا۔ اصل جگہ کا پتہ جہاں سامان چھپایا گیا تھا، منشی شیو چرن نے مجھے بعد میں بتایا۔

دہلی میں فسادات کے بدترین زمانے میں میرے والد قید میں تھے اس وقت ان کے ایک ہندو جاٹ موکل نے احتیاط کے طور پر اپنے کچھ آدمی ہمارے مکان کی حفاظت کے لئے بھیج دیئے تھے جو شہر سے باہر تھا۔ دہلی سے قریب ہونے کے باوجود ہمارے شہر میں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا اگرچہ ہمارے والد کانگریس دشمن خیالات کی بنا پر خاصے معروف تھے۔ مذہبی رواداری اور مخالف مذہبی اور سیاسی نظریات کے باوجود ذاتی مراسم کو جو اہمیت حاصل تھی، اس کی یہ تنہا مثال نہیں۔ میرے والد کے بہترین دوست اور ہم پیشہ وکیل لالہ برج بہاری لال تھے۔ وہ ایک کانگریسی تھے۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے زمانے میں برج بہاری لال کو قید بھی کیا گیا تھا۔ ان کی قید کے زمانے میں میرے والد نے ان کے پیشہ وارانہ، نجی اور گھریلو معاملات کا خیال رکھا۔ 1947ء میں جب میرے والد قید میں تھے، لالہ بہاری لال کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کی بہن نے ٹھیک اس طرح ہمارا خیال رکھا جس طرح میرے والد نے ان کا خیال ان کی قید کے زمانے میں کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں مجسٹریٹ تھیں اور میری والدہ جو ایک پردہ دار خاتون تھیں، کچھ زیادہ نہیں کر سکتی تھیں۔

یہ اکیلی مثال نہیں ہے۔ یہ حال ہمارے پورے ضلع کا اور پورے صوبے کا تھا۔ یقیناً کچھ استثنائی صورتیں بھی ہوں گے۔ تاہم ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی مدد کی اور بدترین قسم کی مجنونانہ کیفیت میں جو سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی، ہندوؤں نے مسلمانوں کی مدد کی۔ حتیٰ کہ پنجاب میں مشرقی اور مغربی دونوں حصوں میں، بہار میں اور بنگال کے علاقہ نواکھلی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

MashalBooks.org

ایک اور طرح کی مذہبی رواداری یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے احساسات کا احترام کرتے تھے۔ میرے نانا ایک چھوٹے زمیندار اور کٹر وہابی تھے، وہ لوگ جو دوسرے مسلمان جونجد (سعودی عرب) کے عبدالوہاب کے مقلد ہیں، خود کو وہابی کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار ہولی کے موقع پر میرے نانا اپنے گھر کے صدر دروازے پر کھڑے ہو جاتے اور کسان ٹولیوں کی صورت میں ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔ ہندو ایک دوسرے پر رنگین پانی پھینکتے جس کی وہابی فرقے میں سخت ممانعت ہے۔ چنانچہ ہندو کاشت کار رنگین پانی میرے نانا پر نہیں پھینکتے تھے لیکن ہندوؤں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے وہ خود اپنا رومال میں بھگونے کے لیے انہیں دے دیتے۔ ہندو ایک دوسرے کے چہروں پر عبیر، سیندور وغیرہ ملتے۔ میرے نانا کے لیے تھوڑا سال لال سفوف ہوتا جو ان کی پیشانی پر مل دیا جاتا۔ ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کے احترام اور رواداری کی مثالیں سارے ہندوستان میں پائی جاتی تھیں۔

پنجاب کے ہندو مسلم فسادات نے جو انتہائی المناک تھے، انگریز کی جانب سے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے مرحلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ایک طرف مسلمانوں نے اور دوسری طرف سکھوں اور ہندوؤں نے مخالف مقاصد کے حصول کی خاطر فسادات کا آغاز کیا اور انہیں خوب ہوا دی۔ یقین کے طور پر معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کس نے کی اور آئندہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا لیکن ہر گروہ نے اس کا ذمہ دار دوسرے گروہ کو ٹھہرایا۔ البتہ صدیوں کے قائم کردہ اس رشتے کی شکست پر تاریخ ان دونوں کو ملزم قرار دے گی۔

پنجاب کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا اور اس کی زرعی زمینوں کا سب سے بڑا رقبہ مسلمانوں کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ جزوی طور پر سارا پنجاب اور اس کا مغربی حصہ تقریباً سارا مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ اس کے باوجود معیشت پر کم و بیش سکھوں اور ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اب یہ ہوا کہ پنجابی ہندوؤں اور سکھوں میں متوسط طبقے کی قیادت کو یہ گمان ہوا کہ وہ نہ ہوں تو پاکستان کی معیشت بیٹھ جائے گی۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے اندر معیشت کا بندوبست چلانے کی اہلیت نہیں تھی۔ ادھر مسلمانوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی معاشی بالادستی کے ہوتے ہوئے ملک کی سیاست پر ان کی موثر

گرفت نہیں ہو گی۔ علاوہ ازیں ہندو اور سکھ دونوں کو نوجوان مسلم لیگی قیادت کا ناپختگی، ناتجربہ کاری بلکہ تعصّبانہ قیادت پر کوئی بھروسہ نہ تھا۔ انہیں سر فضل حسین، سر سکندر حیات یہاں تک کہ سر خضر حیات جیسے قائدین پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے اور غالباً درست ہے کہ سر سکندر اگر زندہ ہوتے تو پنجاب تقسیم نہ ہوتا۔ وہ اپنے پیش رو سر فضل حسین اور اپنے بعد آنے والے سر خضر دونوں کی طرح ایک متحدہ اور مضبوط پنجاب کے زبردست حامی تھے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف فسادات پنڈی میں شروع ہوئے۔ اس وقت لوگوں کو کہ ایک نوجوان مسلم لیگی لیڈر نے جو فوج کا ایک ریٹائرڈ افسر اور علاقے کے ایک بڑے جاگیردار خاندان کا فرزند تھا، ''قوم کی محبت اور اسلامی فریضے'' پر مبنی اس کام کا آغاز کیا۔ مسلمان ان دنوں عام طور پر اسے ملک سے محبت کا کام سمجھتے تھے۔ اس کتاب کے سلسلے میں جب میں نے بریگیڈیئر نور احمد حسین سے ملاقات کی تو انہوں نے بتایا کہ محض اتفاق ان کی ملاقات اس لیڈر سے 1980ء کے عشرے میں ہو گئی تھی جو اس زمانے میں سال خوردہ سیاستدانوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ بریگیڈیئر نے انہیں ساتھ لیا اور ہائیڈ پارک سے جہاں ان کی مڈبھیڑ اتفاق سے ہو گئی تھی، اپنے فلیٹ میں لے گئے۔ بزرگ سیاستدان نے اپنے اس فعل سے نہ تو انکار کیا اور نہ افسوس کیا اور نہ انہیں ان فسادات پر کوئی ندامت تھی۔ بلکہ نور احمد حسین کو اس بال سے حیرت ہوئی کہ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے اس کا دفاع کیا اور بھلا کیوں نہ کرتے انہیں ان فسادات سے ذاتی طور پر بہت فائدہ پہنچا تھا۔

پاکستان تو ختم نہیں ہوا لیکن اسے جو قیمت انسانی مصائب، کشت وخون اور فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں تبادلہ آبادی کی بنا پر ادا کرنا پڑی، وہ بے حد وحساب تھی۔ لاکھوں افراد بے دردی سے قتل کر دیئے گئے، لاکھوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا، ہزاروں عورتیں اغوا کر لی گئیں اور ان کی بے حرمتی کی گئی اور یہ سارا کام قیادت کا تھا۔ اس سے پنجاب کے قائدین کی بے حسی اور سنگدلی کا اندازہ ہوتا ہے جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ اس سانحے سے گریز ممکن تھا۔ اگر بڑے پیمانے پر تبادلہ آبادی ضروری تھا تو اس پر بات چیت ہو سکتی تھی اگرچہ آبادیوں کا تبادلہ پھر بھی برا ہوتا۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ کی

MashalBooks.org

قیادت ذہنی پختگی سے محروم رہی غالباً دوسری تمام مصلحتوں پر یہ خودغرضانہ مفاد حاوی ہو گیا کہ اس طرح ہندوؤں اور سکھوں کی پیچھے چھوڑی ہوئی املاک ہاتھ آ رہی تھیں۔

انتقال اقتدار کا مرحلہ جوں جوں قریب آ رہا تھا، مسلم اقلیتی آبادی کے صوبوں میں خاص طور پر یوپی میں متوسط طبقے کی مسلم قیادت شدید مایوسی بلکہ بے حسی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ برطانوی لیبر گورنمنٹ کابینہ نے تین سینئر وزراء کا ایک مشن ہندوستان بھیجا۔ ان میں لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی لیگزینڈر شامل تھے۔ مشن 23 مارچ 1946ء کو ہندوستان پہنچا۔ پہلے تو اس نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو کسی متفقہ فیصلے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ بدقسمتی سے کانگریس کی قیادت بھی دور اندیش عناصر سے اسی طرح محروم تھی جیسے مسلم لیگ ماہر سیاست دانوں سے، ان کانگریسیوں میں آزاد مستثنیٰ تھے۔ آزاد کو معلوم تھا اور وہ یہ تسلیم کرنے یا اقرار کرنے پر بھی تیار تھے کہ ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان میں ان (مسلمانوں) کا اندیشہ اپنی زندگی کے بارے میں خالصتاً درست [9] ہے لیکن کابینہ مشن ان سے بھی زیادہ حقیقت پسند تھا۔ انہوں نے لکھا کہ ''مسلمانوں کے اس حقیقی اور گہرے اندیشے سے ہم بہت متاثر ہوئے کہ مسلمان کہیں مستقل طور پر ہندو اکثریتی حکومت کے تابع ہو کر نہ رہ جائیں۔ مسلمانوں میں یہ اندیشہ اتنا شدید تھا کہ اس کا ازالہ کاغذی یقین دہانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔'' [10] کابینہ مشن ہندوستانی قیادت کو یہ سمجھانے میں ناکام ہو گیا کہ وہ ایک خطرناک راستے پر جا رہے ہیں اور یہ کہ اگر انہوں نے کسی فیصلے پر اتفاق نہ کیا تو اس کا انجام قومی تباہی ہو گا۔

انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کی جلدی تھی اس سے قطع نظر کہ مسلم لیگیوں اور کانگریسیوں دونوں کی طرف سے اس بدگمانی کا اشارہ مل رہا تھا کہ انگریز کی طرف داری کر رہا ہے اور اسکے ارادے مشکوک ہیں۔ خود انگریزوں کو اس کی بالکل کوئی پرواہ نہ تھی کہ ہندوستان تقسیم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا کیونکہ انہیں اپنے ملک میں اور بھی حل طلب مسائل درپیش تھے لیکن ہندوستان اگر متحد رہتا تو یہ بات ان کے تجارتی اور اقتصادی مفادات کے لئے سازگار ہوتی۔ ہندوستان کی سیاسی قیادت کے بارے میں برطانیہ کی لیبر پارٹی کا کیا خیال تھا، اس کی ایک شہادت موجود ہے۔ بمبئی کے ایک مسلمان نوجوان جو کانگریس کے حامی تھے، وہ بطور صحافی ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔ ان کا نام رفیق زکریا ہے۔ کابینہ مشن

کے ایک رکن اے وی الیگزینڈر کے ساتھ ان کے ایک انٹرویو کی جھلکیاں ان کی کتاب میں ملتی ہیں۔ زکریا کا کہنا ہے کہ ان کے انگریز دوستوں کے بقول الیگزینڈر سے ملاقات کا ارادہ کیا اور روزنامہ آبزرو سے وابستگی کی بناء پر مجھے ملاقات کا وقت کسی دشواری کے بغیر مل گیا۔ (11)

میں نے ان سے دوٹوک انداز میں پوچھا کہ ''تقسیم کیا ناگزیر ہوگئی تھی؟'' انہوں نے صاف طور پر کہا کہ ''حالات اس وقت تک اسی سمت میں لے جا رہے تھے لیکن صورتحال مختلف رخ اختیار کرسکتی تھی۔'' انہوں نے کہا کہ ''گاندھی اپنے اصولوں میں بہت سخت تھے لیکن بسا اوقات تفصیلات میں الجھ جاتے تھے۔ نہرو بڑی تیزی سے اپنا موقف بدلتے رہتے تھے۔ پٹیل مذاکرات سے بہت تھک چکے تھے، آزاد کسی شمار میں نہیں تھے اور جہاں تک جناح کا تعلق ہے، وہ سب سے زیادہ زیرک تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا کھیل کھیلتے تھے، اس عزم کے ساتھ کہ جیت کے رہیں گے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ بہت بڑے مطالبے کرتے تھے اور اس تقاضے کے ساتھ کہ ان پر کوئی بات چیت نہیں ہوگی پھر وہ انتظار کرتے تھے کہ مخالف فریق کون سی چال چلتا ہے۔ اس عمل کے دوران وہ اکثر اوقات بہت کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ ان کی چال کامیاب ہوتی تھی۔'' الیگزینڈر یہ نہیں بتا سکے کہ تاش کے اس کھیل کا آخری نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ میرے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور میں واپس آ گیا۔ یہ بڑا المیہ تھا کہ کروڑوں انسانوں کی تقدیر کا انحصار ان لیڈروں پر تھا جو زمانہ حال میں اس طرح پھنس گئے تھے کہ ان پر مستقبل کی راہ گم ہو چکی تھی۔ (21)

زکریا نے اس انٹرویو کے بارے میں ایک صحافی دوست پیٹر اسٹراس برگ سے بات کی جو لیبر پارٹی کے ترجمان اخبار ہیرالڈ سے منسلک تھے۔ وہ ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں پر پہلے لندن سے اور بعد میں دہلی سے رپورٹ لکھتے رہے تھے۔ 1946ء کے پہلے چھ مہینوں کے دوران ان کا دہلی آنا جانا تھا۔

''میں ان کے تبصروں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ (وہ طنزیہ اور اکثر مزاح کے ساتھ چٹپٹے تبصرے ہوتے تھے) وہ ہمیشہ بڑی وضاحت سے اور پورے یقین کے ساتھ بات کرتے تھے۔ میں نے انہیں قائل کر لیا کہ منقسم ہندوستان نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہوگا بلکہ برطانیہ کے وسیع تر مفادات کے بھی منافی ہوگا۔ دہلی

سے واپسی پر انہوں نے بتایا کہ ہندوستان کی قیادت کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی قیادت کوئی مشکل فیصلہ کرنے کی اہل نہیں اور برطانیہ نے اس راہ پر چلنے کا ارادہ کر لیا ہے جس پر مزاحمت کم سے کم ہو۔ حالانکہ انہوں نے ہندوستان پر اتنے طویل عرصے تک حکومت کی لیکن اب وہ اسے جلد سے جلد چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ (13)

سٹراس برگ نے جن ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں ان میں نہرہ پہلے لیڈر تھے۔ نہرو کی شخصیت دلآویز تھی لیکن ہندوستان کے اس عظیم ترین سیاست دان کی سیاسی اہلیت کا اندازہ کچھ خوش کن نہیں تھا۔ ان کے خیال میں نہرو ایک کمزور استاد ہیں حالانکہ انہوں نے سٹراس برگ کو یقین دلا دیا تھا کہ کانگریس مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گی لیکن سٹراس برگ نے مجھے بتایا کہ نہرو یقیناً لیگ کا دباؤ پڑنے پر جھک جائیں گے۔ برطانیہ غیر جانب دار تھا، جناح کے بارے میں انہوں نے کہا کہ جناح ''مذہبی جنونی'' نہیں۔ انہوں نے مذہبی عصبیت کو استعمال کیا۔ ان کے خیال میں جناح اچھے مقرر نہیں تھے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ماننے والوں میں جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جناح کو جمہوریت پسند سے زیادہ ایک آمر سمجھتے تھے۔ سٹراس برگ نے ان سے کئی بار ملاقاتیں کی تھیں اور عام لوگوں میں ان کی کارکردگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنا تاثر بیان کیا کہ جب ان کے سر پھرے شیدائی قائداعظم کا نعرہ بلند کرتے تھے تو اس شخص کی انا کس طرح آسمان کی بلندی تک پہنچ جاتی تھی۔ اسٹراس برگ کو یہ منظر دیکھ کر نازی یاد آ جاتے تھے جو ''ہیل ہٹلر'' کا اس طرح نعرہ لگاتے تھے۔ اسٹراس برگ نے بتایا کہ جناح کا ایک باڈی گارڈ تھا جو سبز یونیفارم پہنتا اور تلوار اٹھائے رکھتا تھا، ساتھ ایک دستہ موٹر سائیکل سواروں کا ہوتا تھا۔ وہ بھی سبز لباس میں ہوتے تھے اور ان کے لیے مشہور تھا کہ پورے ملک میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ یہ ایک ناقابل یقین کارنامہ تھا کہ اخبارات کے بغیر اور روپے پیسے کی کمی کے باوجود صرف چند اچھے نائبین کو لے کر وہ اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ ایک ملک ان کی گرفت میں آنے والا تھا۔ اسٹراس برگ جناح کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جناح ایک پختہ ارادے کا مالک لیڈر ہے جو جدوجہد کے بغیر اور اپنی پتلون کی کریز خراب کیے بغیر اور اپنی عینک اتارے بغیر ''اپنے عوام'' کو ''ان کی موعودہ پاک سرزمین'' تک لے جائے گا۔ (14)

آخر کابینہ مشن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ اپنا منصوبہ یعنی 16 مئی 1946ء کا اعلان جو بعد میں کابینہ مشن پلان کے نام مشہور ہوا، پیش کرے۔ کابینہ مشن نے صرف تین محکموں کو مرکز کی ماتحتی میں دینے کی سفارش کی۔ دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات یہ وہی محکمے تھے جن کی تجویز آزاد نے مشن کے ارکان سے ملاقات میں پیش کی تھی۔ مشن نے ہندوستان کو اے، بی اور سی تین منطقوں میں تقسیم کیا تھا منطقہ بی میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان شامل تھے۔ منطقہ سی میں بنگال اور آسام شامل تھے اور یہ دونوں منطقے ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریتی علاقے تھے۔ منطقہ اے ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ یہ بات لیگ اور کانگریس دونوں کے لیے قابلِ قبول ہونی چاہیے تھی۔ مسلمان اقلیت کے اندیشے دور کرنے کے لیے یہ تجویز مناسب تھی اور اس سے ہندوستان کی وحدت بھی برقرار رہتی۔ اس میں جناح اور آزاد دونوں کا نقطہ نظر موجود تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے یہ بہترین حل تھا۔ ہندوؤں اور گاندھی کے لیے اس بنا پر کہ ملک کے حصے بخرے نہیں ہو رہے تھے اور یہ غیر منقسم ہندوستان تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ پاکستان تھا۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کے مطالبے میں غیر منقسم پنجاب اور غیر منقسم بنگال شامل تھے جن میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد چالیس فیصد ہوتی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کم ہو کر بیس فیصد رہ جاتی۔ راج موہن گاندھی کا یہ کہنا ہے کہ اس مرحلے میں مشن نے وہ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس نے کانگریس سے یہ نہیں کہا کہ لیگ کو یونین (متحدہ ہندوستان) پر آمادہ کرنے کے لیے اسے زیادہ بڑا علاقہ دینا پڑے گا یا لیگ سے یہ نہیں کہا کہ اگر اسے زیادہ بڑا علاقہ چاہیے تو اسے یونین تقسیم کرنا پڑے گی۔ علاقے سے دستبرداری کی قربانی، اقتدار کی قربانی کے مساوی ہونی چاہیے۔ یہ کہنے کی بجائے مشن نے اپنے موقف کی صفائی اور ثبات دونوں قربان کر دیئے۔

دی وائسرائے جرنل مطبوعہ 25 جون 1946ء کے مطابق کہ ان دنوں لارڈ ویول وائسرائے تھے اور پنڈرل مون جرنل کے مدیر تھے اور پرچہ لندن سے شائع ہوتا تھا۔ ''میرے خیال میں یہ بدترین دن ہے۔ کانگریس نے 16 مئی کے اعلان کو اس کی صراحت کے باب میں تحفظات کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے۔ شائستگی تو کانگریس کے طور طریقوں میں کبھی شامل نہ

تھی۔ اس نے ویول کو جناح کے سلسلے میں بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ چنانچہ 25 جون 1946ء کو کانگریس نے سیروائی کے مطابق کابینہ مشن کے منصوبے کو ان تحفظات کے ساتھ، جو مشن کے علانیہ مقاصد کے منافی تھیں اور گروپنگ کی دفعات کی وضاحت سے متعلق تھیں، مان لیا۔

جناح کے باوقار رویے کا تذکرہ سیروائی نے ان الفاظ میں کیا۔ ''پلان کی منظوری کے سلسلے میں مسلم لیگ نے ایک تاریخی کام کیا جس کا بالعموم تذکرہ نہیں ہوتا۔ جناح نے پلن پر ایک ناقدانہ بیان 22 مئی کو جاری کیا لیکن انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی طرف سے جو 24 مئی کو ہونے والا تھا، کسی فیصلے کا دروازہ پہلے سے بند نہیں کیا۔ کابینہ مشن کے دوران قیام میں کرپس کے سیکرٹری میجر وڈرووائٹ ایم پی نے جناح سے ملاقات کی۔ (16) وائٹ نے جناح سے کہا کیا یہ امکان ہے کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ ایک قرارداد درج ذیل خطوط پر منظور کرے۔

''پاکستان کی حیثیت کے سلسلے میں برطانیہ نے اپنے بیان میں مقررہ حد سے تجاوز کیا ہے۔ ان کو ہرگز یہ اختیار نہ تھا کہ کروڑوں لوگوں کے مطالبے کو رد کر دیتے۔ پاکستان کے بارے میں ان کا اندازہ نہایت نامناسب ہے لیکن مسلمانوں نے تو کبھی یقین نہیں کیا کہ انہیں کوئی پاکستان ازخود دے دے گا۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ اپنے قوتِ بازو سے پاکستان حاصل کریں گے۔ کابینہ مشن کے بیان میں جس سکیم کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ ناقابلِ عمل ہے اور چل نہیں سکے گی۔ اگرچہ کانگریس کے لیڈر ہر طریقے سے اسے ناکام بنانے کی کوشش کریں گے پھر بھی مسلم لیگ آزمائش کی خاطر اس بیان کو پاکستان کی راہ میں پہلا قدم مانتے ہوئے قبول کر لیتی ہے۔'' جناح اس تجویز پر بھڑک اٹھے اور بولے بس آپ نے میرا مطلب پا لیا ہے، مجھے کامل یقین ہے کہ مسلم لیگ یہی کرے گی۔ (17)

آزاد نے اپنی خودنوشت میں درج ذیل عبارت لکھی:

''مسلم لیگ کونسل کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے تین دن تک اپنا اجلاس کرتی رہی۔ آخری روز مسٹر جناح کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ کابینہ مشن نے اقلیتوں کے مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے، اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور حل نہیں ہوسکتا۔ بہرطور وہ اس سے بہتر شرائط حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ جناح نے کونسل سے کہا کہ کابینہ مشن نے جو سکیم پیش کی ہے، اس

MashalBooks.org

سے زیادہ کچھ حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ اس منصوبے کو تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ اس کے حق میں ایک متفقہ قرارداد منظور ہو گئی۔

لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے جناح نے صاف طور پر کہا تھا کہ کابینہ مشن کی تجویز کو مان لیا جائے کیونکہ اس سے بہتر کچھ حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیگ میں ان کے سیاسی حریفوں نے ان پر نکتہ چینی شروع کر دی اور کہا کہ وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہو گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے خیال کو ترک کر دیا ہے۔ انہوں نے طعنے دیئے اور کہا کہ لیگ اگر کابینہ مشن کے منصوبے کو ماننے پر تیار ہو گئی جس میں مسلمانوں کی ایک الگ ریاست کے حق سے انکار کیا گیا ہے تو مسٹر جناح کو آزاد اسلامی ریاست کی خاطر اتنا شور شرابہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح مسٹر جناح کابینہ مشن کے ساتھ مذاکرات کے نتائج سے بالکل خوش نہیں تھے۔''(18)

آزاد کے اس خیال کی توثیق دوسرے مصدقہ ذرائع اور اس زمانے کے اخبارات سے ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آزاد نے کہا کہ ایسے اندوہناک واقعات رونما ہوئے جنھوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ جواہر لال نہرو نے 10 جولائی کو بمبئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور ایک حیران کن بیان جاری کر دیا۔ چند اخباری نمائندوں نے سوال کیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قرارداد کی منظوری سے کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ کانگریس نے کابینہ پلان کو کلیتاً مان لیا ہے جس میں عبوری حکومت کی تشکیل بھی شامل ہے؟ اس کے جواب میں جواہر لال نہرو نے کہا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں آزادانہ طور پر جائے گی۔ تمام سمجھوتوں سے آزاد اور ہر طرح کی صورتحال سے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ اخباری نمائندوں نے پھر سوال کیا کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ کابینہ مشن پلان میں ترمیم کی جائے گی؟ جواہر لال نہرو نے شدو مد سے کہا کہ کانگریس نے آئین ساز اسمبلی میں صرف شرکت کا اقرار کیا ہے اور اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتی ہے کہ کابینہ پلان کو بدل دے یا اس میں ترمیم کرے یا اپنی صوابدید کے مطابق جو بات بہترین معلوم ہو، وہی کرے۔

کانگریس کے پاس آزاد کی سی بصیرت نہیں تھی اس پر مضبوط مرکز کے بارے میں نہرو کی بے بصیرتی کا جنون سوار تھا۔ نہرو نے مشن کے ساتھ اور آزاد کے ہمراہ

MashalBooks.org

وائسرائے کے ساتھ ملاقات میں جو کچھ کہا، وہ سیروائی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ ''کانگریس ایک مضبوط مرکز کے قیام پر کام کرے گی اور گروہ بندی کے نظام کو ختم کرے گی اور وہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ملک میں مسٹر جناح کی کوئی حقیقی جگہ بھی ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں آئین سازی کیا ادارے میں ایک قطعاً مختلف نظریوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ چنانچہ عبوری حکومت میں ان کے درمیان اختلافات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ [19] اس سے کانگریس کی منافقت صاف کھل کر سامنے آئے گی۔ نہرو نہ تو مفاہمت کے قائل تھے نہ سیاسی سمجھوتے کو مانتے تھے اور نہ اپنے وعدوں اور معاہدوں پر یقین رکھتے تھے۔''

فطری بات ہے کہ جناح پر بہت سے لیگی لیڈروں کی طرف سے دباؤ تھا، آزاد کے بقول

''جواہر لال کا بیان ان (جناح) پر بم کی طرح گرا۔ انہوں (جناح) نے فوراً بیان جاری کیا کہ کانگریس کے صدر کے اس اعلان کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ پوری صورتحال پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کے مطابق انہوں نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ لیگ کونسل کا اجلاس بلائیں اور اس مفہوم کا بیان جاری کر دیا۔'' مسلم لیگ کونسل نے دہلی میں کابینہ مشن پلان تسلیم کر لیا تھا کیونکہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی یہ سکیم مان لی ہے اور یہ پلان ہندوستان کے آئندہ آئین کی بنیاد ہو گا۔ اب چونکہ کانگریس کے صدر نے اعلان کر دیا ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کی بنیاد پر کانگریس اس سکیم کو بدل سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اقلیتیں اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی، ان کے خیال میں جواہر لال کے بیان کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان رد کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس 27 جولائی کو بمبئی میں ہوا۔ مسٹر جناح نے اپنی تقریر کی ابتدا میں پاکستان کے مطالبے پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔ تین دن کی بحث و تمحیص کے بعد کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے کیبنٹ مشن پلان مسترد کر دیا۔ اس نے حصولِ پاکستان کے لیے راست اقدام کا بھی فیصلہ کیا۔ [20]

اس صورتحال کا اندوہناک پہلو یہ ہے کہ کانگریس کی اعلیٰ قیادت نے اور کابینہ مشن نے بھی حالات کو روبہ راہ لانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اب جواہر لال کانگریس کے

صدر تھے، آزاد صدر نہیں تھے۔ صرف وائسرائے ویول کو تشویش تھی اور کانگریس میں اکیلے آزاد تھے جنہیں یہ اندازہ تھا کہ یہ المیہ ہندوستان کے لیے نہایت درجہ اندوہناک ہو گا۔ اب جناح کے لیے کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے 16 اگست 1946ء کو راست اقدام کا اعلان کر دیا تا کہ اس روز لیگ کے ساتھ ہونے والی بے انصافی پر احتجاج کیا جائے۔

اس سے کہیں پہلے 27 جنوری 1946ء کو نہرو نے کرپس کے نام ایک خط میں لیگ کی قیادت کے متعلق لکھا تھا کہ وہ حددرجہ رجعت پرست (زیادہ تر جاگیردار) ہیں اور کسی بھی طرح کی سماجی تبدیلی کے مخالف ہیں اگر ایک بار ان کو صاف صاف بتا دیا جائے کہ انہیں تشدد سے کچھ نہیں ملے گا تو وہ چپ چاپ بیٹھ جائیں گے۔ جواہر لال نہرو اتنے کوتاہ اندیش تھے کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مسلم عوام کو جاگیردار نہیں بلکہ مسٹر جناح اپنے قبضے میں لے کر ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چنانچہ کانگریس کے نئے صدر نے راست اقدام کے اعلان کو خالی خولی دھمکی سمجھا۔ (21)

14 اگست 1946ء ایک یومِ سیاہ تھا صرف کلکتہ کے لیے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے۔ حالات نے وہ رخ اختیار کیا تھا کہ اب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی معاہدے اور مسئلہ کے پرامن حل کی توقع بے سود نظر آتی تھی۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ عظیم ترین المیہ تھا اور مجھے انتہائی رنج سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان حالات کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے اس اندوہناک بیان نے کہ کانگریس کیبنٹ پلان میں ترمیم کے لیے آزاد ہو گی، سیاسی اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کے سارے سوال کو پھر سے کھول دیا۔ ان کی اس غلطی کا مسٹر جناح نے پورا فائدہ اٹھایا اور لیگ نے کیبنٹ پلان کو پہلے جو منظور کیا تھا، اب اسے مسترد کر دیا اور اپنی منظوری واپس لے لی۔''

''جواہر لال میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں اور ہندوستان کی قومی زندگی میں انہوں نے جو کردار ادا کیا، وہ کسی سے کم نہیں اس کے باوجود مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا جو انہوں نے قومی مفاد کو اتنا شدید نقصان پہنچایا۔ تقریباً اتنی ہی بڑی غلطی اس وقت انہوں نے 1937ء میں کی تھی جب گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت پہلے انتخابات ہوئے تھے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو بمبئی اور یوپی کے سوا سارے ملک میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ بنگال میں صوبے کے گورنر نے تقریباً طے کر لیا تھا کہ لیگ کی حکومت بنائیں گے لیکن کرشک پرجا پارٹی کی کامیابی نے ان کے تخمینوں پر پانی پھیر دیا۔ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں میں یعنی پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں لیگ کو اس کے برابر کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بمبئی میں لیگ کو کئی نشستیں مل گئی تھیں لیکن اسے سب سے بڑی کامیابی یوپی میں نصیب ہوئی۔ خاص طور پر اس بنا پر کہ لیگ کو جمعیت العلمائے ہند کی مدد مل گئی تھی جمعیت نے مسلم لیگ کو مدد اس تاثر کی بنا پر دی تھی کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔

اس وقت یوپی میں مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں تھے۔ میں نے لکھنو پہنچ کر حکومت سازی کے بارے میں ان دونوں سے باتیں کیں۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف یہ کہ کانگریس سے تعاون کریں گے بلکہ کانگریس کے پروگرام میں ہر ممکن مدد دیں گے۔ وہ فطری طور پر امید کرتے تھے کہ نئی حکومت میں ان کا بھی کوئی حصہ ہوگا۔ صورتحال یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی پارٹی تنہا حکومت نہیں بنا سکے گی یا تو حکومت سازی میں دونوں شامل ہوں گے یا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں یہ امید کر رہا تھا کہ حکومت میں یہ دونوں شامل ہوں گے۔ اگر وزارت میں سات ارکان شامل ہوئے تو ان میں سے دو مسلم لیگی اور باقی سب کانگریس کے ہوں گے۔ نو ارکان کی کابینہ میں کانگریس کی اکثریت پھر بھی نمایاں تھی۔ میرے ساتھ گفتگو کے بعد اس مضمون کی ایک عبارت تحریر کی گئی کہ مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرے گی اور کانگریس کے پروگرام کو تسلیم کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور خلیق الزماں دونوں نے اس دستاویز پر دستخط کیے اور میں لکھنو سے پٹنہ چلا گیا جہاں میری موجودگی بہار میں وزارت کی تشکیل کے لیے ضروری تھی۔

چند دنوں بعد میں الہ آباد واپس آیا اور یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ جواہر لال نہرو نے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ ان میں سے صرف ایک کو وزارت میں شامل کیا جائے گا۔ انہوں نے لکھا کہ اب یہ فیصلہ مسلم لیگ کرے گی کہ ان میں سے کسے وزارت میں شامل کیا جائے لیکن میں نے جو کچھ اب تک کہا

MashalBooks.org

ہے، اس کی روشنی میں دونوں میں سے کوئی بھی تنہا آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے جواہر لال کی پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔

یہ انتہائی افسوسناک صورتحال تھی۔ اگر مسلم لیگ کی پیشکش قبول کر لی جاتی تو لیگ عملاً کانگریس میں مدغم ہو چکی ہوتی۔ جواہر لال کے اس فعل سے مسلم لیگ کو یوپی میں ایک نئی زندگی مل گئی۔ ہندوستانی سیاست کے طلبہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ یوپی ہی تھا جہاں مسلم لیگ کی از سرنو تشکیل ہوئی۔ مسٹر جناح نے اس صورتحال سے پورا فائدہ اٹھایا اور آگے بڑھ کر کارروائی شروع کی جس کے نتیجے میں بالآخر پاکستان قائم ہوا۔ (22)

اس نقطہ نظر کی توثیق راج موہن گاندھی نے بھی کی اور مہاتما گاندھی کے سیکرٹری پیارے لال نے بھی کی۔ راج موہن کا بیان ہے کہ:

''پیارے لال نے لکھا ہے کہ 1937ء کی کانگریسی وزارتوں سے لیگ کو باہر رکھنا حکمتِ عملی کے لحاظ سے ایک بہت بڑی غلطی تھی اور یہ کانگریس ہائی کمان کا ایک ایسا فیصلہ تھا جو گاندھی کے مشورے کے صریحاً خلاف تھا۔ پنڈرل مون، جو انڈین سول سروس کے رکن تھے، بیان کرتے ہیں کہ 1937ء میں لیگ کے ساتھ تعاون میں کانگریس کی ناکامی پاکستان کے قیام کا بڑا سبب بن گئی اور فرینک موریس کہتے ہیں کہ کانگریس نے 1937ء میں لیگ کے ساتھ تعاون میں کانگریس کی ناکامی پاکستان کے قیام کا بڑا سبب بن گئی اور فرینک موریس کہتے ہیں کہ کانگریس نے 1937ء کے انتخابات کے بعد اگر مسلم لیگ کے ساتھ حکمتِ عملی سے کام لیا ہوتا تو ممکن تھا کہ پاکستان نہ بنتا۔ گاندھی نے دسمبر 1945ء میں ویول کے ساتھ اپنی گفتگو میں کچھ اس طرح کا اقرار کیا تھا۔ (23) وائسرائے کا بیان ہے ''میں نے کہا کہ فرقہ واریت کا اصل 39-1937 میں کانگریس کا طرزِ عمل تھا جس کی بنا پر مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگریس ان کے ساتھ انصاف نہیں کرے گی اس کی بدولت مسلم لیگ کا ابھار شروع ہوا اور پاکستان کا خیال پیدا ہوا۔

انہوں (گاندھی) نے ایک حد تک کانگریس کی وزارتوں کا دفاع کیا اور کہا کہ ان کے منصفانہ عمل کا گورنروں نے بھی اعتراف کیا تھا۔ میں نے کہا کہ حقائق خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن مسلمانوں پر اس کا جو نفسیاتی اثر ہوا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ تسلیم کیا کہ ان (جناح) کا اثر 1937ء تک یوپی میں بہت کم تھا۔ تاہم کانگریس نے ایک ایسے

MashalBooks.org

سمجھوتے کے امکان کو ضائع کر دیا جس سے یوپی میں علیحدگی کی بات ختم ہو جاتی۔ انہی حالات کے تحت یوپی میں مسلمانوں نے پاکستان کے لئے مہم شروع کی۔ محرک وہ لیڈر تھے جنہیں وزارت سے باہر رکھا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے جو اس بات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔'' (24)

آزاد کا بیان ہے کہ ''وہ نہرو کی انتہا درجے کی حماقت تھی۔'' 6 اگست ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا۔ اور یہ کہ کانگریس کی مجلسِ عاملہ سخت کوشش و پنج میں تھی۔ ایک جانب کانگریس کے صدر کا وقار خطرے میں تھا، دوسری طرف اس معاہدے کو خطرہ لاحق تھا جسے ہم نے بڑی کاوش سے حاصل کیا تھا۔ صدر کے بیان کو رد کر دینے سے ہماری تنظیم کمزور ہوتی لیکن کیبنٹ مشن پلان کو چھوڑنے سے ملک تباہ ہو رہا تھا۔

یہ تو کہانی کا ایک رخ تھا اس کا دوسرا رخ بھی آزاد کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہو۔ ''جواہر لعل نے یہ دلیل دی کہ مجلسِ عاملہ اگر اپنے اس بیان پر اصرار کرتی ہے کہ کانگریس نے کیبنٹ پلان کو تسلیم کر لیا تھا تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن یہ بات تنظیم کے لیے اور ان کے لیے بھی خفت کا موجب ہو گی اگر مجلسِ عاملہ اس مضمون کو قرارداد منظور کرے کہ کانگریس کے صدر کا بیان کانگریس کی پالیسی کی ترجمانی نہیں کرتا۔''

آزاد نے اپنی خودنوشت میں جو کچھ لکھا ہے اور جیسا کہ انہوں نے مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں کہا، بیشتر ارکان نے ان سے اتفاق کیا اور نہرو کی تائید کرنے والے چند ہی تھے۔ یہی تھا وہ مرحلہ جہاں ہند مغل معاشرے کی بیمار تہذیب نے ہندوستان کے عوام اور ہندوستان کے مستقبل کی تاریخ کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ آزاد اور مجلسِ عاملہ کے نزدیک ''کانگریس کے صدر کا وقار اور تنظیم کا استحکام'' زیادہ عزیز تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ کیبنٹ مشن پلان کو ترک کر دینے سے ملک تباہ ہو جائے گا اس کے باوجود کہ آزاد مستقبل پر گہری نظر رکھتے تھے، وہ ہندوستانی تہذیب کی اس کمزوری پر قابو پا نہ سکے کہ ایک دوست کا دفاع ہر قیمت پر کرنا ہو گا جبکہ اس وقت ''ملک کی تباہی'' اس کی قیمت تھی۔

پھر اس کے بعد کلکتہ میں کیا ہوا؟ 16 اگست کو خون خرابہ شروع ہو گیا، دونوں طرف سے ہزاروں آدمی ہو گئے، ہندو اور مسلمان دونوں۔ کانگریس کی سفاکی اور ہوسِ اقتدار اس بات سے واضح تھی کہ انہوں نے 24 اگست 1946ء کو حکومت بنا لی۔ سیروائی

MashalBooks.org

نے لکھا ہے کہ:

''بہرحال مسلم لیگ کی قراردادوں نے اور کلکتے میں بلوے اور خونریزی کے واقعات نے نہایت سنگین صورتحال پیدا کر دی۔ 24 اگست کو عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان ہوتے ہی لارڈ ویول اپنی نشری تقریر کے بعد کلکتہ چلے گئے تا کہ ان لرزہ خیز واقعات کی تفصیل بذاتِ خود معلوم کریں جن میں پانچ ہزار ہلاک اور پندرہ ہزار زخمی ہوئے تھے اور بے گھر ہونے والوں کی تعداد کوئی دس لاکھ تھی۔ مینن نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی'' (Transfer and Power of India) میں لکھا ہے کہ انہوں (ویول) نے دیکھا اور انہیں کامل یقین ہو گیا کہ کوئی سمجھوتہ اگر فوری طور پر نہ ہوا تو کلکتہ میں جو کچھ ہوا، ایسے ہی واقعات سارے ہندوستان میں کم وبیش اسی شدت سے ہوں گے۔

وہ کوئی ہندوستانی لیڈر نہیں بلکہ ایک انگریز وائسرائے تھا جس نے صورتِ حالات کی سنگینی کو محسوس کیا۔ ویول کانگریس کی منافقت کی حمایت نہیں کر رہا تھا۔ 16 اگست کو مسلم لیگ کا راست اقدام ہندوؤں کے ردعمل اور کلکتہ کے قتلِ عام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس کے بعد عام خونریزی کے ایسے واقعات ہوئے اور ہندو مسلم فسادات بہار، بنگال میں نواکھلی اور چند دوسری جگہوں پر شروع ہو گئے۔ ان میں بدترین فساد پنجاب میں ہوا۔ نہرو کی بے بصیرتی اور حماقت نے ہندوستان کے ٹکڑے ہونے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی یعنی وہ جو چاہتے تھے اس کے بالکل برعکس ہوا۔ آزاد اور کانگریس کی باقی ماندہ قیادت نے نہرو کی طرف داری کی۔ جواہر لال نہرو اتنے بڑے لیڈر نہیں تھے جتنا بڑا ان کے پیروکار انہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان میں اتنی بھی سیاسی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ انتہائی سنگین نتائج کا اندازہ کرتے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے مسلم لیگ کو حکومت سے دور رکھا ہے اور نام نہاد قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ مل کر اسے چلا رہے ہیں۔ حالانکہ مسلم عوام نے ان قوم پرست لیڈروں کے بارے میں اپنی منفی رائے دی تھی۔ ہندوستان کے اس سیاسی منظر نامے میں ویول تنہا شخص تھے جنہیں مسلم لیگ کی حکومت سے دور رکھنے کے خطرات کا پوری طرح اندازہ تھا۔ دوسری طرف جناح کو بھی اس کا رنج تھا اور درست تھا لیکن ان کے بے جا غرور نے یہ اجازت نہ دی کہ صورتحال کی سنگینی کو محسوس کرتے۔ ویول نے انتہائی چابک دستی اور اپنی اہلیت سے کام لیتے ہوئے ایک طرف جواہر لال نہرو کی انانیت کی

MashalBooks.org

تسکین کی اور دوسری طرف جناح غرور کی تشفی کی اور لیگ کو ہندوستانی حکومت کی کابینہ میں لے آئے۔ جواہر لال نے ایک قوم پرست مسلمان کو کابینہ میں شامل کیا تھا۔ اس کے جواب میں جناح لیگ کی طرف سے ایک نچلی ذات کے ہندو کو کابینہ میں لے آئے۔

ہوش مندی، نہ تو کانگریس کو راس آتی تھی اور نہ مسلم لیگ کو۔ پورے حالات کا جائزہ لیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ کو بھی ہوش مندی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ دسمبر 1946ء میں ویول کی جگہ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو لایا گیا۔ وہ برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک فرد اور منچلے طرحدار آدمی تھے جن کا کوئی انتظامی تجربہ نہ تھا اور درحقیقت ان میں کوئی سیاسی فہم اور تدبر بھی نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اتنی ناپسندیدہ عجلت میں ہوا کہ خود ویول کو بھی کہنا پڑا ''میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہندوستان میں ہز میجسٹی کے نمائندے کی اس طرح بیک قلم برطرفی اس عہدے کے وقار کے مطابق نہیں۔[25] اب اقتدار کی پرامن منتقلی دوراز کار ہوگئی۔ خود ہندوستانی کابینہ میں تفرقہ تھا اور ارکان بٹے ہوئے تھے۔ کانگریس کے لیڈروں کی اپنے لیگی رفقاء کے ساتھ بول چال بھی نہیں تھی۔

برطانوی حکومت نے زیادہ سے زیادہ جون 1948ء تک انتقالِ اقتدار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خواہ کوئی بھی اسے قبول کرنے پر تیار ہو۔ برطانوی حکومت اسے موزوں خیال کرتی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن شرمناک عجلت سے کام لیتے ہوئے اس تاریخ کو پندرہ اگست 1947ء پر لے آئے۔ ایسا انہوں نے ارادتاً کیا کہ ہندوستانیوں پر کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے دباؤ ڈالا جائے۔ لیکن حقیقتاً ان کے موقف میں اور زیادہ سختی پیدا ہوگئی۔ بدقسمتی سے لیگ کی قیادت میں دور اندیشی کا فقدان تھا اور ان ہولناک امکانات سے بالکل بے خبر تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش تھے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ انگریز اس قتلِ عام کو روکنے کے لیے جس میں مسلمان تباہ ہوں گے، یہاں نہیں ٹھہرے گا۔ لیڈروں کی چرب زبانی اور لفاظی برقرار رہی جو اپنے مخالفوں کو خوفناک سبق سکھانے کی بات کر رہے تھے۔ لیگ کے حمایتی پیر اور مولوی محمود غزنوی اورنگ زیب کی شجاعت یاد دلا کر مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو مزید بھڑکا رہے تھے۔ اس کے جواب میں ہندو جنونیوں کی دھمکی تھی کہ ''مسلمانوں کو بحیرہ عرب میں ڈبو دیں گے۔''

کسی کو بھی یقیں نہیں تھا کہ انگریز واقعی جا رہا ہے۔ صرف ایم این رائے اس

MashalBooks.org

سے مستثنیٰ تھے۔ مسلمانوں کے صرف ایک گروہ کو یقین تھا کہ انگریز 15 اگست 1947ء کو ہندوستان سے جا رہا ہے اور وہ تھے مرکزی حکومت کے مسلمان ملازم۔ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں جہاں ان کے خیال میں مسلم ہندوستان قائم ہو جائے۔ حکومت ہند کی افسر شاہی میں نفسیاتی طور پر یہ حقیقت پیوست تھی کہ اگر مسلمانوں کا الگ کوٹہ مقرر نہیں ہوا تو ان کے کیریئر (ملازمت) پر برا اثر پڑے گا۔ اس بنا پر مسلمان اعلیٰ عہدیداروں نے خیال کیا کہ ہندوستان کو غیر منقسم نہیں رہنا چاہئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مقابلے میں ٹھہر سکیں گے۔ اس بات نے تقسیم کو ان کے کیریئر کا مسئلہ بنا دیا تھا اور ایک اعلیٰ افسر کا کیریئر پورے عوام کی تقدیر سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

یہی حالات تھے جن میں لیگ کابینہ میں داخل ہوئی۔ کانگریس کے لیڈروں نے اپنی تنگ نظری کی بناء پر ان تمام محکموں سے جنہیں وہ اہم سمجھتے تھے، مسلمانوں کو دور رکھا۔ ان میں کوئی فراست نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ محکمہ داخلہ پولیس کو کنٹرول کرتا ہے اور انتہائی اہم ہے۔ لہٰذا وہ اس کے ساتھ چپکے رہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان اپنی اس کمزوری کے لیے مشہور ہیں کہ اپنے گھریلو مصارف اور اراضی کا حساب کتاب نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ انہوں نے محکمہ مالیات مسلمانوں کو پیش کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان اس کا کباڑا کر دیں گے۔ مسلمانوں کو مالی معاملات میں اپنی کمزوری کا علم تھا لہٰذا انہوں نے یہ محکمے لینے سے انکار کر دیا۔ اس سے کانگریس کے موقف میں اور بھی سختی آ گئی۔

لیکن مرکزی حکومت کے سرکاری ملازم مسلم لیگ کی مدد کو آن پہنچے۔ انہوں نے لیگی قیادت کو یقین دلا دیا کہ اگر انہوں نے مالیات کا محکمہ لے لیا تو مسلمان عہدیدار کانگریسی وزیروں کی جانب عذاب ڈال دیں گے اور حکومت ہند کی گاڑی کو چلنے سے روک دیں گے اور کانگریس کو مجبور کر دیں گے کہ وہ تقسیم پر راضی ہو جائے۔

چودھری محمد علی نے اپنی کتاب ''ظہور پاکستان'' (Emergence of Pakistan) میں اس مسئلہ پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ تقسیم کے وقت وہ حکومتِ ہند کے مالی مشیر تھے۔ کانگریس کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ وزارتِ خزانہ کی اجازت کے بغیر جو محض برائے نام طور پر لیاقت علی خاں کے ماتحت تھی، ایک چپراسی بھی بھرتی نہیں کر سکتے۔ یہ وزارت

چودھری محمد علی اور دوسرے سلمان عہدیدار چلا رہے تھے جو زیادہ تر پنجاب کے تھے یا مسلم اقلیتی صوبوں کے اردو بولنے والوں میں سے تھے۔ کانگریس کے سردار پٹیل کو جو محکمہ داخلہ سے چپکے ہوئے تھے کیونکہ اسی طرح پولیس ان کے قبضے میں تھی، اب معلوم ہو گیا کہ وہ پولیس کا ایک کانٹیبل بھی بھرتی نہیں کر سکتے کیونکہ خزانہ تو لیاقت علی خاں کی جیب میں تھا۔ یقیناً وہ اس دن کو کوس رہے ہوں گے جس دن انہوں نے مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کے حوالے کیا ہو گا لیکن انہیں روزِ بد تو دیکھنا ابھی باقی تھا۔ لیاقت علی خاں نے مرکزی اسمبلی میں 48-1947 کا جو بجٹ پیش کیا اس میں ہندوستان کو ایک ہی رفاہی ریاست تسلیم کیا گیا جس میں صنعت اور تجارت پر بھاری ٹیکس لگایا گیا، صنعت و تجارت تو ہندوؤں اور سکھوں کے پاس تھی، نہ کہ مسلمانوں کے پاس۔ مسلمان اخباروں نے جو بس تھوڑے سے تھے، اسے ''قرآنی بجٹ'' کہا۔

حکومت ہند ہندوؤں کی صنعت اور تجارت جب چلتے چلتے رک گئی تو سبھی چیخ پڑے۔ ''ملک کو تقسیم کرو اور مسلمانوں سے جان چھڑاؤ'' اس عرصے میں ہندو جنونی اور مسلم لیگی پیر اور مولوی مذہبی منافرت کو ہوا دیتے اور اس کے نتیجے میں خونی فسادات کراتے رہے۔ اب کانگریس کے پاس تقسیم کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ..... تمہیں بنگال اور پنجاب دونوں کی تقسیم بھی تسلیم کرنا ہو گی۔

کانگریس کو معلوم تھا کہ اب ہر بات کا انحصار ماؤنٹ بیٹن پر ہے۔ چنانچہ وہ ماؤنٹ بیٹن کے قریب ہوتے گئے۔ جواہر لال نہرو ان کے قریبی دوست بن گئے۔ جناح کو جھکنا آتا ہی نہیں تھا، وہ سرکشیدہ رہتے۔ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ بھی ان کے تعلقات کشیدہ رہے۔ ماؤنٹ بیٹن کی زندگی اور کردار پر 1990ء کے شرے میں خاصا مفصل کام ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہیں دلچسپی صرف اپنے آپ سے تھی اور ان کی ساری کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ ان کا نام تاریخ میں رقم ہو اور یاد رکھا جائے۔ اس کے لیے ہندوستانیوں کی غارت گری اور قتلِ عام بہت معمولی بات تھی۔ عیار ماؤنٹ بیٹن نے 3 جون 1947ء کو ہندوستان کو تقسیم اور ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ جائز یا ناجائز طور پر بلکہ ناجائز طور پر بھی مسلم لیگ کے مقصد کو اتنا نقصان پہنچے کہ پھر اس کی تلافی نہ ہو سکے۔ جناح کے غرور بے جا اور ان کی انانیت کی سزا دینے

اور اس طرح مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر کے مسلم اکثریتی علاقے کو ہندوستان کے حوالے کرنے کی سازش کی۔ کشمیر کا ہندوستان سے کوئی جغرافیائی تعلق نہیں تھا۔ ہندوستان کو کشمیر میں راہ دینے کے لیے انہوں نے گورداس پور کے مسلم اکثریتی ضلع کو ہندوستان کے حوالے کر دیا۔

14 اگست 1947ء کو لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے ایک کٹے پھٹے پاکستان کا اقتدار کراچی میں قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے کیا جنہیں ہز میجسٹی شاہ جارج ششم ''محافظ ایمان'' نے گورنر جنرل مقرر کیا تھا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آزادی اور تقسیم کے اعلان سے پہلے زبردست ہلاکت اور غارت گری ہوئی لیکن جو بات عام طور پر معلوم نہیں بلکہ جسے چھپایا گیا ہے، وہ دیوتا مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی کی بے رحمی تھی۔ تصدیق کے لیے میں یہاں سیروائی کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ سیروائی گجراتی بولنے والے پارسی تھے۔ مہاراشٹر کی ایک ممتاز شخصیت تھے، ایک ماہر قانون دان اور ایڈووکیٹ جنرل تھے، وہ لکھتے ہیں ''جیسا کہ ویول نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے..... ''کچھ دیر تک بحث و تمحیص جاری رہی اور ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ایک موقع پر نہرو مشتعل ہو گئے اور کہا کہ یہ محض مسلم لیگ کی دھمکی ہے۔ گاندھی نے کہا کہ اگر خون کا اشنان ضروری ہے تو وہ تو ہو گا اور عدم تشدد کے باوجود ہو گا۔ میں نے کہا کہ ایسے الفاظ ان کی زبان سے سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا ہے۔ شیروائی نے اس کی توثیق پھر حاشیے کی عبارت میں کی ''پنڈرل مون کے بیان کے مطابق لارڈ ویول ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اس موقع پر گاندھی نے میز پر مکہ مار کے کہا ''اگر ہندوستان خون میں نہانا چاہتا ہے تو اسے خون میں نہانے دو۔''(24)

جب تمام معاملات پرامن طور پر طے ہو سکتے تھے تو کانگریس کے لیڈر خون میں غسل دینا کیوں چاہتے تھے؟ یہ بات حیران کن تھی کم از کم اس وقت تک کے لیے جب تک مجھے پٹیل کے خیالات کا علم نہیں تھا۔ سیروائی نے موسلے کی کتاب ''برطانوی راج کے آخری ایام'' (Last Days of the British Raj) سے ایک اقتباس پیش کیا ہے کہ 8 اگست 1947ء کو پٹیل نے کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہاں ان کی جڑیں ہیں، ان کے متبرک مقامات ہیں اور یہاں انکا مرکز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ پاکستان میں کیا کریں گے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ ہمارے پاس واپس آ

MashalBooks.org

جائیں گے۔ اب اس عبارت کو آزاد کے بیان سے ملا کر پڑھیے۔ آزاد نے کہا مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب پٹیل جناح سے بھی زیادہ دوقومی نظریے کے حامی تھے۔ جناح نے تقسیم کا پرچم لہرایا ہوگا لیکن اس کے اصل پرچم بردار اب پٹیل تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ پٹیل کے خیال میں پاکستان چلنے والا نہیں تھا، وہ دوسرے کانگریسی لیڈروں کی طرح اور ان میں آزاد یقیناً اور غالباً راج گوپال اچاریہ بھی شامل نہ تھے کہ پاکستان دھڑام سے بیٹھ جائے گا اور مسلمان دوبارہ اتحاد کے لیے ہندوستان سے آ ملیں گے۔ ذلت اٹھائے ہوئے مسکین مسلمان اس وقت وہ پٹیل اور انہی جیسے لیڈروں کے حسب منشا رویہ اور عمل اختیار کریں گے۔

قبل اس کے کہ میں اس زمانے کے واقعات اور شخصیات کا تجزیہ پیش کروں، میں دو بڑے کانگریسیوں کے پوتے اور نواسے راج موہن گاندھی کے بیان کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ ان کے باپ ایم کے گاندھی کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سی راج گوپال اچاریہ کی بیٹی تھیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ایم کے گاندھی ایک مہاتما ہونے کے علاوہ عملاً کانگریس کے آمر مطلق (ڈکٹیٹر) تھے۔ دھرم کے پیشوا اور سیاسی آمر بیک وقت دونوں حیثیتوں میں ان سے کسی کو اختلاف کی جرأت نہ تھی۔ کیبنٹ مشن کے دورے کے واقعات بیان کرتے ہوئے راج موہن گاندھی جناح کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''جب انہوں نے مشن سکیم کے حوالے سے پیٹرک لارنس اور کرپس پر کانگریس کے ساتھ گٹھ جوڑ کا الزام لگایا تو بالکل درست کہا تھا۔'' اپنے دادا کے مقابلے میں جناح کے موقف کو درست قرار دیتے وقت راج موہن گاندھی کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے۔ 1947ء کے بارے میں سوچتے ہوئے ہم اسے برطانوی راج سے آزادی کا سال قرار دیتے ہیں لیکن مستقبل ہمیں اس نظر سے نہیں دیکھے گا۔ میں اگر بہت بڑی غلطی نہیں کر رہا ہوں تو درحقیقت ہمارے بعد آنے والی نسلیں اقتدار کی منتقلی کو اس بربریت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں دیں گی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ سب نے اس سال اپنے آپ کو جھونک دیا تھا۔ یہ ہمارے لیے ایک شرمناک سال تھا کسی کارنامے کا سال نہیں تھا۔ شمال اور مشرق میں جہاں جہاں ابھی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی، سب ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ انہیں ہلاک کر دیں، اپاہج بنا دیں، ان کی عصمتیں پامال کر دیں، اغوا کر لیں، جلا

لیں، لوٹ لیں اور بے دخل کر دیں۔''

راج موہن گاندھی اور سیروائی کے فیصلوں کے باوصف کہ انجام کار آخری تجزیے میں ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار کون تھا.....پٹیل کی چالبازی، جواہر لال کی ہٹ دھرمی اور ضد اور ان کا سمجھوتے پر قائم رہنے سے انکار یا ان کی سیاسی خام کاری یا جناح کا برابر بازی پر بازی لگاتے جانا جبکہ ان کے ہاتھ میں پتے بھی نہیں تھے اس کے ذمہ دار تھے۔ مسلمانوں کو جو کچھ ملا، اس سے زیادہ دینا پڑا۔

اس سے ہمارے سامنے 1990ء کے عشرے میں ہونے والی گرما گرم بحث آ جاتی ہے کہ دوقومی نظریہ وضع کرنے سے جناح کا اصل مقصد کیا تھا۔ کیا پاکستان کا قیام تھا یا وہ اس نعرے کو مسلمانوں کے لیے زیادہ حقوق حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے؟ اس کے ثبوت میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے، ان میں سے تین نمائندہ کتابیں ہیں ایک تو سعد آرخیزی کی کتاب ہے، Jinnah Reintepreted (مطبوعہ اویوپی کراچی) دوسری زاہد حسین کی ''Rationale of Pakistan'' اور ''Demography and Partition of India'' (مطبوعہ رائل بک کمپنی کراچی) ہیں۔ جناح پاکستان چاہتے تھے اور وہ انہوں نے حاصل کر لیا۔ اس بات کے ثبوت میں زمینی حقائق موجود ہیں۔ ہندوستان کو وسط اگست 1947ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ تاہم آئندہ نسلیں اس حقیقت کو نظر انداز کر سکیں گی کہ دوقومی نظریہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ آزادی کے بعد ہی مسلمان ہندوستانی مسلم قوم اور پاکستانی مسلم قوم کے درمیان تقسیم ہو گئے۔ 17 دسمبر 1971ء کو ایک مربوط پاکستانی قوم تھی پھر وہ بنگالی مسلم قوم اور پاکستانی مسلم قوم میں بٹ گئی۔

اقلیتی صوبوں کے ہندوستانی مسلمانوں نے خاص طور پر پنجاب کے مشرقی اور بالخصوص نصف اقلیتی صوبے کے مسلمانوں نے آزادی کی بھاری قیمت ادا کی۔ جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے، وہ ایک مشکوک اور مفادات سے محروم اقلیت کے طور پر آزادی کی قیمت ادا کرتے رہے۔ مشرقی پنجاب کے باشندوں نے اس طرح قیمت ادا کی کہ قتلِ عام ہوا اور لاکھوں مسلمان بے خانماں ہو گئے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے قائدین جو مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی سربراہی کر

MashalBooks.org

رہے تھے، بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ہندوستانی مسلمان ایک اسلامی معاشرے کے لوگ ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ لیگ کی قیادت کے نزدیک مسلمان اکثریت کے صوبوں میں یعنی مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں وسیع پیمانے پر ایک ایسا معاشرہ موجود ہوگا جہاں اسلام کے اصولوں کی کارفرمائی ہوگی، جہاں سماجی برابری ہوگی، سماجی انصاف رواداری اور دوسروں کی رائے کے لئے احترام کی خوبیاں ہوں گی۔ یہ حقیقت عام ہے کہ دیہی پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے جاگیردارانہ اور قبائلی معاشروں میں انتہائی نابرابری پائی جاتی تھی۔ کسانوں اور عام قبائلیوں کے کوئی حقوق نہیں تھے، وہ کوئی املاک نہیں رکھ سکتے تھے، بڑے جاگیرداروں اور سرداروں کے اندر کوئی رواداری اور دوسروں کے حقوق یا ان کی آراء کے لیے کوئی احترام نہیں تھا۔ ایسا معاشرہ کسی طور پر بھی ایک اسلامی معاشرہ نہیں ہوسکتا۔ صرف پختونوں میں ایک اسلامی معاشرے کی کچھ شباہتیں تھیں۔ عام قبائلیوں اور کسانوں کو ایک اسلامی سماج کے نظام میں زندگی گزارتے ہوئے یقیناً خوشی ہوتی لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ جاگیردار ان کے طرزِ زندگی کو اسلامی سماج کے نظام میں بدل سکتے تھے لیکن ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ ان کے جاگیردارانہ مفاد کے خلاف ہوتا۔

جہاں تک سیاسی طاقت کا معاملہ تھا، صوبہ سرحد میں ایک خاصا بڑا تناسب ان لوگوں کا تھا جو سیاسی اور نظریاتی طور پر پاکستان کے مخالف تھے۔ پنجابی اور سندھی جاگیرداروں کا کوئی نظریہ نہیں تھا اور وہ عام لوگوں کی کمائی پر محض اپنے لیے زندہ تھے۔ وہ آزادی کی مخالفت کریں گے جو ان کے انفرادی اور طبقاتی مفادات کو نقصان پہنچائے گی۔ جہاں تک بلوچ قبائلی سرداروں کا معاملہ تھا، شمار میں صرف وہی آتے تھے اور باقی سب کچھ ان کے انفرادی مفاد کے تابع تھا اور اب ایک مضبوط اقلیت شہری پنجاب کی تھی اور وہ بھی نظریاتی طور پر پاکستان کی مخالف تھی۔ پاکستان کی حمایت کرنے والے ان شہری پنجابیوں کے سیاسی بنجرپن کے مقابلے میں ان کے یہاں سیاسی بیداری تھی۔

اوپر کی سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ بلاشبہ ایک سنگین حقیقت ہے لیکن زیادہ سنگین حقیقت یہ تھی کہ دیہی پنجاب، دیہی سندھ، قبائلی بلوچستان اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے میں ناخواندگی کی شرح تقریباً 95 فیصد تھی۔ شہری پنجاب میں کچھ خواندگی تھی

لیکن یہاں بھی ایک اعلیٰ اور باشعور تعلیم یافتہ طبقے کا فقدان تھا۔ جیسا کہ صوبہ سرحد میں تھا اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، شہری بلوچستان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

ایک حقیقت جو ابھر کر سامنے آئی ہے، یہ ہے کہ پاکستان ان ہندوستانی مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے ووٹوں سے وجود میں آیا جو محدود رائے دہی میں ووٹ ڈالنے کے مجاز تھے۔ یہ رائے شماری عام بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی۔ اس مطالعہ سے ایک اور حقیقت سامنے آئی کہ 1971ء کی خانہ جنگی کے بعد جو پاکستان بچا، اس کے ووٹوں کی تعداد ان علاقوں کے ووٹوں سے خاصی کم تھی جن کا پاکستان سے باہر رہنا مقدر ہوا۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد یہ تین صوبے جو 1971ء کے بعد پاکستان کے اندر رہ گئے، ان کے ووٹ قیامِ پاکستان کے لیے بہت زیادہ نہیں تھے اور 1945ء کی رائے شماری میں بلوچستان اس وقت تک صوبہ نہیں بنا تھا۔ ایک اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جاگیردار جو پنجاب اور سندھ پر دسترس رکھتے تھے۔ پاکستان کے لیے یا خود آزادی کے حق میں بھی پرجوش نہیں تھے۔ بالآخر انہوں نے پاکستان کی جدوجہد کے لیے اپنی نوجوان نسل کو آگے بڑھا دیا۔ وہ خود تو ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے لیکن ان کے لیڈروں نے پاکستان کے خلاف لڑائی کی۔

ایک سماج اپنے پیش روؤں سے ملنے والے مادی ورثے کی بدولت اقتصادی طور پر ترقی کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں کام کرنے کی لگن ہو، روشن فکر ہو، توانائی ہو اور اخلاقی اقدار ہو۔ اس سماج کی اخلاقی اور روحانی زندگی، ورثے میں ملنے والی روحانی، اخلاقی اور سماجی اقدار کے تابع ہوتی ہے۔ مادی اعتبار سے پاکستان کو برطانوی راج سے ایک ایسا ملک ملا جس کے پاس وافر غذائی اجناس اور دوسری زرعی پیداوار جیسے کپاس موجود تھیں، اس وافر زرعی پیداوار کو آئندہ برقرار رکھنے کے لئے اس کے پاس نہری آبپاشی کا ایک ایسا نظام موجود تھا جو ٹیکنالوجی کے لحاظ سے دنیا بھر میں جدید ترین اور رقبے میں سب سے بڑا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے مادی طور پر نہ صرف ایک دور تک پھیلا ہوا ریل اور سڑکوں کا نظام چھوڑا بلکہ ایسی ورکشاپ حوالے کی جو ان نہروں اور سڑکوں اور ریلوں کے نظام کو سہولت کے ساتھ چلا سکتی تھیں۔ یہ نہیں بلکہ ریلوے کی ورکشاپس میں سٹیم انجن، ویگن اور گاڑیاں بنانے کی اہلیت اور کاریگروں میں اس کی صلاحیت بھی تھی۔ ان ورکشاپس میں

MashalBooks.org

تمام ضروری آلات اور اوزار موجود تھے، کام کے آدمی بھی تھے جو پلانٹ اور مشینری تیار کر سکتے تھے یا کم از کم اس کے ایک خاصے بڑے حصے کو جوڑ کر بنا سکتے تھے اور ان میں خود انحصاری اتنی تھی کہ صنعت کاری کے عمل کا آغاز کر سکتے تھے۔ انگریزی راج نے ایک معقول تعلیمی نظام بھی چھوڑا تھا اور ایک صاف ستھرا عدالتی نظام اور ایک موثر انتظامیہ بھی سپرد کی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان کاریگروں کو جو سب کے سب نچلی ذاتوں سے اور محنت کش طبقے سے نکل کر آئے تھے، ایک باوقار ورثہ اس صلاحیت کی صورت میں ملا تھا کہ وہ مشین کے اوزار، ڈیزل انجن، بجلی کی موٹر، سینما کے پروجیکٹر، جراحی کے آلات، انجینئرنگ کے دیگر آلات اور وہ بنیادی سامان تیار کر سکتے تھے جن میں بعض طرح کے پلانٹ بھی شامل تھے۔ لاہور اور اس کے جوار میں نجی مالکوں کی چھوٹ چھوٹی ورکشاپیں جو موروثی تھیں، کام کر رہی تھیں۔ ان میں نہایت ماہر کاریگر کام کر رہے تھے، انہیں نہایت حوصلہ مند سرمایہ کاروں نے نہایت دشوار حالات میں قائم کیا تھا۔

ادھر سماجی شعبے میں ہندوستانی مسلمانوں نے پاکستان کو ایک چھوٹا سا تعلیم یافتہ شہری متوسط طبقہ دیا تھا۔ وہ تعداد میں مختصر ضرور تھے لیکن پاکستان کے شیدائی تھے۔ البتہ ان میں سیاسی شعور، سماجی بیداری، دانش ورانہ بصیرت، سیاسی ڈسپلن اور سماجی ارتباط کی کمی تھی۔ پھر ایک تعداد سیاسی کارکنوں کی تھی جو نہایت مخلص تھے لیکن ان میں رواداری اور سیاسی تربیت کی کمی تھی لیکن ان کے درمیان لیڈر بمشکل کوئی تھا۔ درحقیقت خود جناح کے پاس لیاقت علی خاں اور ناظم الدین جیسے مخلص اور وفادار نائبین نہیں تھے اور جو تھے وہ اعلیٰ طبقے سے تھے۔ محنت کش طبقے سے تو کیا ان میں متوسط طبقے سے بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ تمام سیاسی لیڈر جناح سمیت سیاست دان بننے کے لئے کسی سیاسی عمل سے نہیں گزرے۔ انہوں نے پارٹی کے اندر جمہوریت پر عمل نہیں کیا۔ یہ ورثہ کافی نہیں ہوتا لیکن اقتصادی طور پر ترقی یافتہ اور سماجی طور پر ایک منظّم قوم بنانے کے لئے یہ بھی کافی تھا۔

لیکن سب سے بڑا ورثہ دیہات کی کسان آبادی تھی، غلاموں کی طرح محنتی، جنہیں بڑے بڑے قطعات اراضی کے مالک، وڈیرے، چودھری، نواب اور جاگیردار جو تعداد میں تھوڑے سے تھے، ہنکائے رکھتے تھے۔ یوں پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں سے ایک ایسی آبادی ورثے میں ملی جو آپس میں جڑی ہوئی اور متحد نہیں تھی اور توہم پرست

MashalBooks.org

تھی، وہ غلاموں جیسا معاشرہ تھا جنہیں چند جاگیردار اپنے کارکنوں کے ذریعے قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ کسانوں کو یہ اجازت نہ تھی کہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے نظام حیات کے مطابق ڈھالیں۔ خود جاگیرداروں نے بھی اسلام کے سماجی نظام کو تسلیم نہیں کیا بلکہ حقیقتاً اسے مسترد کر دیا کیونکہ وہ ان کے مفاد کے منافی تھا۔ وہ ایک ان پڑھ معاشرہ تھا جس میں کسان تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے اور خود جاگیرداروں کو کبھی اس کے حصول کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اگر کوئی جاگیردار تعلیم حاصل کرتا تھا تو بصیرت کے لئے نہیں بلکہ اپنے وقار کے لیے۔ بلوچوں کا قبائلی معاشرہ تو ان میں اور بھی بدتر تھا۔

مثالی حالت دراصل کہیں بھی نہیں تھے لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حالات کی سنگینی کو سیاسی، مذہبی اور سماجی قائدین، کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ کم سے کم مسلم لیگ حتیٰ کہ جناح نے بھی نہیں سمجھا اور س کی غلط طور پر قیادت کی اور اسے غلط دانش وروں کی اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی طاقت سے تعبیر کیا گیا۔ اس وقت یہ دلیل دی گئی کہ پاکستان بھاری اکثریت کے ووٹوں سے قائم ہوا اور یہ کہ وہ ایک مربوط قوم ہے۔ یہ حقیقت یکسر چھپا دی گئی کہ جاگیردار جنہوں نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی، بہت قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود پورے دیہی معاشرے اور سیاسی زندگی کو اور ساری کی ساری زرعی معیشت کو اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔

قومیں تشکیل پاتی ہیں اپنے سیاسی، سماجی اور روحانی قائدین کی بصیرت سے اور اپنے عالموں اور دانش وروں کی روشن دماغی سے نہ کہ ماہروں کی منصوبہ بندی ہے۔ یہ صرف ایسے سیاسی لیڈر ہوتے ہیں جو ایک سیاسی عمل سے گزر کر آتے ہیں اور پارٹی کے اندر جمہوریت ہوتی ہے اور مخلص سیاسی کارکن ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی منظم سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں جو حالات کی ایک متوازن اور مربوط تصویر کو واضح طور پر دیکھتی ہیں۔ ماہرین تو اپنے متعین ضابطے پر زور دیں گے اور ان میں جو زیادہ دبنگ ہوں گے، ممکن ہے وہ اپنے ضوابط کی اہمیت پر حد سے زیادہ زور دیں لیکن اس سے ایک مسخ شدہ ترقی عمل میں آئے گی۔ یہ بات صرف ایک سیاسی لیڈر سمجھ سکتا ہے کہ ان افراد میں سے کس کو کتنا حصہ ملنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ایک نئے ملک میں ترقیاتی عمل کی منصوبہ بندی کرنی ہوتی ہے۔

MashalBooks.org

ملک ایک نہایت بھاری اور پیچیدہ صنعت کی طرح ہے۔ اس کے ترقیاتی عمل کا منصوبہ مقاصد کو سامنے رکھ کر اس طرح بنایا جاتا ہے جیسا کسی جدید صنعت میں ہوتا ہے اور اس کا بندوبست صحیح اور سیاسی انداز سے چلایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی بصیرت یا دور اندیشی کے کوئی آثار نہیں چھوڑے اگر ان کے پاس ایسی کوئی صلاحیت تھی۔ ایک منصوبے کے تحت لگنے والی صنعت کی جامع اور اس کے قابلِ عمل ہونے کی رپورٹ بنانے میں ہزاروں صفحے لگتے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے نہ صرف 58 صفحات کا منصوبہ چھوڑا اور کچھ نہیں بتایا کہ ملک کا سماجی ڈھانچہ کیا ہوگا، سیاسی نظام اور انتظامی نظام کیا ہو گا اور اس کا معاشی اور سیاسی فلسفہ کیا ہوگا۔ یہ اور ایسے بہت سے سوالات، جواب طلب رہ گئے۔

پھر اس وقت پاکستان کا جو حال ہے، کسی قوم کا حال اس سے مختلف کیسے ہوسکتا ہے؟

حوالے

1۔ گورڈن لیونارڈ

Brothers Against the Raj; A biographyof sarat and Sobhash Chandra Bose, 1989, Viking, Nw Delhi

2۔ وی پی مینن

The Transfer of ower in India, Princenton,1957.

3۔ کے ایم منشی

Pilgrimage to Freedom.

4۔ گورڈن لیونارڈ

Brother Against Raj: A biography of sarat and Subhash Chandra Bose 1989, Viking New Delhi.

5۔ منیر احمد منیر، سیاسی اتار چڑھاؤ، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور

6۔ سلیم ایم یماں، روزنامہ جنگ، مڈویک میگزین 15 نومبر 1995ء۔

7۔ عائشہ جلال

MashalBooks.org

The Sole Spokesmen: Jinnah, the Muslim League and Demand for Pakistan, Cambridge Universty press 1985.

8۔ ایضاً

9۔ سیروائی

Partition of India, Legend and Reality.

10۔ Transfer of Power Volume VII

11۔ رفیق زکریا

Price of Partition 1998. Bhartia Vidya Bhavan.

12۔ ایضاً 13۔ ایضاً

14۔ ایضاً 15۔ راج موہن گاندھی

The Good Boatman, Portrait of Gandhi, Penguin Books India Ltd New Delhi.

16 Transfer of Power, Volume VII

17۔ سیروائی

Partition of India; Legend and Reality.

20۔ مولانا ابوالکلام آزاد

India wins Freedom, Orient Longman 1988.

21 Transfer of Power Vol.II

22۔ پینڈریل، مون تدوین

Wavell; The viceroy,s-journal; Oxford Universty Press 1973.

23۔ راج موہن گاندھی

The Good Boatman; portrait of Gandhi Penguin Books, India Ltd New Delhi.

24۔ راج موہن گاندھی

Understanding the Muslim mind, Penguim Delhi.

MashalBooks.org

باب نمبر 4

ہندوستانی مسلمانوں کا مغلئ ورثہ

نادرشاہ ایرن کا ایک جنگجو سردار تھا۔ اس نے 1740ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اس نے دارالحکومت دہلی کو لوٹ کر تاراج کر دیا۔ آبادی کا بے رحمی سے قتل کیا۔ اس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ اس طرح نادر شاہ نے بعد میں آنے والے لٹیروں کا راستہ کھول دیا۔ غارت گروں کی جو فوج نادر شاہ نے تیار کی تھی، انہی میں ایک احمد شاہ ابدالی تھا۔ وہ ان کا کمانڈر تھا، وہ سدوزئی پٹھانوں کے اس قبیلے میں پیدا ہوا تھا جنہوں نے ملتان میں اقامت اختیار کی۔ 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس امن عامہ کا حال ابتر ہو گیا کیونکہ مغل شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی اب زیادہ شدت اختیار کر چکی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مغل سلطنت کے سارے علاقوں میں لاقانونیت کہیں کم کہیں زیادہ، ہر جگہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر بہت سے نوجوانوں نے ہتھیار اٹھا لیے تا کہ اس طرح روزی پیدا کریں۔ وہ ایک سردار کے دستے میں سپاہی لگ گئے یا دوسرے کے پاس چلے گئے یا اپنا آزاد جنگی لشکر بنا لیا۔

ایران میں 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ اپنے طور پر جنگ باز سردار بن گیا۔ اس نے موجودہ افغانستان کے جنوب مغرب میں واقع قندھار کو اپنا مرکز بنایا۔ ہر چند کہ اس کا اصل پیشہ لوٹ مار تھا لیکن اس نے شخصی وقار کی خاطر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور درِ دوراں (زمانے کا موتی) کا خطاب اختیار کیا۔ برصغیر میں تو وہ افغان بادشاہ کے نام سے معروف ہے لیکن قندھار میں ہندوستانی بادشاہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اس لیے کہ اس کی جائے پیدائش ملتان تھی۔ 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں اس

MashalBooks.org

نے مرہٹہ جنگ بازوں پر فتح حاصل کی تھی۔ لہٰذا اپنے پیدائشی صوبے پنجاب میں برابر آتا رہتا تھا اس کی قندھار واپسی میں سینکڑوں بیل گاڑیاں، اونٹ اور خچر خراج کے مال سے لدے ہوئے تھے، یہ ٹیکس وہ پنجابیوں سے وصول کرتا تھا۔ ایک ایک پیسہ، زیورات اور مال اسباب جو اٹھایا جا سکے اور وہ سب کچھ جو اس کے دو حملوں کے درمیانی عرصہ میں یہ لوگ جمع کرتے تھے، وہ انہیں لے جاتا تھا۔

نادر شاہ اور احمد شاہ نے 1740ء میں جو کچھ دہلی اور پنجاب میں کیا، اسے پاکستان کے تاریخ دان مبارک علی نے بہت کچھ اس کی مقدار کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ [1] ایچ جی کنیر کی کتاب Hindustan under Free Lances 1770-1820 مطبوعہ، Shanoon Ireland 1972 نجم الغنی خاں کی تاریخ ریاست حیدرآباد دکن (لکھنو 1930ء) میر تقی میر کی فارسی خود نوشت اردو ترجمہ نثار احمد فاروقی، دہلی 1957ء اور گنڈا سنگھ کی کتاب احمد شاہ درانی (بمبئی 1957ء مبارک علی کی کتاب کے ماخذ ہیں۔ مبارک علی ہمیں بتاتے ہیں کہ نادرشاہ نے شاہی خزانے سے ساڑھے تین کروڑ روپے لوٹے، شاہی زیورات جن کی مالیت پندرہ کروڑ تھی، تجوری توڑ کر نکلوا لیے۔ تخت طاؤس جس کی مالیت تین کروڑ روپے تھی، اسے لے گیا۔ مزید پندرہ کروڑ شاہی محل کے دوسرے ذرائع سے حاصل کیے۔ وہ شاہی اصطبل سے گھوڑے اور ہاتھی بھی ساتھ لے گیا۔ عام گھروں کے مال و متاع کا صفایا کرنے کے بعد اس نے لاکھوں اور کروڑوں روپے امیروں اور رئیسوں سے بھی چھین لیے یہاں تک کہ چند ایک نے جو بالکل کنگال ہو گئے تھے، خودکشی کر لی۔)

نادر شاہ کا کام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اسے پورا کرنے کے لئے احمد شاہ نے بالکل یہی کام دہلی میں 1757ء میں قدرے کم درجے پر انجام دیا۔ متمول لوگ پولیس چوکی پر بلوائے گئے جہاں احمد شاہ کے لٹیرے سردار نے خود ہی اپنا تقرر کر لیا تھا۔ وہاں ان سے جو کچھ طلب کیا گیا، وہ انہیں دینا پڑا، اور اگر ان سے کافی مال نہ مل سکا تو انہیں سخت اذیت دی گئی۔ جن کے پاس نقدی ناکافی تھی، انہوں نے اپنی املاک بیچ دیں جن کے خریدار ظاہر ہے کوئی نہ تھے۔ بہتوں نے خودکشی کر لی۔ ابدالی کے لٹیروں نے گھروں کو مسمار کر دیا، ساری چھتیں توڑ ڈالیں، عورتوں کی عصمتیں پامال کیں اور مردوں کو اذیتیں دیں، لوٹ مار سے جو

کچھ بچا تھا، اسے آگ لگا دی گئی یہاں تک کہ بہتوں نے جو قلاش ہو گئے تھے، خودکشی کر لی۔

یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ ابدالی نے لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں کیا کیا جہاں اس کا آنا ایک سالانہ معمول بن گیا تھا۔ صرف پنجاب ہی مغلوں کا صوبہ نہیں تھا جہاں لٹیرے حملہ آوروں کا قبضہ تھا بہت سے جنگجو سردار پورے شمالی ہندوستان میں سالانہ ٹیکس کی وصولی کے لیے نکلتے تھے۔ ادھر ریاست حیدرآباد کی شمالی سرحدوں سے لے کر دہلی، اڑیسہ اور بنگال تک اور راجپوتانہ اور پنجاب سے دریائے ستلج تک کا علاقہ مرہٹہ جنگ جو لٹیروں کی شکارگاہ تھا، وہ مختلف قبیلوں کے نام سے اپنی کارروائی کرتے۔ یہ سندھا، ہولکر، بھونسلے، گائیکواڑ اور پیشوا تھے۔ پیشوا مرہٹہ لٹیروں کی ساری جمعیت کا سردار تھا۔ وہ صرف چوتھ وصول کرتے تھے یعنی آمدنی کا ایک چوتھائی۔ ابدالی کی طرح نہیں جو خراج لیتا تھا۔

مرہٹے گروہ درگر وہ پنڈاری پٹھانوں کو ساتھ لے کر جوان کے شریک کار تھے، اپنی شکارگاہ میں گھس جاتے۔ ان کے پیچھے موت اور ہلاکت ہوتی، تباہی و بربادی ہوتی اور آگے آگے بیل گاڑیاں ہوتیں اور خچر ہوتے۔ لوٹ کی دولت اور مال اسباب اٹھائے ہوئے جنہیں غریب کسانوں نے اپنی خون پسینے کی کمائی سے اور چھوٹے تاجروں نے بڑی مشقت سے اکٹھا کیا ہوتا۔ پنڈاری، گجراتی کے لفظ پنڈارے سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے چلنے والے۔ مرہٹہ سردار اپنے سدوزئی ساتھیوں کی طرح آزاد منڈی کی معیشت پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نظم ونسق کو ہر طرح کے اصول وضوابط سے آزاد کر دیا۔ صرف چند حاکم برائے نام موجود ہوتے جو اس بات پر نظر رکھتے کہ چوتھ کی وصولی آسان، مثبت اور نفع بخش طریقے سے ہوتی رہے۔ خراج یا چوتھ کی وصولی میں وہ ہندو مسلم کی تفریق نہیں کرتے تھے۔

کچھ استثنائی صورتیں بھی تھیں۔ سورج مل جاٹ کی بھرت پور ریاست میں روہیلہ پٹھانوں کے علاقہ روہیل کھنڈ میں اور نواب وزیر کی ریاست اودھ میں، بندوبست کسی قدر ضابطے سے چل رہا تھا اور راجپوتانہ کی ریاستیں تھیں جہاں سے چوتھ کی وصولی جنگی لحاظ سے مہنگی پڑتی۔ لہٰذا مرہٹوں اور ابدالیوں نے وہاں سالانہ وصولی سے درگزر کیا۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ علاقے لوٹ مار کی سالانہ رسم سے خارج کر دیئے گئے تھے جب ان کا اپنے

MashalBooks.org

مرہٹہ شراکت داروں کے ساتھ لوٹ کے مال کی تقسیم پر اختلاف ہو گیا اور وہ الگ کر دیئے گئے تو پہلے ٹھگوں نے اور اس کے بعد پنڈاریوں نے انہیں لوٹنا شروع کر دیا۔

بڑی دلچسپ بات ہو گی اگر یاد دلاؤں کہ اٹھارہویں صدی کی آخری چوتھائی میں مغل بادشاہ شاہ عالم نے مرہٹہ پیشوا کو جنگ بازوں اور لٹیروں کا سرغنہ تھا، اپنا وکیل مطلق مقرر کیا تھا یعنی اسے بادشاہ کی نمائندگی کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ اسے کمتر درجے کا مرہٹہ سردار، مہاراجہ سندھیا نائب وکیل مطلق مقرر ہوا تھا۔

البتہ وہ علاقے محفوظ تھے جہاں لوگوں نے اپنے طور پر پولیس کا اورا پنے تحفظ کا انتظام کیا تھا۔ صرف جنگجو مرہٹے اور ابدالی ہی نہیں تھے جو انہیں لوٹتے۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان جاٹ رہتے تھے۔ جب ان کے اخراجات آمدنی سے بڑھ جاتے تو وہ آزادی سے شہروں کا رخ کرتے۔ چونکہ ریاستوں کے اختیارات ختم ہو چکے تھے اور نظم و ضبط اور امن عامہ کا وجود نہیں تھا لہٰذا اقتصادی سرگرمیاں بڑی تیزی سے سست پڑنے لگیں۔ گزر اوقات کے لیے ان کا ذریعہ آمدنی لوٹ مار ہی رہ گیا تھا۔ ان حالات میں قانونی اور غیر قانونی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قانون نافذ کرنے والا کوئی ادارہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ سپہ گری ذریعہ روزگار تھا۔ پیشہ سپہ گری یعنی بھاڑے کی سپاہیانہ خدمت کو وقار حاصل ہو گیا تھا سب سے زیادہ آفت دہلی پر ٹوٹی تھی۔ اس شہر میں سب کچھ روا تھا اور ہر کام کی آزادی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جب کچھ بلوچ سرداروں کو بلوایا گیا اور انہیں دہلی کے آس پاس زمینیں دے کر آباد کیا گیا تا کہ برے وقت میں ان کی فوری امداد دستیاب ہو۔ اس سے کچھ تو فرق پڑا لیکن دہلی کے قریب گیسو پور اور فرید نگر کے بلوچ سرداروں کے بس کی بات نہیں تھی کہ مسلمانوں میں نادر شاہ اور ابدالیوں کے لشکروں اور ہندوؤں میں بالاجی باجی راؤ کی فوجوں کا مقابلہ کرتے۔

1707ء میں نراج اور لاقانونیت پھیلنے سے بہت سی یورپی اقوام ہندوستان کے ساتھ تجارت میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتی تھیں۔ زمانہ وسطیٰ میں ہندوستان دنیا کے متمول ملکوں میں سب سے زیادہ دولت مند ملک کے طور پر مشہور تھا جبھی تو کولمبس نہایت پرخطر سفر اختیار کر کے ہندوستان دریافت کرنے نکلا اور واسکوڈی گاما تو عملاً یہاں پہنچا۔ اس کی ضرورت یوں پیدا ہوئی کہ ترکوں نے بحیرہ روم کے مشرقی کنارے اور مصر پر

قبضہ کر لیا تھا اس نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے بری راستے کو بند کر دیا تھا۔ ترکی حکومت تاجروں پر محصول لگاتی تھی وہ محصول سے زیادہ لوٹ تھی۔ لہٰذا ہر یورپی قوم کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی خوشحالی میں اپنا حصہ بٹانے کے لیے اس کے ساتھ تجارت کرے۔

جس زمانے میں پرتگالی ہندوستان کے مالا بار ساحل کا جائزہ لے رہے تھے، وہی زمانہ تھا جب مغلوں نے بابر کی سربراہی میں ہندوکش پہاڑوں کے دروں سے ہندوستان کا راستہ تلاش کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں مالابار کے ساحل پر البقرق گواس جو پرتگال کا گورنر جنرل تھا، حکومت کر رہا تھا۔ بابر نے 1526ء میں پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی اور آگرہ کے تخت پر براجمان ہو گیا۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ پرتگالی دراصل بحری قزاق تھے اور ان کی حکمرانی کا مقصد ان کی قزاقی کو منظر کرنا تھا لیکن بابر زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا اور چند سال کے اندر نوجوانی میں ہی مر گیا۔ اس کا بیٹا ہمایوں بھی زیادہ عرصہ حکومت نہ کر سکا کیونکہ شیر شاہ نے ایک بغاوت کے بعد اسے ہندوستان سے باہر نکال دیا تھا۔ دراصل مغلوں کی حکمرانی کا دور اس وقت سے شروع ہوا جب ہمایوں نے دوبارہ تخت حاصل کیا لیکن وہ بھی حادثاتی طور پر زینے سے اترتے ہوئے گرا اور نوجوانی میں ہی مر گیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا تیرہ سالہ بیٹا اکبر جانشین ہوا۔ دراصل وہ اکبر تھا جس نے اپنی بصیرت دور اندیشی سے ہندوستان کی حقیقی خوشحالی کی صورت نکالی۔ اس نے ہندوستان کی سیاست میں رواداری اور حسنِ انتظام کو شامل کیا۔ اکبر نے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کی۔ اس نے تو اپنے دادا بابر کی وصیت کو جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے چھوڑی تھی، تخلیقی انداز سے پورا کیا۔ بابر نے اپنی وصیت میں ہمایوں کو مشورہ دیا تھا کہ رعایا کو انصاف کی فراہمی کرے اور سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرے۔ ہندو اور مسلمان سب کے ساتھ برابری رکھے اور ہندو مذہب میں رکاوٹ نہ ڈالے۔

اکبر اس کے باوجود کہ بالکل ناخواندہ تھا، نہایت دور اندیش اور روشن فکر حکمران تھا۔ اس نے اپنے دادا کی ہدایتوں پر عمل کیا کہ ''ہندوستان کے باشندوں کے دلوں کو جیت لو اور ایسا انصاف کرو کہ رعیت بادشاہ سے خوش ہو جائے اور بادشاہ رعیت سے، کیونکہ اسلام کو پھیلانے کا مقصد احسان مندی کے ہتھیار سے بہتر طور پر حاصل ہو گا نہ کہ ظلم کی تلوار

سے۔ یہ کچھ دیسی ہی حکمتِ عملی تھی جس نے شام، مصر اور دوسرے مقبوضہ علاقوں میں غیر مسلموں کی بھاری تعداد کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔[2]

اکبر نے جو اصلاحات کیں، اس کے نتیجے میں ہندوستان میں خوشحالی آئی۔ اس نے انتظامی نظام کو مربوط کرنے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس نے محصولاتی پالیسی اس طرح اختیار کی کہ غریبوں پر بلاوجہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور جن پر ٹیکس عائد ہو، اس کی ادائیگی ان کے لیے آسان ہو۔ ٹیکس کی وصولی کے نظام کو درست اور منصفانہ بنایا گیا جس پر ٹیکس لگتا، فائدے کا جھکاؤ انہی کی طرف ہوتا۔ اس پالیسی کی بناء پر لوگ دولت کمانے میں آزاد ہو گئے۔ اکبر ہی کے زمانے میں نہری آبپاشی کے نظام کو دوبارہ درست کیا گیا۔ ساری مملکت میں سڑکوں کا جال بچھایا گیا تاکہ دارالحکومت کے ساتھ فوری اور موثر رابطہ اور مواصلت یقینی طور پر برقرار رہے۔ یہ درست ہے کہ سڑک کی تعمیر کا کام شیر شاہ سوری نے شروع کیا تھا لیکن ایک حادثے کے باعث جس میں وہ پانچ ہی سال کے اندر انتقال کر گیا، اس کی حکومت کا دورانیہ مختصر رہا۔ اس نے جو سڑک بنوائی وہ بنگال یعنی موجودہ کلکتہ کو پشاور سے ملاتی تھی پھر اس سے آگے پشاور کو کابل اور مزید آگے ہندوکش کے پہاڑی سلسلے تک جاتی تھی۔ اپنے وقت میں وہ دنیا کی سب سے لمبی سڑک تھی جس پر سہولت کے مطابق فاصلوں پر سرائیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ جہاں گھوڑوں کے تازہ دم دستے، تھکے ہوئے گھوڑوں کی جگہ لینے کے لیے موجود رہتے۔ اس بندوبست کو اکبر نے بھی اختیار کیا اور سڑکوں کا جال ساری مملکت میں پھیلا دیا۔

لیکن سب سے بڑا اور روشن دلانہ کام تو اکبر کا نظام اراضی تھا جس میں ریاست نے ساری قابلِ کاشت اراضی کو اپنی ملکیت میں لے لیا تھا۔[3] مغل دورِ حکومت میں اور اس کے بعد 1791ء میں لارڈ کارنواس کے دور تک زمین میں ریاست ہی کی ملکیت رہی۔ یہ افراد کو ریاست کی مقررہ خدمت کی انجام دہی کی خاطر اخراجات پورے کرنے کے لیے دی جاتی تھی۔ اصل کام ان کا یہ ہوتا تھا کہ سپاہیوں کے گھڑ سوار دستے تیار رکھے جائیں تاکہ ریاست کی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے ہر وقت موجود ہوں۔ دوسرے امور جن کی انجام دہی میں یہ آمدنی کام آتی، وہ سڑکوں کی مرمت، نہری نظام کی دیکھ بھال اور رفاہِ عامہ کے دوسرے کام تھے۔ ریاست کے پاس یہ اختیار ہونا کہ جب چاہے زمین واپس

لے لے اور واقعتاً قطعہ اراضی اس کے مالک کی وفات کے بعد واپس لے لی جاتی تھی اور یہ بالکل ضروری نہ تھا کہ اس کے وارث کو الاٹ کر دی جائے۔ یہ تو اٹھارہویں صدی کے نصفِ آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے مستقل بندوبست اراضی کا قانون نافذ کر کے زمین کو نجی ملکیت میں دینا شروع کیا۔

اس طرح جو پرامن حالات پیدا ہوئے، ان کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اندرن ملک تجارت بڑھ گئی بلکہ اس کا سلسلہ خشکی کے راستے وسط ایشیا اور ایران تک اور سورت اور ٹھٹہ کی بندرگاہوں کے ذریعے خلیج فارس کے علاقے اور یمن تک، پھر ہگلی کی بندرگاہ سے ملایا اور برما تک پھیل گیا۔ یہ اس تجارت کے علاوہ تھا جسے پرتگالی گوا کی بندرگاہ سے مالا بار کے ساحل پر اور کاٹھیا واڑ دمن اور دیو تک چلا رہے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں خوشحالی کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ دنیا بھر کی صنعتی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ 1750ء تک 24 فیصد سے زائد تھا جبکہ امریکہ کا حصہ اعشاریہ ایک فیصد، برطانیہ کا ایک اعشاریہ نو فیصد اور سارے یورپ کا 24 فیصد سے کم تھا۔ (4)

اس خوشحالی کی خبریں یورپ پہنچ رہی تھیں اور بیشتر پرتگالیوں کے ذریعے انتہائی مبالغہ آمیز انداز میں جس نے یورپی ملکوں کو متحرک کیا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کا راستہ کھولیں۔

اکبر کے جانشینوں یعنی جہانگیر اور پھر شاہجہان نے حتیٰ کہ اورنگ زیب کے ابتدائی دورِ حکومت میں انتظامیہ نے اس پالیسی پر موثر انداز سے عمل کیا اور خوشحالی بڑھتی رہی لیکن بدقسمتی سے ان میں یہ دور اندیشی نہ تھی کہ اکبر کے کام کو اپنی تخلیقی صلاحیت اور اختراع سے آگے لے جاتے اور اسے نئے حالات سے ہم آہنگ کرتے۔ اکبر نے یقیناً بہت بڑا کام کیا پھر بھی جو کچھ کیا، ذاتی طور پر کیا۔ اس نے کوئی ادارے نہیں بنائے جو اس کی اپنی اصلاحات کو مزید آگے لے جاتے اور ان میں توسیع کرتے۔ مثال کے طور پر انصاف تو تھا لیکن انصاف بادشاہ کے عطیے کے طور پر دیا جاتا۔ یہ ایک نوازش ہوتی۔ رعایا سے اپنا حق سمجھ کر نہیں لیتی تھی۔ انصاف کا ایسا کوئی ادارہ نہیں بنایا گیا ایسے کسی نظام کی تشکیل نہ ہوسکی کہ نچلی سطح پر کوئی کسی فیصلے میں اگر بے انصافی کا شائبہ نظر آتا تو اس کی اپیل کی جاسکتی اور یہ سب تو اکبر کے جانشینوں نے بھی نہیں کیا۔ مغل سلطنت کے دور میں

MashalBooks.org

ایسے سول اور تعزیراتی قوانین بلکہ کسی طرح کے بھی قانون کا پتہ نہیں چلتا جو مہذب شہری زندگی کے معمولات مثلاً کاروبار اور تجارت پر لاگو ہوتے ہوں۔ بادشاہ کی مرضی یا اس کے نامزد مقامی عہدیدار کی مرضی ہی قانون کی ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ ایک مہذب معاشرے کے لیے یہ کوئی مثالی بات نہیں۔

اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اکبر نے تعلیم کو اہمیت دی ہو۔ اس کے دور میں تعلیم کا کوئی محکمہ نہیں تھا لیکن ایک عہدہ رکن المدرسین (ناظم تعلیمات) کا تھا۔ اس کا فرض یہ ہوتا کہ ایسے اساتذہ منتخب کرے جو کسی مدرسہ کو جاری رکھنے کے لیے مدد معاش کے مستحق ہوں۔ یہ مدد معاشی یعنی گزارہ الاؤنس، رکن المدرسین کی سفارش پر بادشاہ عنایت کرتا لیکن استاد کیا پڑھاتا ہے، ریاست کو اس سے کوئی غرض نہ تھی چونکہ کوئی تعلیمی پالیسی موجود نہیں تھی کہ قوم کو کس طرح کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی کی بھی سفارش ہو جاتی اور وہ مددِ معاش کا مستحق ہو جاتا۔ اکبر چونکہ ناخواندہ تھا لہٰذا اس نے اگر تعلیم کا محکمہ قائم نہیں کیا اور کوئی تعلیمی پالیسی نہیں بنائی تو تاریخ اسے معاف کر دے گی لیکن اس کے جانشین تو خواندہ تھے اور اس کا پڑپوتا اورنگ زیب تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ محکمہ تعلیم کے قیام اور تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں ان بادشاہوں کی ناکامی پر انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔

یاد رہے کہ اس زمانے میں جو چیز بادشاہ کو عزیز ہوتی تھی، ہر باصلاحیت شخص اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا تھا۔ مثال کے طور پر جہانگیر کو تصویروں سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ہنرمند لوگوں کے درمیان سے بہت ممتاز مصور ابھر کر آئے۔ شاہجہاں کو عمارتوں سے عشق تھا چنانچہ بہت سے صلاحیت نوجوانوں نے عظیم معمار بننے کی کوشش کی۔ اگر ان حکمرانوں نے فلسفیوں، سائنس دانوں اور دوسرے علوم و فنون کے عالموں کی پذیرائی کی ہوتی تو مغل سلطنت میں ایسے لوگوں کی کمی نہ ہوتی۔ عباسی خلفاء نے علوم کے حصول اور تحقیق سے محبت اور ان کی سرپرستی کی تو اس کے نتیجے میں تمام علمی شعبوں کے عالم کثیر تعداد میں پیدا ہوئے۔ یہ علم و فضل سے عباسی خلفاء کی محبت ہی تھی جس نے بہت سے عالموں کو یونانی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے پر اکسایا۔ اس سے ساری اسلامی دنیا میں حصولِ تعلیم کی لگن پیدا کی اور نوجوان لڑکوں کو علم حاصل کر کے عالم بننے اور

MashalBooks.org

کتابیں لکھنے پر مائل کیا۔ یہ روایت اموی دور کے سپین اور توران میں اور ماور النہر و وسطی ایشیا تک پھیل گئی۔ یہ علم سے اس کا عشق ہی تھا جس کی بنا پر البیرونی وسط ایشیا سے نکل کر سنسکرت سیکھنے کے لئے ہندوستان آیا اور پھر اس نے کتاب الہند جیسی شاہکار کتاب تصنیف کی۔

مغلوں نے اپنے بعد پرشکوہ قلعے، عالیشان محل، خوبصورت مقابر، سڑکیں اور نہریں تو چھوڑیں لیکن انہوں نے ورثے میں کوئی یونیورسٹی نہیں دی۔ ایک سکول کی عمارت، کوئی عدالت حتیٰ کہ نیچے درجے کی عدالت تک نہیں چھوڑی۔ بدنصیبی یہیں ختم نہیں ہوتی کہ کسبِ علم کے ادارے نہیں تھے اور پوری مغل سلطنت میں دور دور تک کہیں بھی یونیورسٹیاں اور کالج نہیں تھے۔ یہ سچ ہے کہ مغلوں کو ماقبل مسلمان حکمرانوں سے ورثے میں یونیورسٹیاں اور کالج نہیں ملے لیکن وہ وسط ایشیا سے آئے تھے جہاں کم از کم چار یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ بابر کے بزرگوں میں الغ خاں اپنے وقت کا عظیم سائنس دان تھا پھر مغلوں کو خیال کیوں نہ آیا کہ سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھولتے، تعلیم کا محکمہ قائم کرتے، ایک قومی نصاب اور آخر میں ایک تعلیمی پالیسی مرتب کرتے؟ صاف ظاہر ہے کہ مغلوں نے یہ اندازہ نہیں کیا کہ تعلیم ایک ترقی پذیر معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔

مغل سلطنت کے قلب ہندوستان میں جو بولی بولی جاتی تھی، اسے پاکستان میں اردو اور ہندوستان میں ہندی کہتے ہیں۔ تحریر میں آنے والی ہندی یا ادبی ہندی اس سے بہت مختلف ہے۔ مغلوں کے دور میں اور بہت حد تک انگریزوں کے دور میں بھی ہندوستان سے مراد تقسیم ہند سے پہلے کے علاقے یوپی، بہار، مدھیہ پردیش (سی پی) کے شمالی حصے اور راجستھان کے شمال مشرقی حصے اور آگرہ دہلی کے درمیانی حصے سے متصل علاقے تھے۔ اردو یا بول چال کی ہندی انگریزوں کے زمانے میں ہندوستانی کہلاتی تھی۔ یہ لکھی نہیں جاتی تھی اس لیے یہ ادبی زبان نہیں تھی اس میں شاعری ضرور ہوتی تھی لیکن وہ بھی مغلوں کے آخری دور میں۔ مغل اپنے خاندان کے اندر ترکی زبان بولتے تھے اور اس میں خط و کتابت کرتے تھے۔ یہ صرف وسط ایشیا میں جسے ان دنوں توران کہا جاتا تھا۔ اپنے قبیلے کے لوگوں سے نہیں بلکہ آپس میں بھی ترکی میں ہی خط لکھتے تھے۔ دربار میں وہ فارسی بولتے تھے جو ریاست کی سرکاری زبان بھی تھی۔ سرکاری دستاویزات فارسی میں لکھی جاتی تھیں اس کے

MashalBooks.org

باوجود کہ فارسی ہندوستان میں سرکاری زبان کے طور پر ایک طویل عرصے تک رائج رہی، اسے آبادی کے ایک نہایت قلیل حصے میں سمجھا جاتا تھا اور بولنے والے تو اور بھی کم تھے۔ یہ ایک بڑی کوتاہی تھی۔ چنانچہ مغل دورِ حکومت سے اور اس سے پہلے کے زمانے سے بھی کسی بڑے ہندوستانی عالم کا نام سننے میں نہیں آتا۔

ذریعہ تعلیم سے محرومی اور ادبی پیرایہ اظہار کا نہ ہونا یقیناً ایک بڑی رکاوٹ تھی لیکن دوسری اور اس سے بھی بڑی محرومی کتابیں شائع کرنے کی سہولت کا نہ ہونا تھا۔ مغلیہ ہندوستان میں پرتگالی پادری اکبر کے دربار میں مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ سولہویں صدی کا نصف آخر تھا۔ اس بات کی تحریری شہادت موجود ہے کہ انہوں نے مطبوعہ کتابیں اکبر کو پیش کیں حتیٰ کہ عربی رسم الخط میں چھپائی بھی وٹیکن میں شروع ہو چکی تھی جہاں عیسائی علماء کے لیے مذہب کے تقابلی مطالعہ کی غرض سے عربی کی کلاسیکی کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

مغلیہ دربار میں یورپ سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ان کے تاثرات ہندوستان کے بارے میں ان کی تصانیف میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ شاہجہان اور اس کے بعد اورنگ زیب کے دربار میں فرانس کا معالج ڈاکٹر برنیئر اور اٹلی کا سیاح منوچی موجود تھے۔ ان دونوں نے پہلے زمانے کے اور اپنے بعد آنے والے یورپی مصنفوں کی طرح مغل درباروں کا اور ہندوستانی معاشرے کا حال بھرپور انداز سے بیان کیا ہے۔ برنیئر نے اپنی کتاب فرنچ میں لکھی (اس کا انگریزی ترجمہ مغل سلطنت میں سیاحت (1636-1663) کے نام سے شائع ہوا۔ منوچی کی کتاب میں مبالغہ آرائی بہت ہے۔ وہ دوسرے افراد جنہوں نے ہندوستان کی سیاحت کی اور یہاں کا احوال لکھا، ان میں ایبل ڈوبے (Abbel Duboi) ایچ جی کین (H.G.Keene) جے بی ٹیورنئر (J.B.Tavernier) اور ڈاکٹر ہملٹن (Dr.Himilton) شامل ہیں۔

پھر ایک پہلو تہذیبوں کی تجدید نو کا ہوتا ہے۔ ہر تندرست انسانی جسم میں ناقص اور ناکارہ خلیوں کی جگہ نئے خلیوں کی پیدائش کا ایک مسلسل عمل جاری رہتا ہے۔ انسانی معاشرہ بھی انسانی جسم کی طرح ہے۔ صحت مند انسانی معاشرہ میں پرانے اور ناکارہ نظام کی تبدیلی کا عمل سماجی، اخلاقی، روحانی اور ثقافتی تحریکوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے مشہور عالم آرنلڈ ٹوائن بی نے ان تحریکوں اور اداروں کو مجموعی طور پر تخلیقی اقلیت کا نام دیا

ہے۔ بدلے ہوئے سماجی اور معاشی حالات میں نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام میں وقتاً فوقتاً ایسی تحریکیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی یہ چند ایسی ہی تحریکیں تھیں اس کے علاوہ صوفیاء تھے جن کا طریقہ روحانی تھا اور معتزلہ تھے جو استدلال پر زور دیتے تھے۔ ایرانی نے نہایت عظیم المرتبت فلسفی اور مفکر، جغرافیہ دان اور ریاضی دان، سائنس دان اورا طباء مورخ اور مختلف علوم کے عالم پیدا کیے۔ فارابی، ابنِ سینا، ابن رشد، البیرونی، الخار زین، الادریسی اور ابن خلدون انہی اکابر میں سے تھے۔ ابن خلدون فلسفہ تاریخ کا عالم تھا۔ وہ معاشیات اور سماجیات کے علوم کا بھی بانی تھا۔ تخلیقی اقلیت مؤثر تعداد میں پندرہویں صدی تک ہر نسل میں پائی جاتی تھی۔

جہاں تک اس معاشرے کا تعلق ہے جو ایک مؤثر تخلیقی اقلیت کو بروئے کار لا سکتا تھا تو اس کا بنجر پن مغلیہ ہندوستانی مسلمان معاشرے کی دین تھا اور وہ معاشرہ خود مغلوں کو گزشتہ مسلمان حکومتوں سے ورثے میں ملا تھا۔ مغلوں کے بعد کے دور میں ایک سرسید تھے جو اس سے مستثنیٰ تھے۔ اس زمانے میں معاشرے کی ناکامیوں اور کوتاہیوں سے بالعموم صرفِ نظر کیا گیا یا ان کی توجیہات کی گئیں اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ سارا الزام سازشوں پر ڈال دیا گیا۔ وہ ایسا ہی معاشرہ تھا جو ایک خونریز خانہ جنگی کے بعد 1658ء میں اورنگ زیب کو ورثے میں ملا تھا۔ تختِ حکومت پر بیٹھنے کے لئے اورنگ زیب کو اپنے باپ کو قید اور دو بھائیوں کو قتل کرنا پڑا اور تیسرے کا پیچھا کر کے ہندوستان سے باہر نکالنا پڑا۔ تاریخ میں اورنگ زیب کی ایک منفرد حیثیت تھی۔ کئی اعتبار سے وہ اپنے 49 سالہ دور حکومت میں ہمیشہ ایک متنازعہ شخصیت بنا رہا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اسی کے زمانے میں شروع ہوا۔ بہت سے مورخ اس کو اپنے باپ کی اسیری اور بھائیوں کے قتل کا ملزم گردانتے ہیں اور یہ الزام بھی دیتے ہیں کہ اس نے ہندو رعیت اور شیعہ اقلیت کے ساتھ بے انصافی برتی۔

آیئے ان الزامات کی روشنی میں اورنگ زیب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت اس وقت کی جب وہ مستقلاً بیمار رہنے لگا تھا۔ تاریخ کا جائزہ گہری نظر سے لیں تو معلوم ہو گا کہ جب شاہجہان کی شدید علالت کی خبر اس کے بیٹوں کو ہوئی تو سب کے تختِ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے دارالحکومت تک پہنچنے کی تیاری

MashalBooks.org

کرنے لگے۔ صرف دارا باپ کے قریب تھا، باقی سب کو وائسرائے بنا کر دور افتادہ مقامات پر تعینات کر دیا گیا تھا یہاں دو باتیں یاد رکھئے ہر مغل شہزادے اور ممتاز شخص کا دربار میں ہونے والے واقعات کی جاسوسی کے لیے ایک ذاتی نظام اطلاعات ہوتا تھا۔ لہٰذا دارا کو حتی الامکان دارالحکومت سے بہت قریب رکھا جاتا تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھئے کہ مغلوں میں بلکہ توران میں ان کے پرکھوں میں بھی کوئی روایت یا کوئی قانونی نظام اقتدار کی منتقلی کا وجود نہیں تھا۔ روایت یہ تھی کہ ان میں جو بھی سب سے زیادہ طاقتور ہو اور ضروری نہیں کہ وہ سب سے بڑا بیٹا ہوا، وہ میدانِ جنگ میں فتح یاب ہو کر تخت پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اس کا فیصلہ بات چیت سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے دادا جہانگیر کے خلاف اٹھ کھڑا ہو لیکن یہ بغاوت بھی ناکام رہی۔ لہٰذا تختِ حکومت کے لیے بغاوت کر کے اورنگ زیب نے کوئی نئی بات نہیں کی بلکہ خاندان کی ایک روایت پر عمل کیا۔ جہاں تک بھائیوں کے قتل کا معاملہ ہے، وہ انہیں نہ مارتا تو بھائی اسے قتل کر دیتے۔ جہاں تک باپ کو قید کرنے کی بات ہے تو جہانگیر نے کیا اپنے بیٹے خسرو کو اندھا کر دینے کے بعد قید نہیں کیا تھا۔ یہ بڑی درندگی اور بے رحمی کی بات تھی۔ اورنگ زیب نے آگرہ کے قلعہ میں باپ کو قید کر کے اس کے آرام کا خیال رکھا اور اپنی بہن کو شاہجہان کے پاس رہنے کی اجازت دی۔ مغلوں کے غم زاد عثمانی ترکوں نے بھی اس دور کی ترک سلطنت میں تخت نشینی کا یہی طریقہ رکھا۔ تاریخ میں پیچھے کی طرف جائیں عباسیوں اور ان سے پہلے امویوں کے یہاں بھی وراثت کی منتقلی کا یہی قرینہ تھا۔ خود ہندوستانی میں علاؤ الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد تختِ حکومت پر بیٹھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم خلافتوں، سلطنتوں اور بادشاہتوں میں پرامن انتقالِ اقتدار کی کوئی مقررہ روایت موجود نہیں تھی۔

اورنگ زیب کے خلاف دوسرا الزام کی سخت گیری اور ہندو رعایا کے ساتھ بے انصافی تھی۔ اس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا سنی رعایا کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا تھا؟ رعایا کو جانے دیجئے! کیا اس کا سلوک شاہی خاندان کے افراد یہاں تک کہ اپنے بیٹوں کے ساتھ بہت اچھا تھا؟ ایک سازش اور بغاوت کے نتیجے میں تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ تخت کے ہر ممکن دعویدار پر، یا اس کے حمایتی پر شک تھا اور کسی ممکنہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ادنیٰ درجے کی چالاکی برتنے لگا تھا۔ جائز طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ

بلاوجہ ہر شخص پر شک کرتا تھا اور دوسروں سے زیادہ اپنے بیٹوں کو مشکوک سمجھتا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس میں وہ مبتلا تھا۔

اس کے ساتھ ہی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں شیعہ اور ہندو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیے تھے۔ ایک شیعہ کو وزیراعظم بنایا تھا اور دوسروں کو اعلیٰ عہدے دیئے تھے اور ہندوؤں کو سپہ سالار اعلیٰ اور گورنر یہاں تک کہ کابل کا گورنر بنایا تھا۔ وہ جے سنگھ تھا۔ جے کو یہ ذمہ داری تنہا سپرد کی گئی تھی کہ پشاور کی وادی میں خوشحال خاں خٹک کی بغاوت کو فرو کے جس کی وجہ سے ایران اور وسط ایشیا کے ساتھ تجارت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جے سنگھ نے یہ فوجی مہم ایک خاصی بڑی ہندو راجپوت فوج کی مدد سے اختیار کی تھی۔ خوشحال خاں خٹک کی بغاوت کو فیصلہ کن طور پر کچلنے کے بعد جے سنگھ فاتحانہ طور پر اور آگے بڑھا اور کابل جا پہنچا جب وہ دہلی واپس ہوا تو اورنگ نے شہر سے چند میل دور جا کر اس کی پیشوائی کی اور سینے سے لگا کر کہا ''پسر! تم نے میرا دل خوش کر دیا، انعام کے طور پر تمہاری ریاست اب سوائی ہو گی۔ سوائی کے معنی ہیں 25 فیصد زیادہ، اس دن کے بعد سے جے پور کی ریاست کو سوائی جے پور کہا جانے لگا۔ یاد رہے کہ مرہٹہ سردار شیواجی کے ہاتھوں مسلمان کماندار افضل خاں کی شکست اور قتل کے بعد، وہ جے سنگھ ہی تھا جس نے باغیوں کو فیصلہ کن طور پر شکست دی اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ اورنگ زیب کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں ہندوؤں کی بغاوت ہوتی، وہاں مقابلے کے لئے مسلمان فوج نہیں بلکہ ہندو فوج بھیجتا تھا اس کی رائے میں مسلمان تو جہاں شروع کر دیتے ہیں جبکہ اورنگ زیب اپنی حکومت کے علاقے میں توسیع چاہتا تھا لیکن اورنگ زیب نے زیادہ تر ہندو ریاستوں کو نہیں بلکہ دکن میں مسلمان ریاستوں کو فتح کیا تھا۔

اس بات سے تو کم ہی لوگ اختلاف کریں گے کہ اورنگ زیب مذہبی معاملات میں تنگ نظر تھا۔ یہ بھی طے ہے کہ مذہبی معاملات میں اس کی شخصیت دو نیم تھی۔ اس امر میں بھی شک نہیں کہ وہ نماز، روزے کا اور دیگر اسلامی فرائض کی ادائیگی کا پابند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک پارسا مسلمان تھا۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ وہ دربار میں نہایت زرق برق اور قیمتی جواہرات سے مزین طلائی ملبوس پہن کر آتا تھا۔ تصویر کا یہ دوسرا رخ تھا اس

MashalBooks.org

سے اس کی شخصیت کا تضاد ظاہر ہوتا ہے۔ یہ امر بھی تحریری طور پر ثابت ہے کہ اورنگ زیب نے بہت سے صوفیاء، جیسے لاہور کے حضرت میاں میر اور میرٹھ کے نواحی قصبہ رتول کے پیر کے یہاں حاضری کی اجازت طلب کی تو انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ وہ ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔ دراصل انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اورنگ زیب کے سماجی طور طریقے اسلام کے مقررہ سماجی طور طریقوں کے مطابق نہیں۔

جہاں تک شیعوں کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ ہے اس امر کو مغل دربار کے حوالے سے دیکھنا چاہیے جہاں امراء میں تورانی بھی تھے اور ایرانی بھی۔ دونوں مسلمان اور راجپوت بھی تھے۔ بیشتر ہندو اور ایرانی امراء کی موجودگی اس زمانے سے تھی، جب ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے جو تقریباً سبھی شیعہ تھے، تختِ حکومت پر دوبارہ قبضہ کیا تھا۔ تورانی امراء پیشتر سنی تھے جو بابر کے ساتھ آئے تھے اور وسطِ ایشیا سے جن کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، ایرانی اور تورانی امراء کے درمیان زبردست آویزش رہتی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ بڑے کٹر شیعہ یا بڑے پکے سنی تھے بلکہ دربار میں اعلیٰ تر منصب کے لیے اور ذاتی ترقی کے لیے، اورنگ زیب کے پیش رو اس بارے میں توازن رکھتے تھے۔ اورنگ زیب بعض اوقات اپنی نازیبا چالاکی کے باعث توازن رکھنے میں ناکام ہو جاتا اور اس کے فیصلے کا الٹا ردعمل ہوتا، اورنگ زیب میں اپنے پیش روؤں کی سی دوراندیشی نہیں تھی۔ تاہم اورنگ زیب نے اپنے ہندو معاونوں کو، جن میں راجپوت سردار اور راجپوت ریاستوں کے حاکم شامل تھے کبھی ناراض نہیں کیا۔ شیعوں میں بھی، وہ ان کے ایک حصے کو ساتھ ملا کر رکھتا تھا لیکن کچھ شیعہ عمائدین مثلاً اودھ کے قصبہ بلگرام کے شیعہ حاکم اورنگ زیب کی مخالفت کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ سید اور آنحضورﷺ کی آل سے تھے۔ بلگرام کے سیدوں کے خلاف اورنگ زیب نے جو اقدام کیے تھے، اس پر پشیمانی اس کے فارسی کے اس فقرے میں موجود ہے ''ساداتِ بلگرام چوں چوب مسجد، نہ سوختنی، نہ فروختنی، یعنی بلگرام کے سید مسجد کی لکڑی کی طرح ہیں کہ نہ انہیں چولہے میں جلایا جا سکتا ہے نہ بیچا جا سکتا ہے۔

اورنگ زیب نے اسلام سے اپنی شیفتگی کا ثبوت دینے کے لیے ایک دو مندر منہدم کیے۔ اپنی رعیت کی ایک بھاری تعداد کی خواہ مخواہ ناراض کرنا اس کی ایک غلط پالیسی تھی۔ تاہم اس کا حتمی ثبوت موجود ہے کہ اورنگ زیب نے مندروں کی دیکھ بھال اور

MashalBooks.org

مصارف کے لیے زمینیں دی تھیں۔ زمین کو ایسے عطیات کو معافی کہتے تھے۔ لہٰذا اس طرح کا فعل کہ بنارس کے آدھے مندر کو گرا دیا اور باقی آدھے حصے میں مسجد تعمیر کرا دی۔ یہ اسلام کی محبت کے لیے نہیں تھا یہ ایک مسخ شدہ ریاستی پالیسی تھی اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا ہے اورنگ زیب نے نئے مندر تعمیر کرائے تھے۔ مثال کے طور پر اس نے ایک جگہ چھتر کوٹ میں مندر بنوایا تھا۔ اورنگ زیب اس علاقے سے گزر رہا تھا تو پنڈتوں نے اس سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں ایک مندر چاہیے۔ بادشاہ نے فوری طور پر پچاس ہزار روپوں کی منظوری دی جو 250 سال قبل اس زمانے میں ایک گرانقدر رقم تھی۔ اس نے اپنے ماہر معماروں کو یہ حکم دیا کہ مندر کا ایک نادر نمونہ تیار کریں اور اسے جلد از جلد تعمیر کریں۔ آج کل کے پنڈت اورنگ زیب کے شاہی فرمان کو اب تک حفاظت سے رکھتے آئے ہیں۔

جہاں تک اورنگ زیب کی جانب سے شریعت کے قوانین کے نفاذ کا تعلق ہے، اس کے پیچھے ایک پوری تاریخ ہے۔ اورنگ زیب نے دکن کی شیعہ ریاستوں کو جو اس کے دائرہ اثر میں آتی تھیں اگرچہ اس کے ماتحت نہ تھیں، الٹی میٹم کے ساتھ یہ حکم دیا کہ اپنے یہاں شریعت کے قوانین نافذ کریں۔ اس ہدایت سے پانچ سال پہلے شریعت کو ریاست کا بنیادی قانون بنایا اور اس کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے فطری طور پر اورنگ زیب کے حسبِ توقع اس حکم کو ماننے اس کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے فطری طور پر اورنگ زیب کے حسب توقع اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان کے داخلی امور میں مداخلت قرار دیا۔ لہٰذا اورنگ زیب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ''اسلام کی سربلندی'' کی خاطر حملہ کر کے ان ریاستوں پر قبضہ کر لے۔ یہ جب ہو چکا تو شریعت کا نفاذ اورنگ زیب کی اپنی ریاستی حدود میں چند سال گزرنے کے بعد معطل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ شیعہ ریاستوں پر قبضہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اورنگ زیب کی زندگی کے ان واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتا تھا، اسلام کی خدمت اس کا مقصد نہ تھا۔

اورنگ زیب کی تنگ نظری کی ایک اور مثال ہے۔ شیواجی ایک مرہٹہ حملہ آور تھا جس نے طویل عرصے تک مغل فوج کو ناکوں چنے چبوائے لیکن آخر کار راجہ جے سنگھ نے جو اورنگ زیب کی فوج کا سپہ سالار تھا، فوجی مہم کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور شیواجی کو فیصلہ

MashalBooks.org

کن شکست دی۔ شیواجی نے جے سنگھ کے آگے اس شرط پر ہتھیار ڈالے تھے کہ اسے ایک باوقار منصب جو اس کی بہادری کے شایان ہوگا، عطا کیا جائے گا۔ بادشاہ کے روبرو ہر ایک کو سرخم کرنا پڑتا تھا۔ شیواجی نے درخواست کی کہ اسے اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ درخواست منظور ہوگئی۔ تاہم دربار میں اس کی حاضری ایک ایسے دروازے سے رکھی گئی تھی جو اس کی قامت کے حساب سے چھوٹا تھا تاکہ جھکنے سے مستثنیٰ قرار دینے کے لیے جو زبان دی گئی تھی اس سے گریز کیا جا سکے لیکن شیواجی بھی کچھ کم شاطر نہیں تھا وہ جھکا تو سہی لیکن پشت کی طرف۔ اس طرح بادشاہ کے آگے جھکنے سے اجتناب کیا۔ یہ اورنگ زیب کی چالاکی کے مقابلے میں اس سے بڑی عیاری تھی۔ اب جو شیواجی دربار میں آ ہی گیا تھا تو ضرورت یہ تھی کہ پچھلے زخم مندمل کیے جائیں۔ مفاہمت پیدا کی جائے اور اسلام کی رو سے تالیفِ قلب کا اہتمام ہو لیکن اورنگ زیب نے شیواجی کی اہانت کے لیے اس سے بہت کم حیثیت دی جس کا تقاضہ تھا۔ شیواجی نے اسے اپنی تذلیل سمجھا۔ بھاگ کر پونا واپس پہنچا اور گوریلا جنگ شروع کر دی۔ شیواجی کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے شمساجھی نے جنگ جاری رکھی۔ اس کے نہایت دور رس اثرات مغل سلطنت کی کمزوری اور بالآخر اس کے خاتمے پر منتج ہوئے۔

مغلیہ دور میں بنگال کے مغل علاقے جو صوبہ بنگال کے مشرق میں واقع تھا، بھاری اکثریتی آبادی ہندوؤں کی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورانِ حکومت میں یہ مسلمانوں کا اکثریتی صوبہ بن گیا۔ یہ تبدیلی اس لیے رونما ہوئی کہ علماء اور صوفیاء نے جن کا تعلق جو جونپور سے تھا، اسلام کے سماجی نظام اور اس کی روحانی اور اخلاقی توانائی کو ہندو آبادی کے سامنے پیش کیا۔ ایک اور مثال ہندوستان کے انتہائی جنوب میں واقع مالا بار ساحل کے موپلوں کی ہے۔ عرب تاجر اور صوفیاء وہاں برابر جایا کرتے تھے، ان کے کردار نے مقامی آبادی کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اسلام قبول کرنے لگے۔ بہت سے سرکردہ لوگ عرب تاجروں کے ساتھ جنہیں وہ مہاپلا کہتے تھے، اپنی بیٹیوں کو شادی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس مہاپلا سے موپلا بنا ہے۔ ہندوستانی ثقافت پر اسلام کا اثر نامی کتاب کے مصنف ڈاکٹر تارا چند نے تاجر اور صوفیاء کے ان طبقوں کے اثرات کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ ایک وقت میں یہ مسلمانوں کی اکثریتی آبادی کا علاقہ تھا۔ جب آس پاس کے ملیالم

MashalBooks.org

بولنے والے غیر مسلم نقل مکانی کر کے یہاں آئے تو مسلمان اقلیت میں ہو گئے اس کے باوجود اسلام کا اثر مستحکم اور نہایت گہرا تھا۔

ہندوستان میں صرف سید علی ہجویری داتا گنج بخش، معین الدین چشتی اور نظام الدین اولیاء جیسے صوفیاء نے اپنے کردار کی طاقت اور تمام انسانوں کے ساتھ احترام کے سلوک اور نچلے طبقے کے اچھوتوں اور پست ذات کے لوگوں کے ساتھ مساوی احترام کی بدولت اسلام پھیلایا۔ ان صوفیوں کی خانقاہ میں اچھوتوں کا بھی خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ البتہ دوسرے مسلمان ان کے ساتھ اس حقارت سے ملتے تھے جیسے اونچے طبقے کے ہندو ملتے تھے۔

اورنگ زیب کی پالیسیوں نے سلطنت کے بہت سے علاقوں میں خاص طور پر دور افتادہ مقامات پر بے چینی پیدا کی۔ اس زمانے میں بھی خوشحالی کا انحصار حکمران کی دور اندیشی اور اس کی پالیسیوں، خاص طور پر اقتصادی پالیسیوں پر ہوتا تھا۔ ان کی حکمتِ عملی کے نتیجے میں تجارت، زراعت اور جو بھی صنعت تھی، اس کی یا تو حوصلہ افزائی ہوتی یا حوصلہ شکنی۔

خوشحال خان خٹک اس کی ایک مثال تھے۔ ان کی بغاوت نے ایک عرصے تک بین الاقوامی تجارت میں رخنہ ڈالے رکھا تھا۔ خوشحال خاں کی بغاوت اس وقت شروع ہوئی جب افلاس اور محرومی ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب نے اپنی رعایا کی جائز مشکلات اور مسائل کو سمجھنے کی بجائے ان کے عمل کو گستاخی پر محمول کیا اور ان کے اضطراب کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ اس کے 49 سالہ عرصہ حکومت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بات چیت کے ذریعے کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی ہو۔ مثال کے طور پر پنجاب کے کسان اور ان میں زیادہ تر سکھ جاٹ بجا طور پر معاشی مشکلات کا شکار تھے، ان میں سے ایک مسئلہ بھی محصول کا تھا۔ ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اکبر سے شاہجہان تک، اپنے پیش روؤں کے برعکس جو اپنی رعایا کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرتے تھے، اورنگ زیب ان کی مشکلات سے لاتعلق رہا۔ جب مسائل جمع ہونے لگے تو پنجاب میں بے چینی شروع ہوئی۔ اس کا کوئی حل نہ تھا۔ لہٰذا یہ سکھوں کی شورش بن گئی۔ خٹک کی بغاوت سے الگ جو صرف پشاور کی داری تک محدود رہی، سکھوں کی بغاوت پورے وسطی

اور مشرقی پنجاب میں پھیل گئی۔ جسے آسانی سے دبانا ممکن نہ رہا۔ بدقسمتی یہ کہ اس کی غلط توجیہہ کی گئی اور اسے ایک مذہبی بغاوت کہا گیا حالانکہ وہ اپنی نوعیت میں اس طرح کی تھی جیسی خوشحال خاں خٹک کی بغاوت تھی جو ایک مسلمان تھے یا جہانگیر کے دور میں دلا بھٹی کی بغاوت جو مسلمان تھے۔ ممکن تھا کہ اورنگ زیب سکھوں کی بغاوت کو دبانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن یہ ممکن نہ ہوا کیونکہ معاشی مسائل تو بدستور موجود تھے۔ سکھوں کی بغاوت 1713ء اور 1719ء کے دوران میں جب فرخ سیئر حکمران تھا، کامیاب ہوگئی اس لیے کہ سلطنت اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ کچھ کرنا اس کے بس میں نہ رہا تھا۔

دوسری شورشوں کا معاملہ بھی کچھ اس طرح کا تھا۔ مرہٹوں کی بغاوت کو قابو میں کیا جا سکتا تھا اگر اورنگ زیب ہوشیاری سے کام لیتا۔ جے سنگھ جب شیوا جی کو بات چیت کے لئے آمادہ کر کے لایا تو یہ مسئلہ عملاً حل ہوسکتا تھا لیکن اورنگ زیب کے بے جا غرور اور شیواجی کی اہانت نے پھر اسے آمادہ کر دیا کہ پہاڑیوں میں واپس چلا جائے اور چھاپہ مار جنگ شروع کر دے اور یہ بھی مسلمانوں کی حکومت کے خلاف ہندوؤں کی بغاوت نہیں تھی۔ یہ بھی سماجی اور معاشی محرومیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر شریک ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیواجی نے بار بار اورنگ زیب کو فارسی میں خطوط ارسال کئے جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسائل کے حل کی جانب اس کا رویہ اسلامی نہیں اور اس بات پر زور دیا کہ مسائل کو اسلامی احکام کی روشنی میں خوش اسلوبی سے حل کیا جائے اور ان میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر لکھا ہے۔ پوری سلطنت میں ایسے بہت سے چھوٹے اور بڑے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ افسوس کسی مسلمان ہندوستانی مورخ نے اس پر ایک لفظ نہیں لکھا۔ یہی زمانہ تھا جب پرتگال کے بحری قزاق بنگال کے ساحل پر بہت سرگرم ہو گئے جس سے برما اور ملایا سے تجارت متاثر ہونے لگی اور ساتھ ہی سورت اور ٹھٹہ کی مغل بندرگاہوں سے خلیج فارس اور یمن کو جو تجارت ہوتی تھی، اس پر بھی برا اثر پڑا۔

یہی وہ حالات تھے جن میں اورنگ زیب نے دکن کی مسلمان ریاستوں کے خلاف فوج لے کر چڑھائی کی۔ ہر ایک جنگ میں، خاص طور پر حملے کی صورت میں وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی فوج درکار ہوتی ہے جس کے اندر جذبہ ہو یا وہ کم از کم ہر طرح مطمئن ہو۔ اسے قوم کی حمایت حاصل ہو بالخصوص بادشاہ کے عمائدین اور درباری اس

MashalBooks.org

کے مکمل تابع ہوں۔ اس وقت معیشت بہت اچھے حال میں نہیں تھی، فوج کی کسی مقصد سے گہری وابستگی نہیں تھی اور سپاہی کے فوج میں صرف پیسے کے لیے شامل ہوئے تھے، قوم کو صرف اپنی روزانہ کی گزر اوقات سے دلچسپی تھی، درباری اور عمائدین کے درمیان تفرقہ تھا، یہی افتراق شہزادوں کے درمیان بھی تھا۔ چونکہ اورنگ زیب اپنے عمائدین اور جرنیلوں میں یقین اور اعتماد پیدا نہ کر سکا اس لیے وہ ان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا 65 سالہ بڑھاپے میں اسے فوج کی سالاری خود کرنا پڑی۔ دکن کی مہمات میں اور ہندو مرہٹوں کے خلاف اور مسلمان ریاستوں سے جنگ میں وہ خود ایک جنگ آزما تھا۔ 25 سال تک وہ ان لڑائیوں میں پھنسا رہا۔ بالآخر دکن میں اس نے انتقال کیا اور اٹھا واڑ میں اسے سپرد خاک کیا گیا۔ بعد میں اس جگہ کا نام اورنگ آباد رکھا گیا۔

وقت گزرتا گیا، امن عامہ کا حال خراب ہوتا گیا، معیشت کی صورت بگڑتی گئی، سکھوں کی شورش کی وجہ سے پنجاب سے لگان اور محصولات کی وصولی بہت کم رہ گئی۔ مرہٹوں کی بغاوت کے باعث مالوہ میں بھی یہی ہوا۔ سلطنت کے دوسرے علاقوں میں بھی حالانکہ ان میں کوئی ہنگامی صورت نہ تھی اندوہناک معاشی حالات کے باعث صورتحال کچھ بہتر نہ تھی۔ حکمران دکن کی جنگ میں بری طرح پھنس کر رہ گیا تھا، اسے بنگال سے لگان اور محصولات کی آمدنی کے لیے مہینوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ ایک ہی صوبہ تھا جہاں کچھ اقتصادی سرگرمیاں جاری تھیں اور وہیں سے سپاہیوں کو تنخواہ دی جاتی تھی۔ دنیا کی تین بڑی سلطنتوں میں سے ایک بڑی سلطنت کا حکمران اپنی مایوس اور دل شکستہ فوج کو اگر تنخواہ بھی نہ دے سکے تو واقعی یہ بڑی دردناک صورت رہی ہوگی۔

اورنگ زیب دنیا سے چلا گیا۔ اس نے اپنے بعد ایک ایسی سلطنت چھوڑی جو مایوس، دل شکستہ اور بے نیل و مرام تھی اور اس کا والی کوئی نہ تھا۔ امن عامہ کا حال بدتر تھا اور ان بہت سے سپاہیوں نے جنہیں تنخواہیں نہیں ملی تھیں، ڈاکہ زنی شروع کر دی تھی۔ معاشی سرگرمیاں رک گئی تھیں اور بین الاقوامی تجارت جو وسطِ ایشیا اور ایران کے ساتھ ہو رہی تھی، اب وہ بھی بہت کم رہ گئی۔ یورپ کے ساتھ تجارت کی آمدنی صرف بندرگاہوں کے قریبی علاقوں تک رہ گئی تھی۔ زیادو دور تک نہیں تھی۔ مقامی تجارت پر جبری وصولی کرنے والوں اور بھتہ خوروں کا تسلط تھا۔ ان میں سرِ راہ لٹیرے، بے خانماں کسان حتیٰ کہ

وہ عمائدین بھی شامل تھے جن کے علاقے سے تجارت کا قافلہ گزرتا تھا۔ ایسے افراد کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی، نظم ونسق برائے نام رہ گیا تھا۔ اس حقیقت کے باوصف کہ اورنگ زیب نے ایک مطلق العنان بادشاہ کے طور پر اتنے بڑے علاقے پر حکمرانی کی، جو اکبر سے شاہجہان تک اس کے کسی اور پیش رو کو نہیں ملا تھا لیکن ملک اب انتشار کا شکار تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کے پچاس برس بعد پلاسی میں جو کلکتہ سے زیادہ دور نہ تھا، بنگال کے مغل گورنر اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی، برطانیہ جو ہزاروں میل دور تھا اور غالباً مغل سلطنت کے بیشتر چھوٹے صوبوں سے بھی چھوٹا تھا۔ 1757ء کی وہ جنگ کوئی معمولی جنگ نہ تھی۔ یہ ہر اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ مغل گورنر کی فوج تو اپنی سرزمین پر جنگ لڑ رہی تھی اور اس کے پیشِ نظر ایک بڑا مقصد بھی رہا ہو گا یعنی اپنی مٹی کی حفاظت۔ انگریزی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی تھے۔ انگریز افسر اور انگریز سپاہی جو نسبتاً کم تھے، ایک غیر ملک میں لڑائی لڑ رہے تھے۔ وہ اذیت ناک بحری سفر کر کے چھوٹے چھوٹے جہازوں میں آئے تھے۔ یہ وہ حقائق تھے جنہوں نے 1757ء کی جنگ پلاسی کو بہت اہم بنا دیا تھا۔ مزید اس کی اہمیت یوں بھی تھی کہ کمپنی کی فوج میں بارہ سو سپاہی تھے، تین سو انگریز اور نو سو ہندوستانی۔ جنہوں نے مغل گورنر کی دس ہزار سے زیادہ سپاہیوں کی فوج کو زیر کر لیا۔

1757ء میں عالمگیر دوئم دہلی کے مغلیہ تخت پر براجمان تھا، وہ اورنگ زیب کا پڑپوتا تھا۔ انگریزی فوج مختصر سی تھی لیکن نہایت چوکس، پھرتیلی اور اعلیٰ تربیت یافتہ، اس نے ایک بادشاہ کے مغل گورنر کی خاصی بڑی فوج کو آدھے دن سے بھی کم وقت میں شکست دے دی، لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ انگریزی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی تھے جو انگریز افسروں کے ماتحت تھے۔ اس جنگ کے بعد کمپنی نے مغل حکمرانوں کے نام کے تحت بنگال پر حکومت شروع کی جو انتہائی زرخیز اور آمدنی کے لحاظ سے مغلوں کا سب سے زیادہ نفع بخش صوبہ تھا۔ کمپنی کو بنگال کے ساتھ مشرق میں آسام اور تری پورہ، بہار، یوپی کا کچھ مشرقی علاقہ اور مغرب کی طرف اڑیسہ اور بنگال کے جنوب مغرب کے علاقے مل گئے، اس کے بعد سے انگریز باقاعدہ پیش قدمی اور ہندوستانی پسپائی اختیار کرتے چلے گئے لیکن یہ

MashalBooks.org

سوال فطری طور پر ضرور پیدا ہوگا کہ ایک چارٹرڈ کمپنی کس طرح مغل سلطنت میں تاریخی واقعات پر اثر انداز ہوئی۔

واسکوڈی گاما نے جو ایک پرتگالی تھا، جنوبی ہند میں مالا بار کے ساحل پر اس وقت حملہ کیا جب سات سو سال پہلے بابر نامی ترک 1505ء میں ہندوستان کے شمال مغرب سے حملے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ بابر کی اصل فتح یابی کو بیس سال لگ گئے۔ واسکوڈی گاما ہر اعتبار سے ہندوستان کا ایک منفرد حملہ آور تھا، حالانکہ برابر کے مقابلے میں اس کی فتوحات عشر عشیر تھیں۔ وہ تاریخ میں پہلا شخص تھا جس نے براعظم افریقہ کے انتہائی جنوب سے بحری سفر کا راستہ نکالا تھا۔ افریقہ کو اس سے پہلے دریافت نہیں کیا گیا تھا۔ انتہائی جنوب میں واقع اس بحری گزرگاہ کو بعد میں اور بجا طور پر کیپ آف گڈ ہوپ (نیک امیدوں کی گزرگاہ) کا نام دیا گیا۔ مغرب کی نئی ابھرتی ہوئی قوموں کو اس نے امید کی راہ دکھائی جن میں متمول تجارت کو فروغ دینے کے لئے بھرپور توانائی موجود تھی۔ بابر اور واسکوڈی گاما دونوں ہندوستان ایک ہی مقصد لے کر آئے تھے۔ یہاں کی بے اندازہ دولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس کی داستانیں مشہور تھیں اور دونوں اپنے اپنے افلاس زدہ ملکوں سے آئے تھے۔ بابر پہاڑوں سے اتر کر آیا تھا وہ قبائلی افغانستان کا نادار زراعتی علاقہ تھا۔ واسکوڈی گاما پرتگال سے آیا تھا جہاں وسیع قطعات اراضی کے مالکوں کا تسلط تھا جہاں کسان مزدوروں کا حال غلاموں سے ذرا سا ہی بہتر تھا۔ بابر کے افغانی ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد اور سرکش تھے۔ دریائے سندھ کے متمول علاقوں سے لوٹ کا مال سمیٹنے کے بعد جونہی انہیں فراغت ملتی، وہ آپس میں لڑنے لگتے۔

بابر اور واسکوڈی گاما دونوں ایک ہی مقصد لے کر ہندوستان آئے تھے اور دونوں جدید ٹیکنالوجی کو متعارف کرانے والوں میں اول تھے۔ دراصل جنگی ہتھیاروں کی صورت میں اگرچہ تاریخی طور پر ان دونوں فاتحین کے آنے میں بڑا فرق تھا۔ بابر نے ہندوستان پر حملہ کرنے والے پہلے فاتحین کا روایتی راستہ یعنی درہ خیر کا راستہ اختیار کیا اور روایتی طرز کی سواری اختیار کی یعنی گھوڑے ساتھ رکھے، لیکن واسکوڈی گاما بادبانی جہاز سے سمندر کے راستے آیا جبکہ اس سے پہلے کسی اور نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اسے واسکوڈی گاما نے ہی دریافت کیا تھا۔ مغرب سے پہلی بار ایک حملہ آور سمندر پار کر کے آیا تھا، اس نے مشرق

شمال یا جنوب سے حملہ نہیں کیا تھا۔ واسکوڈی گاما اس اعتبار سے بھی ایک پہل کار تھا کہ دوسری یورپی قوموں کے تاجروں کو اس نے راستہ دکھا دیا تھا۔ ان میں سے یعنی انگریزوں نے بعد میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی طرز زندگی کو مستقلاً بدل دیا اور ہندوستانی تاریخ کی راہ بھی تبدیل کر دی۔ انگریز ہندوستان میں ایک صدی بعد 1612ء میں آئے۔

لندن میں سینٹ جیمز کے دربار سے سرتھامس رو نے جو برطانوی سفیر خاص تھا، ایک عاجزانہ درخواست اجمیر میں 1612ء میں بابر کے پڑپوتے شہنشاہ جہانگیر کو انگلینڈ کے بادشاہ جیمز کی جانب سے پیش کی۔ انگریز ان دنوں مغل کو موجر (Mojor) کہتے تھے، درخواست میں جہانگیر سے مودبانہ گزارش کی گئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو انگریز تاجروں کی ایک کمپنی تھی، سورت میں جو مغل سلطنت کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ بندرگاہ تھی، فیکٹریاں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس زمانے میں فیکٹری کے معنی گودام تھے۔ پاکستان اور ہندوستانی کتب میں اس کو بجا طور پر ایک اہم موقع لکھا گیا ہے کیونکہ یہیں سے یورپ کی ایک نہایت اہم پہلو کو بھول جاتے ہیں۔ ہندوستانی کی محکومی کی ابتدا ہوئی لیکن وہ اس واقعہ کے انتہائی اہم پہلو کو بھول جاتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار اور دنیا کی تاریخ میں تیسری بار تاجروں کی ایک کمپنی جو محض الگ الگ تاجروں کا ٹولہ نہیں تھی، اپنا تجارت کا مال لے کر اور شکستہ بادبانی جہازوں پر سوار ہو کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں آ رہی تھی۔

1552ء کے آس پاس جب جہانگیر کا باپ اکبر نو سال کا تھا اور 13 سالہ شہنشاہ اکبر کے برسر حکومت آنے کے چار سال بعد 1556ء میں کچھ متمول انگریز تاجر لندن میں اکٹھے ہوئے تا کہ ان میں سے بعض کے پیش کردہ اس مشورے پر غور و بحث کریں کہ ڈچی آف مسکووی (Duchy of Muscovy) میں تجارت کے لیے کمپنی بنائی جائے یہ ایک بہت بڑی منڈی ہے جہاں اب تک کوئی نہیں پہنچا۔ دراصل کوئی تاجر اتنا دولت مند نہیں تھا کہ اس دور افتادہ مقام تک تجارت کی غرض سے جائے۔ لہٰذا خیال یہ تھا کہ سب اپنے اپنے وسائل یکجا کریں اور ایک کمان کے تحت جب ایک بڑا سرمایہ جمع ہو جائے تو ایک تجارتی معاشرت (Corporate Culture) کی ابتدا کریں۔ ڈچی آف مسکووی بعد کے عشروں

میں ماسکو کے نام سے موسوم ہوئی۔ آپس کی اس مشاورت کے نتیجے میں مسکووی بعد کے عشروں میں ماسکو کے نام سے موسوم ہوئی۔ آپس کی اس مشاورت کے نتیجے میں مسکووی کمپنی بن گئی جو دنیا کی پہلی جوائنٹ سٹاک کمپنی تھی اگرچہ اس زمانے میں اسے چارٹرڈ کمپنی کہا جاتا تھا۔ چارٹر سے مراد اجازت نامہ تھا جو بادشاہ عطا کرتا تھا۔ اس کے لیے پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا تھا اس کے فوری بعد لبنان اور نواحی علاقوں میں جسے اب مشرقِ وسطیٰ کہتے ہیں، تجارت کی خاطر لیونٹ کمپنی قائم ہوگئی۔ ان علاقوں پر ترکی کے عثمانی خلفاء حکومت کرتے تھے۔

سولہویں صدی کے آخر تک متمول ہندوستان کے ساتھ نفع بخش تجارت کی حیران کن کہانیاں سارے مغربی یورپ میں گردش کر رہی تھیں۔ یہ علاقہ نشاۃ ثانیہ کی گہما گہمی سے گزر رہا تھا۔ انگریز تاجروں کو اس وقت تک ساتھ مل کر چارٹرڈ کمپنی میں کام کرنے کا خاصہ تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ تھا وہ پسِ منظر جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی گئی۔ انگلش پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کیا گیا اور ملکہ الزبتھ اول نے 1600 میں ایک میثاق کی منظوری دے کر ''آنریبل کمپنی آف لندن مرچنٹس'' کو ہندوستان میں تجارت کی اجازت دے دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے مغل بادشاہ کی درخواست پیش کرنے کے لیے سر تھامس رو کا انتخاب کیا تاکہ مغل فرماں روا ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت کرنے کی اجازت دے دیں۔ سر تھامس کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ وہ ترکی زبان جانتے تھے۔ مغلیہ شاہی خاندان کے افراد اپنے درمیان ترکی میں ہی بات چیت کرتے تھے اور اس پر 1750ء تک عامل رہے حالانکہ دربار کی زبان فارسی تھی اس بارے میں خاصی مطبوعات موجود ہیں کہ یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے کتنی معلومات پائی جاتی تھیں۔ بصورتِ دیگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر ایک ایسے شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجنے پر اصرار کیوں کرتے، جو ہندوستان میں شاہی خاندان کی بول چال کو سمجھتا تھا۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ شاہی خاندان کی زبان سے واقف تھے۔ ہندوستان کے بارے میں معلومات ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے معمولی تاریخی اہمیت رکھتی تھی۔ کاروباری لین دین کی زبان میں وہ مارکیٹنگ کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے اور یہ کوئی اتنی سہل بات نہیں تھی جیسا کہ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ معمولی انگریز تاجر تجارت کے لیے آئے اور انہوں

نے چالبازی، دھوکے اور سازش سے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ تاجر تو وہ تھے لیکن معمولی تاجر نہیں تھے۔ تجارت اور کاروبار کا ایک نہایت نفیس اور شائستہ کلچر جو جدید ترین اور مثالی تھا، انہوں نے سالہا سال کے تجربے سے حاصل کیا تھا۔

یہ تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کا پسِ منظر اور اس کی سماجی، اقتصادی اور تاریخی اہمیت۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سترہویں صدی کے آخری عشرے میں اپنی فیکٹریوں کی حفاظت کے لئے ہندوستان میں چوکیدار بھرتی کرنے شروع کئے، ان کا تقرر پہلے سورت میں، اس کے بعد مدراس میں اور آخر میں بمبئی میں کیا۔ سترہویں صدی کے آخری عشروں میں برطانوی بادشاہ کے ساتھ پرتگال کی شہزادی کی شادی کے نتیجے میں بمبئی میں آ گیا تھا۔ جب سیاسی حالات مزید خراب ہونے لگے تو چوکیداروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور کمپنی نے انہیں مسلح کر کے فوجی سپاہیوں کی طرح تربیت دینا شروع کی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو کمپنی انگریز افسروں کو لائی۔ انگریز سپاہیوں کا ایک مختصر دستہ رکھا اور زیادہ اسلحہ منگوایا جس میں توپیں بھی تھیں اور محاصرہ شکن بندوقیں بھی۔ انہوں نے ہندوستانی پہرہ داروں کو میدانِ جنگ میں لڑنے کی تربیت دینا شروع کی تا کہ جنگجو سرداروں سے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے جو اس وقت تک عام مجرموں اور لٹیروں، اوباشوں کی جگہ لے چکے تھے، انہوں نے اپنی فوجیں بنانے بھی شروع کر دی تھیں۔

جب مغل سلطنت پارہ پارہ ہونے لگی تو اس کے جنوبی صوبے خودمختار ہونے لگے اور دہلی سے ان کی وفاداری اس حد تک رہ گئی کہ وہ بادشاہ سے اپنے اپنے صوبے میں عمل داری کا فرمان حاصل کرنے لگے۔ اس کے لیے وہ چند ہزار طلائی اشرفی نذرانے کے طور پر اپنے تقرر کی درخواست کے ساتھ بھیجتے تھے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب جنگجو سرداروں نے عملاً علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کیا اور کمپنی کو اس بڑھتی ہوئی بدامنی اور نراجیت کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی حکمتِ عملی کے بارے میں سوچنا پڑا۔ حکمتِ عملی یہ طے پائی کہ ان میں جو زیادہ طاقتور سردار ہیں، ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ جب بدامنی اور زیادہ بڑھ گئی تو کمپنی نے زیادہ طاقتور سرداروں کو اپنی فوج کی خدمات فروخت کرنا شروع کیں جو کمپنی کے گاہک، دوسرے لفظوں میں ان کے پٹھو بن گئے۔ اس بنیاد پر کہ میں تمہاری پیٹھ پر تھپکوں گا، تم ہمار پیٹھ تھپکتے رہو۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب زیادہ سے زیادہ سپاہیوں کی بھرتی شروع ہوئی اور انگریز

افسر انہیں تربت دینے لگے اور پھر انگلینڈ سے جتنے زیادہ سپاہی لائے جا سکتے تھے، لائے گئے۔ اب انگریز افسروں پر زیادہ بھروسہ کیا جاتا تھا۔

پہلے جب نادرشاہ نے دہلی کو تاراج کیا اس کے بعد نظام کے دو بیٹوں میں تخت نشینی کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔ نظام دکن میں مغل بادشاہ کا محض برائے نام گورنر، لیکن عملاً حکمران تھا اس کے ایک بیٹے نے مدراس میں متعین ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی فوج سے مدد حاصل کی جس کا سربراہ لارڈ کلائیو تھا۔ دوسرے بیٹے نے فرانسیسی کمپنی کی فوج سے مدد لی جو پانڈیچری میں متعین تھی اس کا سربراہ ڈپلے تھا۔ مدراس اور پانڈیچری دونوں تامل بولنے والے علاقے میں واقع تھے۔ انگریزی کمپنی کی فوج کی طرح فرانسیسی کمپنی کی فوج میں بھی زیادہ تر ہندوستانی سپاہی اور یورپی افسر تھے۔

وہ بیٹا جس کی مدد ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے کی، جیت گیا اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ فائدہ ہوا کہ اس نے زیادہ سے زیادہ تجارتی مراعات حاصل کر لیں اور اس کی سیاسی ساکھ بھی بن گئی۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی جنوبی ہند کے بیشتر علاقوں میں اپنی حریف فرانسیسی کمپنی سے آگے نکل گئی۔

اس حکمتِ عملی کا انجام یہ ہوا کہ نہایت اہم شہروں اور علاقوں پر کمپنی کا قبضہ اور اس کا نظم ونسق پھیلتا گیا اور دہلی کے مغل فرمانروا کا نام اور اقتدار محض برائے نام رہ گیا۔ کمپنی کی فیکٹریاں جنوب اور جنوب مغرب میں تھیں، جن کے مراکز مدراس اور بمبئی میں تھے۔ مشرق میں اس کا مرکز تھا۔ اس کی تجارتی چھاؤنیاں سارے ہندوستان میں تھیں، ان علاقوں میں بھی، جو اب پاکستان میں شامل ہیں، کمپنی درآمد اور برآمد دونوں طرح کی تجارت کرتی تھی۔ مثال کے طور پر جب تک انگریز کی اپنی سوتی ملوں میں کپڑا بننا شروع نہیں ہوا تھا، جس کی تعمیر صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہوئی۔ اس وقت تک کمپنی ہندوستان سے کپڑا برآمد کرتی تھی اس کی منڈی صرف برطانیہ نہیں بلکہ سارا مغربی یورپ تھا۔ وہ دیگر اشیاء جو ہندوستان سے برآمد ہوتی تھیں، ان میں نیل، چائے، پوٹاشیم، کپاس، گرم مسالے اور درجنوں اشیائے صرف شامل تھیں۔

کمپنی ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی سپاہی بھرتی کرتی تھی۔ پاکستان میں ایسی فوجی رجمنٹ موجود ہیں، جو بڑے فخر سے اپنی تاریخ کا سلسلہ اس عہد آفریں

زمانے سے ملاتے ہیں۔ 1950ء کے عشرے میں جب پنجاب رجمنٹ نے ایک خاص تقریب کا جشن منایا تو اس کے کارناموں پر مبنی ایک کتابچہ شائع کیا گیا تھا۔ کتابچے میں لکھا تھا کہ پنجاب رجمنٹ سرنگا پٹم کی شکست کے ساتھ پیدا ہوئی۔ یہی زمانہ تھا جب اس کی تشکیل ہوئی۔ انتہا درجے کی لاقانونیت کے زمانے میں پرامن پیشوں سے روزی کمانا دشوار ہو گیا تھا، بہت سے لوگوں کو جنگجو سرداروں کے مسلح لشکروں میں شامل ہونا پڑتا تھا، جس کے لیے کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی بس مالِ غنیمت کا وعدہ ہوتا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ کرائے کے سپاہی بن گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے یہ حالات مثالی نوعیت کے تھے اس طرح وہ ہندوستان میں کسی بھی جگہ سے موزوں ترین افراد بھرتی کر سکتے تھے کیونکہ کمپنی باقاعدہ تنخواہ اور بہترین شرائط پر ملازم رکھتی تھی۔ ان دنوں بادشاہ تو کیا کوئی جنگجو سردار بھی ایک مستقل اور باقاعدہ تربیت یافتہ فوج رکھنے کا متحمل نہ تھا جس طرح کمپنی رکھتی تھی۔ اس طرح کلائیو کی فوج نے پلاسی میں جنگ کی، یالارڈ ولزلی کی فوج نے میسور فتح کیا اور آئندہ زمانے میں کمپنی کی فوجوں نے رفتہ رفتہ پورا ہندوستان فتح کر لیا۔ وہ ایک غیر ملکی حملہ آور کی فوج نہیں لگتی تھی، حالانکہ تھی۔

1757ء میں پلاسی میں اور 1764ء میں بکسر میں پہلے موقع پر مغل گورنر کی بھاری فوج نے اور دوسرے موقع پر خود مغل بادشاہ کی افواج نے کمپنی کی چھوٹی سی فوج سے شکست کھائی۔ دوپہر ہونے سے پہلے آدھے دن کے اندر ہی ان کا کام تمام ہو گیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی ہندو اور مسلمان دونوں اسے غداری قرار دیتے ہیں۔

یہ 1740ء کے عشرے کا ذکر ہے جب دہلی کے مغل دربار میں دکن کے دو گورا صاحب لوگوں کی سرگرمیوں کی خبریں پہنچنے لگیں ان میں ایک کلائیو تھا۔ انگریزی کمپنی کا سربراہ جس کا صدر مقام مدراس تھا اور دوسرا ڈپلے، فرانسیسی کمپنی کا سربراہ، جس کا صدر دفتر پائڈیچری میں تھا۔ اس سلسلے میں تفصیلات نہ مل سکیں اور کسی نے یہ جاننے کی ضرورت سمجھی کہ وہ دونوں گورے مقامی عناصر کی مدد سے ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے کیوں لڑ رہے ہیں۔ کلائیو کے گاہک جب حیدرآباد میں بالادست ہو گئے تو دکن میں انگریزوں کا پل بھاری ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب لفظ ''صاحب'' کے معنی ''گورا'' ہوتا تھا۔ پہلے تو فرانسیسی بالادست ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے 1846ء میں مدراس کو بھی فتح

کر لیا تھا اور ڈپلے نے 1849ء میں کرناٹک پر قبضہ کر لیا تھا لیکن آخری مرحلے میں 1850ء میں اراکاٹ کو فتح کر کے انگریزوں نے گویا فرانسیسیوں کی تقدیر پر ناکامی کی مہر لگا دی۔ فرانس پر آخری ضرب 1760ء میں جنرل سر آئر نے لگائی۔ حقیقتاً یہ بچوں کا کھیل تھا۔ اب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں پورا دکن آ گیا تھا۔ عملاً ان علاقوں پر اسی کی عملداری تھی۔ تا آنکہ حیدر علی نے میسور پر بالادستی حاصل کی جہاں کا ہندو راجہ محض برائے نام وہاں کا حکم تھا۔ بہرحال کرناٹک پر حیدر علی کے قبضے کے ایک ہی سال بعد 1781ء میں آئرکوٹ کے ہاتھوں اسے شکست ہو گئی اور اس کی فتح مندی کا زمانہ رخصت ہو گیا۔ بہرحال مغل دربار میں گورا صاحب کی موجودگی کو پہلی بار نہایت سنجیدگی سے اس وقت محسوس کیا گیا جب اس کے ایک چھوٹے دستے نے جس میں تین سو انگریز اور سات سو ہندوستانی سپاہی تھے، مدراس سے پیش قدمی کی اور اڑیسہ سے گزر کر بنگال میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے جنوب میں اس نے اپنی فوجی حیثیت مستحکم کر لی تھی۔ بنگال کے مغل گورنر 24 سالہ سراج الدولہ کو جو ایک نوجوان، ناتجربہ کار اور خود پسند شخص تھا، پلاسی کی جنگ میں شکست ہوئی۔ کلائیو کامیاب رہا اس طرح اس نے پورے بنگال، اڑیسہ، آسام اور بہار کو انگریزی عملداری میں لے لیا۔ اپنی اس جارحیت کو قانونی حیثیت دینے کے لیے اس نے مغل دربار سے لگان کی وصولی کا فرمان جو محض رسمی کارروائی تھی، حاصل کر لیا۔ مغل بادشاہ اجازت دے کر خوش ہوا کیونکہ اس طرح اسے چند ہزار طلائی سکے مل رہے تھے ورنہ پہلے پہلے تو اسے گورنر سے کچھ نہیں مل رہا تھا۔

کلائیو نے 1757ء میں جو علاقے فتح کیے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے امنِ عامہ کے معاملات وہاں پہلے ہی اپنے اختیار میں لے لئے تھے اور عام لوگوں کی زندگیاں محفوظ ہو گئی تھیں۔ دہلی دربار کے فرمان نے لگان کی وصولی کا قانونی اختیار بھی دے دیا تھا۔ کمپنی کے حکام جبری وصولیاں بھی کرتے تھے۔ تاہم سکون کا جو زمانہ انہیں مل گیا تھا، غنیمت تھا کیونکہ بہت سے جابر بھتہ خوروں کی جگہ اب صرف ایک جابر بھتہ خور آ گیا تھا لیکن اس سے بھی سوا وہ زندگی کی حفاظت، عزت اور مال و اسباب کے تحفظ کی ضمانت دیتا تھا۔ ہندوستانی اس کے بالکل برعکس کرتے تھے۔ کمپنی کی حکومت کو مارواڑی ہندو تاجروں اور سود پر ادھار رقم دینے والے ساہوکاروں نے خاص طور پر پسند کیا۔ جنہیں بڑے بڑے عمائدین، یہاں تک

کہ بنگال کے گورنر کو بھی قرض دینا پڑتا تھا جن کی وصولی کبھی نہ ہوتی اور کبھی ہوتی بھی تو جزوی طور پر۔ کمپنی کے ماتحت علاقوں میں جہاں امن و امان کا دور دورہ تھا، تجارت اور زراعت دونوں پھولنے پھلنے لگیں۔ آسودہ حال لوگ بہت خوش تھے اور مفلسوں کو بھی قدرے سکون میسر آ گیا تھا کیونکہ بہت سے جبری بھتہ خوروں کی جگہ صرف ایک نے لے لی تھی اور وہ تھی ایسٹ انڈیا کمپنی۔ اب چوتھ وصول کرنے والے مرہٹے، بہار، اڑیسہ اور بنگال میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

1764ء میں بکسر کی لڑائی میں مغل حکمران خود اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اس لڑائی نے مشرقی یوپی یہاں تک کہ وسط یوپی میں اودھ تک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ بکسر میں شکست کے بعد کمپنی نے الہ آباد کے معاہدے میں دیوانی کے حقوق پورے مشرقی یوپی پر حاصل کر لیے۔ اودھ بھی اس کے زیر اثر آ گیا جہاں بھی لاقانونیت کو سختی سے دبا دیا گیا۔ چنانچہ امن وسکون پھیل گیا۔

بکسر میں مغل حکمران کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔ حیران کن بات یہی رہ گئی تھی کہ کلائیو نے مرہٹوں کی طرح دہلی پر چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کمپنی کی حکمرانی مشرقی یوپی تک پھیل چکی تھی اور اودھ اس کے زیر اثر آ گیا تھا۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ کمپنی نے 1612ء میں جب اپنے کاروبار کا آغاز کیا تو اس کے پاس پوری مغل سلطنت پر قبضہ کرنے کا کوئی بڑا منصوبہ نہیں تھا پھر بکسر کی فتح اور اس پر آسانی کے ساتھ قبضے نے کمپنی کو کس بات سے روکے رکھا؟ دستاویزات سے اور لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے نام کلائیو کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ پورے ہندوستان پر کمپنی کی عملداری کا خیال پلاسی کی جنگ کے بعد ہی ان کے ذہنوں میں آیا لیکن صرف خیال آیا تھا اس پر کوئی بات چیت شروع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم بکسر کی فتح نے کورٹ آف ڈائریکٹرز میں مذکورہ سوچ کے عمل کو تیز کر دیا اور یقیناً ارکانِ پارلیمنٹ بھی اس طرح سوچنے لگے۔ بکسر کی فتح کے بعد مکمل قبضے میں دس سال سے زیادہ نہیں لگے لیکن کلائیو نے اس کے بعد اقدامات اس طرح شروع کیے گویا اس بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے یہی کچھ کلائیو کے جانشین لارڈ وارن ہیسٹنگز نے کیا۔

لیکن پھر بھی ایک چھوٹے سے ملک کی نجی کمپنی کے لیے اتنے بڑے کیک کو نگل

لینا آسان نہ تھا۔ ایک زوال آمادہ معاشرے میں بددیانت اہلکاروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے کمپنی کے حکام کا اخلاق بھی متاثر ہو رہا تھا حتیٰ کہ کلائیو بھی جو 1758ء میں بنگال کا گورنر تھا، کرپشن میں پھنس گیا۔ کمپنی کے حکام کا رہن سہن اتنا نمایاں نظر آتا تھا کہ جب وہ مال و دولت سے لدے پھندے اور لوگوں کو ہر ممکن طریقے سے متاثر کرتے ہوئے لندن واپس پہنچے تو انہیں طنزاً نواب کہا جانے لگا تھا۔ کرپشن کے پھیلتے ہوئے سرطان سے کمپنی کے ڈائریکٹروں کو جو لندن کے سیاست دانوں کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، پریشانی لاحق رہنے لگی۔ چنانچہ کرپشن کے مسئلہ پر لندن میں باقاعدہ بحث ہوئی۔ بالآخر اس مسئلہ سے سختی کے ساتھ نبٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کلائیو پر فرد جرم عائد کی گئی، اس کا مواخذہ ہوا۔ ذلت سے بچنے کے لیے اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے جانشین وارن ہیسٹنگز کا بھی مواخذہ ہوا۔

حوالے

1۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، نگارشات لاہور از ڈاکٹر مبارک علی

2۔ History of Arabs مصنفہ فلپ کے ہتی

3۔ The Agrasian systam of the Mughals از عرفان حبیب

4۔ The Rise and Falls of the Great Powers ہارپر کولنز پبلشرز لندن

باب نمبر 5

MashalBooks.org

ہندوستانی مسلمانوں کو کمپنی کی دین

اس امر کے باوجود کہ لارڈ کلائیو، ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کا بانی اور اس کا معمار تھا، لندن واپسی پر اس کے خلاف کرپشن کا مقدمہ چلایا گیا، حالانکہ اس کے پاس دولت اور املاک بہت تھیں اور ان کے سوا قوم کیلئے اس کی بڑی خدمات تھیں، لیکن اس ''نواب'' کے خلاف مقدمے کی کارروائی ہوتی رہی۔ اس مقدمے سے اس کی زندگی اتنی اندوہناک ہوگئی کہ سزا کے نتیجے میں اسے جو ذلت اٹھانی پڑتی اس سے بچنے کے لئے اس نے خودکشی کر لی۔ یہاں تک کہ اس کے جانشین وارن ہیسٹنگز سے بھی باز پرس ہوئی جسے پورے ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وارن ہیسٹنگز پر فرد جرم لگاتے ہوئے ایڈمنڈ برک نے دارالعوام میں جو تقریر کی، سیاسی معیشت کے موضوع پر برطانیہ کی اعلیٰ ترین تقریروں میں شمار کی گئی بلکہ وہ انگریزی ادب کا بھی شاہکار ہے۔ اس کے خلاف علاوہ دیگر الزامات کے ایک الزام اودھ کی بیگمات سے جبراً رقم وصول کرنے کا تھا۔ ان شدید اور حتمی اقدامت اور دوسرے چھوٹے ملازموں کے خلاف ایسی ہی کارروائیوں کے نتیجے میں ہندوستان بھر کے اندر کمپنی کے ملازموں میں خدا کا خوف ایسا بیٹھ گیا کہ وہ آئندہ کے لئے بے حد محتاط رہنے لگے۔

یہ اچھی تبدیلیاں تھیں، لیکن انتہائی نقصان دہ تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور یہ تھا بنگالی کسانوں کا زبردست استحصال، جس میں لارڈ کارنوالس کی ''بندوبست استمراری'' کے باعث مزید اضافہ ہوگیا۔ بنگالی طبعاً بڑے انقلابی ہیں چنانچہ کسانوں کا ردعمل بھی انتہائی خوفناک ہوا۔ اس میں کچھ اور اضافہ نئے نئے اسلامی جذبے سے ہوگیا۔ بنگال کے مغلیہ صوبے میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی، یہی صورتحال دیہی علاقوں میں بھی تھی۔ زیادہ تر کمپنی کی حکومت کے زمانہ میں اور وہ بھی چند عشروں کے اندر یہ دیکھا گیا کہ مشرق کے

نصف دیہات میں مسلمان آبادی کی اکثریت ہوگئی۔

مغلیہ ہندوستان میں آبادی کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ اگر کوئی بلوچستان اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلے سے مشرق کی طرف سفر کرتا تو مسلمانوں کی اکثریتی آبادی بیش سے کم ہوتی جاتی۔

پنجاب کے نصف مغربی علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جاتی اور برابر کم ہوتی جاتی۔ پھر آزاد ہندوستان میں جو علاقہ یوپی کہلاتا اس میں مسلمانوں کی آبدی چودہ فیصد اور بہار کی صرف گیارہ فیصد تھی۔ یہ رجحان پورے مغلیہ دور میں برقرار رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی جغرافیائی حد تک کہ مغلوں کا دارالحکومت اور آس پاس کا علاقہ بھی مسلم اکثریتی علاقہ نہیں تھا۔

بنگال پرامن حالات کی بدولت پورے یوپی کے مشرقی میں اسلامی علوم اور مسلم ثقافت کا مرکز تھا، علماء کے جتھے اور صوفیا وہاں جاتے اور آبادیوں کو باقاعدہ ایک مہم کے تحت مسلمان بناتے۔ دوسری طرف مسیحی مشنریاں، جنہیں برطانیہ کے متمول عیسائیوں سے بھاری رقوم مل رہی تھیں عیسائیت پھیلا رہے تھے۔ مؤرخ ڈاکٹر مبارک کا بیان ہے کہ ابتداء میں کمپنی نے عملاً مشنریوں کو تبلیغ سے روک دیا تھا۔ سرکاری طور پر کمپنی کو مشنریوں کی حمایت سے تامل ہوتا تھا۔ اس وقت مسلمان صوفیا اور عیسائی مشنریوں کے ساتھ باقاعدہ مقابلہ ہو رہا تھا۔ اول الذکر کا سب سے بڑا سرمایہ ایک ولولہ انگیز عقیدہ اور خالی ہاتھ تھے۔ آخر الذکر کے پاس کثیر زرومال تھا۔ ایک صدی سے بھی کم مدت میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کا فروغ کئی لحاظ سے ایک منفرد بات تھی۔ اس کا پھیلاؤ اس وقت ہوا جب مغلیہ ہندوستان زبردست انتشار میں مبتلا تھا اور مسلمان مدافعت کر رہے تھے اور جہاں اکثریت میں تھے وہاں سے پسپائی اختیار کر رہے تھے مثلاً پنجاب سے یا ان جگہوں سے جہاں وہ برسر اقتدار رہ چکے تھے یا مثلاً دلی سے۔ اسلام ان علاقوں میں پھیلا جو اچھے خاصے عرصے تک مسیحی کمپنی کے زیر انتظام رہے۔ تبلیغ کا کام بے وسیلہ لوگوں نے سنبھالا۔ اس کے علاوہ تمام تر پسماندہ ہندوؤں میں اسے فروغ حاصل ہوا۔ مسلمانوں کے دور اقتدار میں اونچی ذاتوں کے متمول ہندوؤں نے اسلام ہمیشہ محض عقیدے کی بنا پر قبول نہیں کیا بلکہ اکثر سیاسی اقتدار میں رہنے کے لئے اور سماجی مرتبے کی خاطر اختیار کیا۔ مختصر یہ کہ اسلام کو بنگال میں ناسازگار حالات

کے تحت فروغ حاصل ہوا اور اسے ایک سماجی اور روحانی نظام کے طور پر پیش کیا گیا چنانچہ نچلی ذات کے ہندو بنگال میں برابر کے سماجی مرتبے کے حامل ہوئے جبکہ باقی ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک نچلا طبقہ تیار کیا گیا تا کہ جب نچلے طبقے کے ہندو اسلام قبول کریں تو انہیں اس نئے طبقے میں رکھا جائے۔ نتیجہ یہ کہ نچلی ذات کے مسلمان سماجی طور پر محروم اور پسماندہ ہی رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جنوب میں 1740ء کے بعد اور شمال میں 1757ء کے بعد اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے کسی مضبوط بنیاد کی تلاش میں تھی۔ ایک طرف تو کمپنی ان علاقوں میں پاؤں جما رہی تھی جو بکسر کی لڑائی کے بعد اسے معاہدہ الٰہ آباد کے نتیجے میں حاصل ہوئے تھے۔ دوسری طرف مرہٹوں نے پھر جتھ بندی شروع کر دی۔ چند ہی سال کے اندر 1761ء کی جنگ پانی پت ایک پرانی تاریخ بن چکی تھی۔ ابدالی قندھار کے اندر اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ دور افتادہ دہلی کے لئے وہ کیوں پریشان ہوتا۔ لہٰذا پانی پت کے گھاؤ مندمل ہونے کے چند ہی سال بعد انہوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کیا اور اب انہیں دہلی واپس آنے سے کون روک سکتا تھا۔ انہوں نے نجیب الدولہ کو برطرف کر کے وہیل کھنڈ بھگا دیا اور بادشاہ کو اپنی ماتحتی میں لے لیا۔ نجیب الدولہ نے کم از کم امن کے کچھ شواہد تو باقی رکھے تھے۔

ہندوستان کے شمال میں کمپنی کے ماتحت تمام علاقوں بشمول مشرقی یو پی اور اڑیسہ میں مکمل امن و امان قائم تھا۔ یہی صورت جنوب کے بعض حصوں میں تھی جنہیں آزادی کے بعد تامل ناڈو اور کیرالا کہا گیا اور وہ جو کمپنی کی عملداری میں رہتے ہوئے آزادی کے بعد آندھرا پردیش کے نام سے موسوم ہوئے۔ آزادی کے بعد کا کرناٹک جو میسور کہلاتا تھا، حیدر علی کے زیر حکومت تھا۔ بعد میں اس کا بیٹا حکمران ہوا۔ نظام حیدرآباد کی ریاست کے تلنگانہ علاقے میں بھی جہاں تیلگو بولی جاتی تھی امن و امان قائم تھا، تاہم مرہٹی بولنے والے علاقے مرہٹہ واڑا میں بے یقینی کی کیفیت موجود تھی۔ یہ علاقہ کبھی نظام کے پاس ہوتا کبھی مرہٹوں کے پاس۔ یہ صورتحال اس وقت تک برقرار رہی یہاں تک کہ پہلی مرہٹہ جنگ شروع ہوگئی جس میں کمپنی اور نظام کی فوجیں ایک طرف تھیں اور مرہٹے دوسری طرف۔ اس جنگ میں مرہٹوں کی شکست کے بعد مرہٹہ واڑا اور ساتھ ہی برار کا علاقہ نظام کے پاس آ

گیا۔ بمبئی جو ماہی گیروں کی بستی تھی اور جسے مرہٹی اور گجراتی بولنے والے ممبئی کہتے تھے کمپنی کی حکمرانی میں سترہویں صدی کے نصف آخر سے پرامن چلا آ رہا تھا۔ مرہٹوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ حکمرانی کا اختیار کم سے کم استعمال کیا جائے اور پھر اس قدر برتا جائے کہ چوتھ کی وصولی میں آسانی رہے چنانچہ شمال اور جنوب میں کہیں بھی حکومت نظر نہیں آتی تھی۔

راجپوتانہ کی ریاستوں میں افراتفری نہیں تھی اور حالات پرامن تھے۔ یہی کیفیت بھرت پور اور الور کی ریاستوں میں اور اودھ میں اور بڑی حد تک روہیل کھنڈ میں بھی تھی تاہم بندیل کھنڈ، برندرابن اور شمال میں دوسرے علاقے اس قدر پرامن تھے کہ مرہٹے چوتھ وصول کرتے رہیں۔ شمال مغرب میں پنجاب کے اندر بالکل نراج تھا۔ یہی حال اٹک سے آگے پختون علاقے اور بلوچستان کا تھا۔ کچھ لاقانونیت سندھ میں بھی تھی، اگرچہ سندھ کے راجپوت علاقے اور کچھ کے علاقہ راجپوتانہ جیسے ہی تھے۔ یہی حال بہاولپور کا تھا جس کے ایک طرف راجپوتانہ تھا اور دوسری طرف جنوب میں پنجاب کا سرائیکی علاقہ یہ ان دونوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔

پنجاب میں اور خاص طور سے لاہور میں جو پنجاب کا دارالحکومت اور مغلیہ دور میں ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔ حالات نہایت اندوہناک تھے اور شہریوں کی زندگی عذاب میں تھی۔ تین سکھ جنگجو سردار لچھمن سنگھ، گوجر سنگھ اور نتھا سنگھ مل کر لاہور پر حکمران تھے۔ بالآخر 1799ء میں گوجرانوالہ کے راجہ رنجیت سنگھ کو مدد کے لئے پکارا گیا۔ تخت لاہور کے مشترکہ حاکم ''سہہ حاکمانِ لاہور'' کہلاتے تھے۔ ان کی عملداری میں مکمل نراج اور لوٹ مار کی حیثیت قانونی تھی۔ یہاں تک کہ کسی میں جرأت نہ تھی کہ رات میں گھر کے دروازے بند کر کے سوتا۔ دروازے پاٹوں پاٹ کھلے رکھے جاتے کہ ان میں سے کوئی بھی سکھ حاکم گھر میں گھس کر لوٹ مار کر سکے۔ دیہات میں تو یہ کیفیت رنجیت سنگھ کے حکومت میں آنے کے بعد بھی رہی۔ اس وقت تک پنجاب کے حاکم نے مہاراجہ کا خطاب اختیار کر لیا تھا۔ البتہ شہروں میں اور ان کے آس پاس حالات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ رنجیت سنگھ کی حکمرانی پنجاب کے شہروں تک بہت مؤثر تھی۔

سندھ میں کلہوڑا خاندان نے چونکہ مغل گورنر کی جگہ موثر طور پر سنبھال لی تھی اس لئے وہاں کے حالات پنجاب کے مقابلے میں بہتر تھے جب تالپور بلوچ نے سندھ پر قبضہ

MashalBooks.org

کیا تو حالات خراب ہوتے گئے لیکن اتنے خراب نہیں جتنے پنجاب میں تھے۔ کلہوڑا اور تالپور دونوں کی حکمرانی ایک عام آدمی کے لئے برابر کی ظالمانہ تھی۔ قانون اور نظم ونسق کا کوئی وجود نہ تھا۔ ہاریوں کی حالت تو اور بھی اندوہناک تھی۔ تالپوروں نے سندھی جاگیرداروں سے وسیع قطعات اراضی چھین کر اپنے بلوچ سرداروں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ اس سے حالات اور بھی خراب ہو گئے اور کہیں کہیں تو اعلیٰ طبقے کے سندھیوں کے لئے بھی ناقابل برداشت ہو گئے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں شمالی، وسطی اور جنوبی ہند کے بالائی علاقوں کے لوگ ہندو مرہٹوں کی طرف سے چوتھ کی وصولی کے عذاب میں مبتلا تھے، ان کے ساتھ پٹھان مسلمان یعنی پنڈاری مل گئے تھے۔ جنوبی ہند میں جہاں جہاں کمپنی کی عملداری تھی حالات پرسکون تھے البتہ نظام کے زیر حکومت علاقے میں اور میسور میں نسبتاً پرسکون حالات تھے میسور میں اتنی ہی بے چینی پائی جاتی تھی جتنی کسی اور جگہ بلکہ ہر جگہ سے زیادہ تا آنکہ حیدر علی جو ایک ہندو راجہ کی فوج میں ملازم تھا، ان کی مدد کو پہنچا۔ (1)

ہوا یہ کہ دو ہندو بھائیوں اور دیوراج اور نان راج نے اقتدار کو غصب کر کے راجہ کو محل میں نقل و حرکت تک پابند کر دیا لیکن حالات کو بہتر بنانے کے بجائے دونوں بھائیوں کی لوٹ مار اور نااہلی سے اس انتشار میں اور اضافہ ہو گیا یہی حالات تھے جب حیدر علی نے جو بالکل ناخواندہ لیکن حددرجہ ذہین شخص تھا راجہ کو دیوراج اور نان راج کے چنگل سے نجات دلائی، اپنی اہلیت سے قانون اور نظم ونسق کو بحال کیا، کرپشن کو سختی سے کچل دیا اور یوں اپنے تدبر کا سکہ بٹھا دیا۔ امن و قانون بحال کرتے ہوئے تو باہر کے سرمایہ کاروں کو بھی حوصلہ ہوا۔ اس وقت ہالینڈ، ڈنمارک، پرتگال اور فرانس اور انگلینڈ کی کمپنیاں قائم تھیں۔ ریاست میں خوشحالی آ گئی۔ اب مرہٹے میسور سے چوتھ وصول نہیں کر سکتے تھے۔ راجہ کا وقار بحال ہو گیا تھا لیکن حیدر علی تو ایک عام سا شخص تھا جسے نظام اور آس پاس کے دیگر حکمران مثلاً اراکاٹ کے نواب محمد علی پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مرہٹوں اور انگریزوں کے ساتھ مل کر حیدر علی پر برابر دباؤ ڈالے رکھا حیدر علی ایک نہایت زیرک شخص تھا اس نے مخالفوں کا ہر محاذ پر بخوبی مقابلہ کیا۔ میدان جنگ میں بھی اور بھی سفارتی محاذ پر بھی۔ اس نے فرانسیسی اور دوسرے یورپی فوجی افسروں کو ملازم رکھ کر اپنی فوجوں کی تربیت

یورپی انداز پر کروائی۔ ہالینڈ، ڈنمارک اور فرانس کی مدد سے اس نے اعلیٰ درجے کے ہتھیار حاصل کئے۔ انہوں نے حیدر علی کو ایک بحری راستہ بنانے میں بھی مدد دی اگرچہ وہ چھوٹا سا ہی تھا تاہم وہ پہلا شخص تھا جس نے جدید خطوط پر کام کرنے کی اہمیت محسوس کی۔

ہندوستان کو حیدر علی کی صورت میں بے پایاں امید نظر آئی کہ اس شخص میں بصیرت اور تدبر تھا۔ وہ ایک عام آدمی تھا، عام آدمیوں کے درمیان سے ہی اٹھا تھا اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کا زبردست احساس رکھتا تھا۔ اس کا ایک سیاسی مقصد تھا اور سیاسی حکمت عملی تھی، وہ ابدالی اور مرہٹے جیسے جنگجو لٹیروں اور دکن کے زوال آمادہ رئیس نظام اور اراکاٹ کے نواب حتیٰ کہ راجپوتانہ کی ریاستوں کے شہزادوں کی طرح نہیں تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی سیاسی حکمت یا تدبر نہ تھا کہ حالات کا مطالعہ کرتے اور یورپ سے مفید چیزیں حاصل کرتے۔ حیدر علی کی نگاہیں دور تک دیکھ رہی تھیں اور غالباً اس کا ایک خواب بھی تھا۔

حیدر علی کا جانشین اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تھا۔ وہ 1753ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت میسور کے راجہ کی فوج میں حیدر علی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کے پاس تعلیم نہ تھی لیکن اتنی دور اندیشی تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کو تعلیم دلوائی۔ ٹیپو اپنے باپ سے بہت قریب رہا اس طرح اس نے اپنے باپ سے بھی کچھ بصیرت حاصل کی۔ میسور کی حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے تجدد کے عمل کو جاری رکھا لیکن بدقسمتی سے فرانسیسی جو اس کے معاون تھے، اپنے ملک کے اندر انقلاب کے عمل میں پھنس گئے۔ وہ ٹیپو کو اتنی مدد نہ دے سکے جس کی اسے ضرورت تھی۔ پھر بھی ٹیپو نے اپنے بیرونی روابط برقرار رکھے اور ریاست کے اندر اصلاحات جاری رکھیں۔ تاہم اس میں اپنے باپ جیسا تدبر نہ تھا، جس سے حکومت میں ایسے عناصر پیدا ہو گئے جو دل برداشتہ رہنے لگے تھے۔

یورپ میں فرانسیسیوں اور انگریزوں میں لڑائی پھوٹ پڑی۔ نتیجے کے طور پر ہندوستان میں بھی لڑائی شروع ہو گئی۔ ٹیپو یکہ وہ تنہا رہ گیا۔ ادھر نظام اور مرہٹے پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ اپنی ناکامیوں کا پچھلا حساب کتاب چکائیں بلکہ اس مسئلے کو ہمیشہ کیلئے دفن کر دیں یعنی یہ بات کہ ایک عام سا آدمی میسور پر حکومت کر رہا تھا۔ ٹیپو کی اپنی حکومت میں بعض غیر مطمئن عناصر بھی یہی چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ان حالات کو

سازگار پایا اور ایک اتحاد نظام مرہٹوں اور میسور کے ناخوش عناصر کے ساتھ مل کر بنایا۔ اس طرح ایک بڑی طاقت تیار ہوگئی۔ ان اتحادیوں نے 1799ء میں سر آرتھر ویلز لی کی سربراہی میں جو فورٹ ولیم میں متعین گورنر جنرل لارڈ ویلز کا چھوٹا بھائی تھااور بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کہلایا، سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا جو میسور کا دارالحکومت تھا۔ ٹیپو نے ہتھیار ڈالنے کی ذلت گوارا نہ کی، بے جگری سے لڑتا رہا اور آخر جنگ میں کام آیا۔ ہندوستان کی آخری امید بھی ختم ہوگئی۔

ٹیپو میں اپنے باپ کا سا تجربہ اور دور اندیشی نہ تھی لیکن وہ ایک عوامی آدمی اور ناداروں کا دوست تھا۔ اسے یہ شرف اور امتیاز بھی حاصل ہوا کہ پیرس کے مقام پر فرانس کی انقلابی اسمبلی میں اسے سٹیزن ٹیپو (ہمارے شہری ٹیپو) کا خطاب دیا گیا، جہاں تک انگریزوں کا معاملہ تھا اب انہیں ہندوستان میں کسی سے ڈر نہیں رہا۔ پہلی مرتبہ جنگ میں مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی جنوب میں اپنے پاؤں جما سکتی تھی۔ اب صرف شمالی اور شمالی مغربی اور ہندوستان سے نپٹنا باقی رہ گیا تھا اور وہ نہایت معمولی مسئلہ تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کامیابی کے بعد کاروبار کے معمولی دائرے اور محدود مفادات سے نکل کر آگے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اب ہندوستان میں ایک برطانوی سلطنت کے قیام کا تصور ابھرنے لگا۔ بکسر کی جنگ کے بعد برطانوی پارلیمنٹ میں ایسے ہی مدبر آئے جو اسی نوع کے خیالات رکھتے تھے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے خلاف کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات عائد کئے گئے اور سزائیں دی گئیں۔ ایک بڑے کاروبار میں کسی قدر زیادتی اور کرپشن کا عنصر تو شامل ہو سکتا ہے لیکن اس میں ایک مؤثر سلطنت کے قیام کا سوال تو نہیں آتا لیکن یکے بعد دیگرے جو انضباطی قوانین برطانوی پارلیمنٹ میں منظور کئے گئے جن کا مقصد ہندوستان میں کمپنی کی سرگرمیوں کو باضابطہ بنانا تھا تو ان میں مستقبل کی سلطنت کے قیام کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔

کلکتہ میں 1793ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اور اس سے پہلے 1790ء میں سرولیم جونز کے ہاتھوں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی تشکیل اور مزید پہلے 1770ء میں مارواڑیوں کے ساتھ مل کر کلکتہ میں ہندوستانی بینک کا قیام، یہ بھی مستقبل کی سلطنت کے

مقاصد کو آگے بڑھانے اور مستحکم کرنے کے لئے تھے۔ سرولیم جونز نے سر جان گلکرسٹ سے سفارش کی فورٹ ولیم کالج میں اردو لکھنے کو رواج دیں جو بول چال کی زبان ہے کیونکہ ان کی رائے میں ایک ایسی زبان کا ہونا ضروری تھا جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان بولی اور آسانی کے ساتھ سمجھی جائے۔

شاہ عالم بادشاہ کی درخواست پر مرہٹے پھر دہلی آ گئے تھے تا کہ روہیلوں کو سزا دیں، جن کے سردار غلام قادر نے بادشاہ کی آنکھیں نکال کر انہیں اندھا کر دیا تھا۔ مغل عمائدین روہیلوں پر حقارت کی نظر رکھتے تھے۔ اسی بنا پر غلام قادر نے شاہ عالم اور دہلی کے عمائدین کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ مرہٹوں کے لئے تو یہ ایک خداداد موقع تا، خاص طور پر اس لئے کہ اس طرح مرہٹوں کو دہلی پر دوبارہ قبضے کا استحقاق حاصل ہو رہا تھا، لیکن دہلی میں انہوں نے شاہ عالم اور دیگر عمائدین سے کس درجہ بدسلوکی کی، یہ ایک الگ روداد ہے۔ ان دنوں عام نوعیت کے مجرم، کچھ تہی دست جاٹ اور ٹھگ اور مرہٹوں سے کٹ کر الگ ہونے والے پنڈاری ہر طرف دندناتے پھر رہے تھے ان کی وجہ سے یوپی کے مغربی اور جنوبی حصے میں کمپنی کی تجارتی کمپنیوں کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا۔ یہ مجرم عناصر اتنے دلیر ہو گئے تھے کہ وہ کمپنی کی تجارتی چوکیوں سے بھی جبری وصولی کرتے اور تجارتی مال اسباب کا خواہ وہ جمنا اور گنگا کے دریاؤ سے کشتی میں جا رہا ہو یا خشکی کے راستے کلکتہ آ رہا ہو، لوٹ لیا کرتے تھے۔ 1800ء تک حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ کمپنی کو بھی اس سے نقصان ہونے لگا۔ مرہٹوں کے سردار سندھیا نے اس بارے میں کوئی تدبیر کرنے سے انکار کر دیا۔ انہی حالات میں لارڈ لیک (1803ء میں) ''صفائی کی مہم'' چلانے پر مجبور ہو گیا۔ پہلے تو اس نے علی گڑھ میں مرہٹہ فوج کو شکست دی جس کا سالار پائر کلیئر ایک فرانسیسی جرنیل تھا۔ اس کے بعد دلی پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی بڑی جنگ درپیش نہ تھی لیکن لارڈ لیک کیلئے سب سے بڑا مسئلہ امن و امان کا تھا۔ اس نے عام مجرموں، ٹھگوں اور پنڈاریوں کو بے رحمی سے کچل دیا، ٹھگ چونکہ غیر منظم تھے اس لئے ان سے نبٹنا کوئی مسئلہ نہ تھا، پنڈاری مجرموں کے ایک منظم گروہ سے تعلق رکھتے تھے ان سے مقابلے میں لارڈ لیک کو سخت مشکل پیش آئی اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی اور اب اندازہ ہوا کہ طاقت کے سفاکانہ استعمال سے زیادہ تدبر کی ضرورت ہو گی۔ پنڈاریوں کو مسلسل شکست دینے اور ان کے سرغنہ کو یقین دلانے کے بعد

کہ انہیں کامیابی نہیں ہو گی لارڈ لیک نے انہیں مذاکرات کی میز پر بات چیت کی دعوت دے دی۔ پنڈاریوں کا ایک ساتھی امیر خاں جنگی مہم جوتھا، اسے یہ پیشکش کی گئی کہ ڈکیتی چھوڑ دے تو جے پور کے قریب ریاست ٹونک اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ چنانچہ وہ ریاست ٹونک کا نواب بن گیا۔ دوسروں کو بھی آگرہ کے نواح میں زمینیں دے دی گئیں۔

امیر خاں بہت دلچسپ آدمی تھا۔ وہ محمد حیات خاں کا بیٹا تھا۔ یوپی میں سنبھل کے مقام پر 1768ء میں پیدا ہوا۔ اس کے دادا تعلق سرحد کے ملازئی قبیلے سے تھا اور وہ قسمت آزما سپاہی بن گیا تھا۔ حیات خاں نے بھی باپ کا پیشہ اختیار کیا تھا لیکن اس کا سرپرست حافظ رحمت خاں جب شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشترکہ فوج کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا تو حیات خاں نے سنبھل میں اقامت اختیار کی اور کھیتی باڑی کرنے لگا لیکن اس کا بیٹا امیر خاں زیادہ حوصلہ مند تھا اور وہ اپنے دادا کے پیشے کی طرف چل پڑا۔ دوستوں کے ساتھ مل کر اس نے ایک چھوٹی سی فوج بنا لی۔ رفتہ رفتہ امیر خاں اتنا مشہور ہوا کہ مرہٹہ سردار جسونت سنگھ نے اسے اپنا رفیق بننے کی دعوت دی۔ بہرحال ریاست ٹونک کی نوابی قبول کرنے کے لئے اس نے اپنی فطری عیاری اور چالاکی کی بنا پر انگریزوں سے بہترین شرائط منوالیں۔ (2) اگرچہ ڈکیتی اور لوٹ مار کو سختی سے کچلا جا چکا تھا لیکن کلکتہ میں گورنر جنرل اور لارڈ لیک اور دیگر اعلیٰ انگریزی حکام کو اپنے تجربے اور مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ عام لوگ ڈکیتی اور لوٹ مار کا پرخطر پیشہ اپنی شدید معاشی مجبوری کی بنا پر اختیار کرتے ہیں۔ اپنے طویل رابطے کی بنا پر کمپنی کے حکام کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرت میں کاروبار اور کاشتکاری دونوں کو غیر شریفانہ اور پست درجے کا کام سمجھا جاتا ہے چنانچہ پنڈاریوں کو غیر حاضر مالکان اراضی بنایا گیا اور وہ سب کمپنی کے وفادار ہو گئے کیونکہ ڈکیتی کے خطرناک پیشے کی جگہ کمپنی نے ان کو ایک آرام دہ پیشے میں لگا دیا تھا۔

پنڈاریوں کی شورش کوئی دس سال کے اندر ختم ہو گئی۔ اس بات نے نئے حکمرنوں کیلئے قبولیت پیدا کر دی اور جب 1820ء اور 1825ء کے درمیان مکمل امن و امان قائم ہو گیا تو برطانوی راج کسی قدر خوش آئند معلوم ہونے لگا کیونکہ اس نے امن اور تحفظ فراہم کیا تھا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب بڑی بڑی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں۔ عدالتیں قائم ہوئیں، امن اور انصاف کو یقینی بنانے کے لئے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا جس سے نئی

ملازمتیں پیدا ہوئیں۔ 1835ء تک ان اصلاحات کے نتائج سامنے آنے لگے لیکن اب باقاعدہ سول اور تعزیرات کے قوانین مرتب اور نافذ کئے گئے۔ لارڈ میکالے نے جو ان کا مولف تھا اس نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک مؤثر تعلیمی پالیسی نافذ کی۔ اس پالیسی کو جاری رکھنے کے لئے تعلیم کا محکمہ قائم کیا اور یہ بھی پہلی بار ہوا۔ میکالے نے منصوبہ بنایا کہ مستعد قسم کے کلرک تیار کئے جائیں۔ 1830ء کے عشرے میں دہلی کالج قائم ہوا اگرچہ کلکتہ یونیورسٹی اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ یوپی کے شہر رڑکی میں 1848ء میں سول انجینئرنگ کالج کھولا گیا جو دنا کا پہلا انجینئرنگ کالج تھا۔

چونکہ ریلوں اور سڑکوں کا ہر طرف جال بچھایا جا رہا تھا اور سڑکوں کی توسیع ہو رہی تھی اس لئے رڑکی کالج کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ 1847ء میں ہی اپر گنگا کینال کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کا آغاز ہر دوا کے قریب دریائے گنگا سے ہوا۔ ایک اور نہر کی کھدائی کا منصوبہ بنایا گیا وہ دہلی کے جنوب میں دریائے جمنا سے نکل کر سعد اللہ خاں کینال میں توسیع کر کے اسے اور آگے لے جائے گی۔ سعد اللہ خاں شاہ جہاں کا وزیراعظم اور چیف انجینئر تھا۔ اس نے پہلی جمنا کینال تعمیر کی تھی۔ اس زمانے میں دہلی کو کلکتہ سے ملانے کے لئے ریلوے لائن تعمیر شروع ہوئی۔ یہ تمام اصلاحات 1803ء سے بہت پہلے ان علاقوں میں جو کمپنی کی عملداری میں آ چکے تھے، نافذ کی جا چکی تھیں اور اب ترقی کے اعلیٰ مدارج میں تھیں۔

ثقافت کی سطح پر زیادہ تر انگریز کچھ سکاٹ لینڈ کے افراد اور اکا دکا دوسرے یورپی ہندوستان کی ثقافت کو اپنا رہے تھے۔ ان کے پہلو بہ پہلو اعلیٰ طبقے کے ہندوستانی، یورپ کا کلچر قبول کر رہے تھے۔ بہرحال عام یورپی باشندوں اور ادنیٰ طبقے کے ہندوستانیوں کے درمیان، جو سب کے سب ہندو ہوتے شادیاں عام ہوتی گئی تھیں۔ ایک اور نمایاں ثقافتی ارتقا یہ ہوا کہ بہت سے یورپیوں نے اردو میں شاعری شروع کر دی تھی۔ اس ثقافتی پہلو کا علم 1940ء کے عشرے تک نہیں ہوا تھا، یوپی میں صوبائی سول سروس کے ایک افسر رام بابو سکسینہ نے اس موضوع پر تحقیق کی۔ (اردو ادب کے ہند یورپی شاعری ان کی تصنیف کا نام ہے) مثال کے طور پر ایک فرانسیسی الیگزینڈر ہوگلے نے باقاعدہ تخلص آزاد رکھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے اور غزلیں لکھا کرتے تھے۔

MashalBooks.org

چونکہ مسلمان حکمران طبقے کی جگہ کمپنی نے لے لی تھی اس لئے مسلمان رؤسا اس سے خوش نہیں تھے۔ اگرچہ کمپنی کے بڑے افسر مقامی ثقافت کے بعض پہلوؤں کی طرف مائل ہو سکتے تھے لیکن لوگوں کے درمیان کرنے والے اور متعلقہ علاقے کے عوام سے رابطے میں آنے والے افسر مقامیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ کمپنی نے ٹھگوں، پنڈاریوں اور دوسرے مجرموں کا معاشی مسئلہ تو حل کر لیا لیکن عام مسلمان شدید معاشی بدحالی میں مبتلا تھے۔ سب سے بڑی شکایت چھوٹے اور درمیانہ درجے کے غیر حاضر مالکان اراضی، بڑے زمینداروں اور بالائی متوسط طبقے کے رئیسوں کو تھی۔ ان کے شکوے شکایتیں بڑھتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ انگریزی فوج کے ہندوستانی ملازموں تک پھیل چکی تھیں۔ بہت سی روایتی جو ممکن ہے درست نہ ہوں ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان گردش میں تھیں۔ ان میں سے ایک شکایت یہ تھی کہ انہیں جو کارتوس فراہم کیا جاتا ہے وہ ایسے خول میں رکھا جاتا ہے جس میں سور اور گائے کی چربی ہوتی ہے۔ اس خول کو دانتوں سے کھولنا پڑتا ہے چنانچہ ہندو اور مسلمان دونوں سخت ناراض تھے کہ اس طرح ان کے منہ میں مذہبی عقائد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

ان سب باتوں سے انگریزوں کے خلاف نفرت اور کشیدگی بڑھ گئی۔ لارڈ لیک کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 1851ء میں لارڈ ڈلہوزی کو گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ ڈلہوزی نے ایسے اقدامات کئے جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے بالائی طبقے میں کچھ اور زیادہ لوگ خفا رہنے لگے۔ اب حکمرانی کے جواز کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور مطالبہ یہ ہو رہا تھا کہ بادشاہ کو جس کا وجود محض ایک سائے کی طرح رہ گیا تھا لال قلعہ حویلی چھوڑ دینا چاہئے۔ ڈلہوزی کا خیال تھا کہ یہ جو درجنوں پنشن خوار ہیں مثلاً اودھ کی بیگمات، تانتیا توپی، کانپور کے مرہٹے اور رانی جھانسی ان سب کا وجود محض بوجھ ہے۔ ڈلہوزی نے ان سب کو نوٹس بھجوا دیئے کہ آئندہ پنشن نہیں ملے گی اور وہ ہندوستانی ریاستیں بھی جن میں کوئی بیٹا وارث تخت نہیں موجودہ حاکم کے بعد اپنا وجود کھو دیں گے۔ ڈلہوزی کے ذہن میں ایسے بہت سے احمقانہ خیالات تھے۔ شمالی ہند کا درمیانہ طبقہ جن معاشی مسائل میں گرفتار تھا ان اقدامات سے ان میں اضافہ ہوا۔ اس طرح مخالفوں کا ایک چھوٹا سا لیکن طاقتور اور بااثر گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ ایک ٹائم بم تھا جس کی سوئی آگے جا رہی تھی اور اسے

دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ لارڈ لیک اور لارڈ ولیم بینٹنک جیسے لوگ نہیں رہ گئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ کمپنی میں اہلیت باقی نہیں رہی تھی۔

1855ء میں لارڈ ڈلہوزی کی جگہ لارڈ کیننگ کا تقرر عمل میں آیا جو نسبتاً زیادہ دور اندیش تھا لیکن اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ 1857ء میں جب میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی تو ٹائم بم پھٹ پڑا۔ مغرب میں یہ بغاوت دہلی اور انبالہ تک پھیل گئی۔ مشرق میں لکھنو اور جنوب میں کانپور اور جھانسی اور ان کے درمیان کچھ اور بھی مقامات اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بعض جگہوں پر انگریزوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ مثال کے طور پر کانپور میں مرہٹہ تانتیا توپی نے ایسا کیا۔ دوسرے مقامات پر اس طرح کے قتل عام کو روکا گیا مثلاً بجنور کے ایک عدالتی افسر سرسید احمد خاں نے جو بعد میں ایک عظیم مصلح تسلیم کئے گئے، قتل عام کو روکا۔

بہرطور ایک سال سے بھی کم مدت میں اس بغاوت کو سفاکی کے ساتھ کچل دیا گیا گیا۔ حقیقتاً انگریزوں کے عتاب کو صرف لکھنو نے ایک سال برداشت کیا۔ دوسرے مقامات پر انگریزوں نے اپنی عملداری 1857ء کا سال ختم ہونے سے پہلے بحال کرا لی تھی۔ اس بغاوت کو اتنی جلدی کچل دینا کس طرح ممکن ہوا جبکہ انگریز سپاہیوں کی تعداد پورے ہندوستان میں بہت مختصر یعنی تقریباً بیس ہزار تھی اور اصل کارروائی کے علاقے میں یہ تعداد دس ہزار سے کم تھی، باقی ملک میں یہ دور دور تک بکھرے ہوئے تھے؟ 1867ء کی بغاوت کے بارے میں ہر ممکن ذرائع سے جو تفصیلات ملی ہیں۔ ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کہیں بھی عوامی بغاوت کی نہیں تھی۔ عام آبادی خاموش تھی۔ بیشتر مسلح گروہ جن کا تعلق کسی غیر مطمئن رئیس سے یا ماضی کے کسی پرانے جنگجو سردار سے تھا، باغی ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ اس شورش میں شامل ہوئے۔ انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک وقت میں ایک گروہ کا صفایا کیا جائے اور آخر میں ساری انگریز افواج ایک ساتھ مل کر لکھنؤ کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے اس کا محاصرہ کر لیں۔

ادھر تو دہلی، لکھنؤ اور جھانسی کے مثلث میں لڑائی کا بازار گرم تھا، ادھر کلکتہ، بمبئی اور کراچی میں یہاں تک کہ دور افتادہ مدراس میں مکمل امن قائم تھا۔ حد تو یہ کہ پٹنہ، پشاور، جے پور، ناگپور اور لاہور بھی بڑی حد تک پرامن رہے۔ اس طرح انگریزوں کے لئے یہ

ممکن ہو سکا کہ جنگ کے محاذ پر اپنے زیادہ دستے بھیجیں۔ ساتھ ہی ہندوستانی ریاستیں جیسے حیدرآباد، میسور، جیغ پور اور راجپوتانہ کی دیگر ریاستیں اور جنگ کے علاقے سے قریب بھرت پور، بھوپال، الور اور پٹیالہ، یہاں تک کہ رام پور اور گوالیار کی ریاستیں جو جنگ کے ہی علاقے میں تھیں سپاہیانہ انداز سے انگریزوں کی پشت پر تھیں۔

وہ فوجیں جو جنگ آزادی کو دبانے کے لئے سرگرم تھیں، ان میں بھاری اکثریت ہندوستانی سپاہیوں کی تھی، انگریز تو محض تھوڑے سے تھے۔ صرف افسر سارے انگریز تھے۔ دارالحکومت دہلی کو فتح کرنے کا اعزاز آخر صوبیدار صاحب خاں ٹوانہ اور ان کے ساتھ بریگیڈیئر نکلسن کو ہی ملا۔ لہٰذا آخری تجزیے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ 1857ء کی جنگ آزادی ایک غیر ملکی قابض فوج کے خلاف اس طرح کی جنگ نہیں تھی جیسی جنگیں الجزائر، ویت ناک یا بیسویں صدی کے وسط میں بہت سی دیگر نو آبادیات میں لڑی گئیں۔ باقی رہی یہ بات کہ گورا انگریزی فوج نے اپنی باغی رعایا کو ایک انتقامی جذبے کے ساتھ سخت سزا دی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ برطانوی فوج میں بھاری تعداد ہندوستایوں کی تھی، ان میں بھی زیادہ تر مسلمان تھے جنہیں نکلسن ٹیکسلا اور پوٹھوہار سے لایا تھا اور صاحب خاں ٹوانہ اپنے آدمی مٹھا ٹوانہ شاہپور اور عیسیٰ سے لائے تھے، جو اب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں واقع ہیں۔

بیشتر ہندوستانی مصنفوں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے جنگ آزادی میں ناکامی کا سبب انگریزوں کی عیاری اور ہندوستانیوں کی دغا بازی بیان کیا ہے۔ اس ساری کارروائی کا کوئی سائنسی تجزیہ نہیں ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر ایک نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ مغل سلطنت کے خاتمے اور خاص طور پر 1740ء میں دہلی کی تباہی اور یقینی طور پر بکسر کی لڑائی کے بعد ہندوستانی قومیت تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو چکی تھی۔ اب ہر فرد کا تعلق صرف اپنی ذات سے تھا۔ پنجابی اور پختون مسلمان انگریزوں کی مدد تشکر کے جذبے سے کر رہے تھے۔ کیا انہیں یاد نہیں تھا کہ انگریزوں نے ہی انہیں سکھوں کے جابرانہ بلکہ ظالمانہ تسلط سے نجات دلائی تھی البتہ سکھ انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بعد سات ہی سال کے اندر ان کی مدد کیوں کر رہے تھے؟ یہ بات ضرور وضاحت طلب ہے۔ پنجاب کے مشرقی اور نصف سے کم علاقے میں سکھوں کے ماتحت جیسا کہ انگریزوں کی عملداری میں بھی تھا،

MashalBooks.org

مسلمان اقلیت میں تھے اور سکھوں کی خاصی تعداد ہندوؤں کے ساتھ مل کر اکثریت میں تھی بیشتر سکھ کاشتکاری کرتے تھے۔ وہ خود کاشت کرنے والے چھوٹے مالکان اراضی تھے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بھی ان پر ناوا جب طریقے سے بھاری ٹیکس لگایا گیا تھا اس کے بعد اس ٹیکس نے ناقابل برداشت جبری وصولی کی جگہ لے لی۔ انگریزوں نے پہلا قدم اٹھایا کہ اراضی پر مال گزاری کا ایک زبردست اصلاحی ضابطہ نافذ کیا جس سے ٹیکس کی شرح گر کر رنجیت سنگھ کے زمانے کے ٹیکس سے بھی کم ہوگئی لہٰذا سکھ انگریزوں کے ممنون ہوئے اور انہیں پسند کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سابقہ سکھ فوج کے سپاہی منتشر اور بیروزگار ہو گئے اور قابض فوج کے لئے مصیبت بن گئے کیونکہ ان میں سے کئی ایک جاتے جاتے بندوقیں ساتھ لے گئے اور قابض فوج کیلئے مصیبت بن گئے کیونکہ ان میں سے کئی ایک جاتے جاتے بندوقیں ساتھ لے گئے تھے اور اب انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ امن عامہ کی حالت خاصی بگڑ گئی جو کیفیت سکھ حاکموں کی نااہلی کی وجہ سے ان کے زمانے میں تھی۔ بگڑتی ہوئی صورتحال کے سبب اس میں اضافہ ہوگیا۔ اس صورتحال پر قابو پانے کے لئے انگریزوں نے ان میں سے چند کو خود اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ باقی افراد کے لئے انہوں نے کچھ تعمیراتی منصوبوں پر کام شروع کیا۔ دراصل نہروں کی کھدائی اولاً سکھوں کی ڈکیتی لوٹ مار پر قابو پانے کے لئے ہی شروع کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں حسن انتظام کی بدولت امن عامہ کی صورتحال غیر معمولی طور پر سدھر گئی اور یوں معیشت بھی بہتر ہوگئی۔ یہ تھے وہ اقدامات جن کی بنا پر سکھوں نے 1857ء میں انگریزوں کی مدد کی۔ یہ سب کچھ پنجاب پر قبضے کے بعد سات ہی سال کے اندر رونما ہوا جس کا سہرا انگریزوں کے ماہران طرز حکمرانی کے سر جاتا ہے۔ لہٰذا 1857ء کی جنگ آزادی یا اسے آپ جو بھی نام دیں اس کی ناکامی کے اسباب بخوبی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ 1857ء کی شکست بہت المناک تھی اور اس نے عام لوگوں پر ان کے غیر جانبدار رہنے کے باوجود بڑے مصائب کا بوجھ ڈالا۔

ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوم کی محکومی ذلت آمیز ہوتی ہے لیکن یہ محکومی اس وقت تو اور بھی باعث توہین ہو جاتی ہے جب حاکم قوم کے مقابلے میں محکوم کہیں زیادہ بڑی ہو۔ یہ ذلت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب محکوم قوم اپنی محکومی کے اسباب کی صفائیاں پیش

کرنے لگے۔ مغلیہ ہندوستان میں حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، جن کے تحت ایک چھوٹے سے ملک انگلینڈ نے اسے فتح کر لیا لیکن یہ بات تمام ہندوستانیوں کے لئے ذلت آمیز ہونی چاہئے تھی۔ اور زیادہ اندوہناک بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے ذلت آمیز ہونی چاہئے تھی۔ اور زیادہ اندوہناک بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے اپنی شکست کا الزام انگریزوں کی عیاری کے سر تھوپا اور یہ کہا کہ انہوں نے ہندوستانیوں میں غدار پیدا کئے جنہوں نے ملک سے بدعہدی کی۔ جنگیں، کتاب میں لکھے ہوئے اصولوں کے مطابق کسی کھیل کی طرح نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ میں دشمن کے خلاف سازش کو جائز ہتھیار تسلیم کیا جاتا ہے۔ حکمرانی کی اعلیٰ ترین سطح پر اسے ماہرانہ انداز حکومت میں شامل کیا گیا ہے جو لوگ سازش کا شکار ہو جاتے ہیں خواہ وہ میدان جنگ میں ہوں یا بین الاقوامی سیاست میں وہ بہر طور نااہل ہوتے ہیں لہٰذا شکست ان کا مقدر ہوتی ہے۔ اپنی محکومی کی حقیقت کا اقرار کرنے کے بجائے ہندوستانی اور پاکستانی بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ جنگیں فتح کی خاطر لڑی جاتی ہیں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگریزوں نے غداروں کو آگے بڑھایا تو یہ اس معاشرے کی بیماری تھی جس میں ایک غیر ملکی طاقت کو ان لوگوں کی خدمات میسر آ گئیں جو پیسے کی خاطر اپنی قوم سے غداری کر سکتے تھے اور ایک حملہ آور کیلئے اسے فتح بھی کر سکتے تھے۔

اس ذلت کے باوجود جو محکومی پیدا ہوئی، انگریزوں نے 1707ء کے قانون کی منظوری کے بعد ہندوستان میں اصلاح احوال کے لئے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے یہاں ایک آزاد عدلیہ قائم کی۔ جدید تعلیم کو رواج دیا اور ان سب کے علاوہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو متعارف کرایا۔ ان کے علاوہ انگریزوں نے ادارے قائم کئے۔ بہت کچھ ہم سے کھو چکا ہو گا لیکن پھر بھی اتنا باقی رہ گیا تھا کہ اگر ایک بیدار روش ہوش مند رائے عامہ ہوتی اور دیانتدار قیادت بھی ہوتی تو ہم تعمیر نو کر سکتے تھے۔

آخر میں اس بات پر زور دینا ضروری ہو گا کہ معاشروں اور تہذیبوں کے درمیان جنگیں، ذہنوں اور دلوں کی جنگیں ہوتی ہیں۔ یہ معلومات کی اور علم کی جنگیں، نئے تصورات اور تازہ افکار، حوصلہ مندی اور پہلکاری، زندگی کی اعلیٰ اقدام اور انسانیت کے ساتھ رحمدلی کے جذبے کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کے اپنے زریں

ایام میں دماغ اور دل کی یہ جنگیں کامیابی سے سرکیں۔ جنگ کے میدان میں ان جنگوں سے ان کے دلوں اور دماغوں میں ہونے والی معرکہ آرائیوں کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنے زریں اور دماغوں میں ہونے والی معرکہ آرائیوں کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنے زریں زمانے میں یونان، ایران، ہندوستان اور چین کے علوم اور ذہنی سرمائے سے بے حد استفادہ کیا۔ اسلام کا خاص عطیہ یہ تھا کہ اس نے انسانی تہذیب کو سماجی مساوات اور انصاف کی ضمانت دی۔ اس کے ساتھ ہی معاشریغ کو مفادات سے محروم لوگوں کی فلاح کا ذمہ دار قرار دیا۔

پندرہویں صدی کے بعد سے جب مسلمانوں نے دماغ اور دل میں ہونے والی جنگیں ہارنا شروع کیں تو ہر میدان جنگ میں شکست کھانے لگے۔یہی وقت تھا جب مغرب میں یونانی افکار اور علوم کی تجدید کے ساتھ نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا۔مغرب نے روشن خیالی کے اس دور میں اسلامی، ہندی اور چینی افکار سے اپنی تہذیب کو مالا مال کیا لیکن مغرب کے بہترین عطیہ کا فروغ برطانیہ میں ہوا جہاں جمہوریت تھی،عوام کا اقتدار تھا، آزاد عدلیہ تھی ارفکر و اظہار کی آزادی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں مغرب کی شہنشاہیت کو لانے کے علاوہ یہاں مغرب کے افکار وعلوم بھی درآمد کئے لیکن ان سب کے سوا اس نے ایک نظام پیش کیا جس کی بنیاد شخصیات پر نہیں بلکہ اداروں پر قائم تھی اور وہ اس لئے کہ اس کی پشت پر جمہوریت، آزاد عدلیہ، سوچنے اور اظہار کرنے کی آزادی تھی، جس نے عوام کے اقتدار کی یقینی ضمانت دی تھی۔ ہندوستانی مسلمان مغرب کی شہنشاہیت کے اسیر ہونے کے بجائے تجسس اور تحقیق سے کام لیتے تو وہ بھی مغرب کے خیالات سے اور انگریوں کے تصور جمہوریت سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ناکامی تھی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ورثے اور مغرب کے افکار سے بہرہ مند ہونے سے ان کی محرومی۔ اس کے بجائے وہ مغربی شہنشاہت کا شکار ہو گئے۔ یہ تھا آزادی سے پہلے مسلمانوں کا اندازفکر۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی ہند کی سلطنت کے وارث ہوتے ہوئے، ہندوستان کے مسلمانوں نے ورثے میں کیا پایا؟

MashalBooks.org

برطانیہ کی حکمرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے بالواسطہ تھی۔ 1858ء میں اس کی جگہ براہ راست حکمرانی کا آغاز ہوا۔ ویسٹ منسٹر میں ملکہ وکٹوریہ کے نام سے برطانوی پارلیمنٹ نے قانون منظور کیا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کو بھی تاجدار برطانیہ کا وائسرائے بنایا گیا۔ اگرچہ کمپنی کی حکومت میں عدلیہ کا ادارہ متعارف ہو چکا تھا، براہِ راست برطانوی حکومت کے تحت انصاف زیادہ صاف ستھرا ہو گیا۔ 1858ء کے چند عشروں بعد ہندوستانی بھی، اگرچہ تعداد میں کم سہی لیکن بہرطور ہائیکورٹ کے جج مقرر کئے جانے لگے اور ضلعی سطح پر ججوں کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ عدلیہ صاف ستھری اور منصفانہ تھی اور اس کے دروازے سارے ہندوستانیوں پر کھلے تھے تاہم عدلیہ شاہی مفادات سے مشروط تھی۔

برطانیہ کی براہ راست حکومت میں سب سے پہلے انتظامیہ کو مستحکم بنانے کا کام ہوا۔ کمپنی میں اس کی نوعیت بہرطور ذاتی تھی اور قدرے بددیانت بھی اور زیادہ منظّم بھی نہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور تجربے کی بنیاد پر انتظامیہ کے دونوں بازوؤں کو یعنی سول سروس اور پولیس سروس کو مستحکم کیا گیا، چنانچہ یہ ادارے زیادہ معقول اور منظّم ہو گئے۔ تمام صوبوں میں بھی انڈین سول اور پولیس سروس متعارف کرائی گئیں۔ یاد رہے کہ سول سروس کا قیام سب سے پہلے شاہی مفادات پورا کرنے کے لئے تھا۔ اس کے باوجود اس نے ہندوستانیوں کو بھی فرداً فرداً جان و مال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ فراہم کیا، اس کے باوجود ان کا قومی وقار قدرے متاثر ہوتا تھا۔

تعلیم کا ابتدائی ادارہ 1835ء میں قائم ہوا تھا لیکن بیس سال بعد ہی 1858ء میں یہ ایک مکمل ادارہ بن گیا۔ اس میں مرکزی اور صوبائی دونوں سطح پر تعلیم کے محکمے کھل گئے۔ سارے ملک میں یونیورسٹیاں، کالج اور سکول قائم ہو گئے پھر جہاں کہیں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی مزید ایسے ادارے کھولے گئے۔ مثال کے طور پر مدراس پریسیڈنسی میں اور مغربی بنگال کے مغربی ہندو اکثریتی علاقے میں ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ یوپی، بہار اور مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے میں اس کی رفتار سست رہی اور مغربی پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور سارے مسلم اکثریتی علاقوں میں تعلیمی اداروں کے قیام کی رفتار انتہائی سست رہی۔ 1910ء کے بعد بمبئی پریسڈنسی میں اور آزادی کے بعد مہاراشٹر

اور گجرات میں اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ بہت سی جگہوں پر جہاں مقامی آبادی کو دانش اور افکار کی روشنی کی زیادہ ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے اپنے ادارے کھولنے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں اور دوسرے صوبوں سے زیادہ جنوبی ہندوستان اور بنگال میں تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ تعلیم نہایت کم خرچ رکھی گئی اور جو لوگ معمولی خرچ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کو مفت یا برائے نام خرچ کے عوض میسر تھی۔

اب کچھ باتیں تعلیم کی ضرورت اور اس کے فلسفے کے بارے میں، برطانوی نو آبادیاتی حاکموں یعنی غیر ملکی آقاؤں کے نقطۂ نظر سے۔ اس کا پیشتر مقصد سلطنت کی ضرورت کے مطابق کلرک اور سول ملازمین پیدا کرنا تھا۔ یہ نہ تو ہندوستانیوں کو فکر کی روشنی مہیا کرنے کے لئے تھی اور نہ ان میں فلسفی، عالم اور سائنسدان پیدا کرنے کے لئے۔ اس کے باوجود انگریزی حکومت بعض ایسے محنت پسند ہندوستانیوں کو جن میں ارادے کی قوت موجود تھی، فلسفی، سکالر اور سائنسدان بننے سے نہ روک سکی۔ بدقسمتی سے بہت کم ہندوستانیوں نے اور ان سے بھی کم ہندوستانی مسلمانوں نے اس مقصد کیلئے کاوش کی۔

برطانوی حکومت نے جو دیگر ادارے قائم کئے ان میں صحت عامہ اور پبلک ورکس (تعمیرات عامہ) کے محکمے اور ریلویز، ان کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے ادارے شامل تھے۔ صحت عامہ کے شعبے میں ہسپتال شامل تھے جہاں سند یافتہ سرجن اور ڈاکٹر متعین ہوتے۔ ڈاکٹر اور صوبوں کی سطح پر میڈیکل کے شعبے قائم تھے جن کی معاونت کیلئے میڈیکل کالج ہوتے۔ حفظان صحت اور علاج معالجے کی سہولت تقریباً مفت مہیا ہوتی یا اس کیلئے برائے نام رقم خرچ ہوتی۔

تعمیرات عامہ کے ادارے میں رفاہ عامہ کی غرض سے تعمیر ہونے والی عمارتیں اور محکمہ تعمیرات شامل تھا۔ ان میں عدالت، ہسپتال اور سرکاری دفاتر کی عمارتیں شامل تھیں سڑکوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کا الگ محکمہ تھا۔ نہری محکمے کا کام نہریں کھودنا اور ان کی نگہداشت تھا، عمارت اور سڑکوں کے محکمے مرکزی اور صوبائی دونوں سطح پر تھے البتہ نہر کا محکمہ صرف صوبائی سطح پر تھا۔ سب سے زیادہ پھیلا ہوا نہری نظام مغربی پنجاب کے مسلم اکثریتی علاقے میں اور سندھ میں تھا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام تھا، جسے جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح ریلوے کا محکمہ تھا جو سارے ملک میں

MashalBooks.org

ریلوے لائنیں بچھاتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا لیکن پنجاب میں یہ سب سے زیادہ وسیع تھا علاقائی حکمت عملی کے تحت کیونکہ روسی حکومت قریب ہی واقع تھی۔ ریلوے مرکزی حکومت کا محکمہ تھا۔

عمارت، سڑکیں، نہریں اور ریلویز ان سارے محکموں کی دیکھ بھال ہندوستانی کرتے تھے جو نہ صرف یہ کہ دیکھ بھال کرنے پر قادر تھے بلکہ حسب منشا ان میں توسیع بھی کر سکتے تھے۔ ان محکموں میں انجینئروں کی تربیت کے لئے سارے ملک میں انجینئرنگ کالج کھولے گئے تھے۔

برطانوی حکومت نے انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ہندوستان میں لوکل سیلف گورنمنٹ (حکومت خود اختیاری) کا ایک ادارہ قائم کر دیا تھا۔ ہندوستان کیلئے تو یہ بالکل نیا تصور تھا کیونکہ اس کا وجود نہ مغلوں کے زمانے میں تھا اور نہ اس سے پہلے تھا۔ لوکل باڈیز کے حوالے سے چھوٹے شہروں میں میونسپل کمیٹیاں، بڑے شہروں کے لئے میونسپل کونسلیں اور دیہی علاقوں کے لئے ڈسٹرکٹ بورڈ قائم تھے۔ کچھ عرصے بعد بڑے شہروں مثلاً کلکتہ اور بمبئی کی کونسلوں کو ترقی دے کر کارپوریشن بنا دیا گیا تھا۔ ان کا آغاز تو رسمی اداروں کے طور پر تھا لیکن جب کچھ تجربہ حاصل ہو گیا تو ان میں محدود رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا۔ انگریزوں کے جانے سے ذرا پہلے دہی کے طریقے کو عام کر دیا گیا لیکن برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے برعکس ہندوستان میں لوکل گورنمنٹ کا دائرہ عمل محدود تھا، چنانچہ یہاں میونسپل خدمات سے مراد سڑکوں کی تعمیر و مرمت اور ایسی ہی دیگر چھوٹی موٹی خدمات تھیں۔ مغربی ملکوں میں لوکل گورنمنٹ پولیس، انتظامیہ، بنیادی تعلیم اور بعض اوقات اعلیٰ تعلیمی اداروں پر اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ نیز ایسے کاموں پر بھی قادر ہوتی ہے جنہیں ہندوستان میں ڈپٹی کلکٹر یا پنجاب میں ڈپٹی کمشنر اور پولیس سپرنٹنڈنٹ انجام دیتے ہیں۔ دراصل لوکل گورنمنٹ کے دائرہ کار میں سب کام آتے ہیں لیکن سامراجی مقاصد کے تحت انہیں افسر شاہی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا، جس کا تقرر اور جس پر گرفت گورا گورنر کرتا تھا۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ انگریزوں نے جو انتظامی طریقے مغلوں سے لئے تھے انہی کو کم و بیش برقرار رکھا۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے جو نہایت خوش آئند ہے۔ مغل

دور میں حکومت کی نوعیت ذاتی تھی۔ برطانوی حکومت نے اسے اداروں میں بدل دیا تاہم وقت اور حالات میں تبدیلی اور سماجی اور سیاسی صورت حال میں فرق کے پیش نظر جب بھی ضرورت محسوس ہوئی تفصیلات میں معمولی رد و بدل کرنا پڑا۔ اس میں اہم بات سامراجی مفادات کی تھی۔ بیشتر صورتوں میں تو عہدے بھی وہی رکھے گئے جو پہلے تھے جیسے پٹواری، قانون گو، پیش کار، واصل باقی نویس، تحصیل دار وغیرہ، صرف ناظم کو بیشتر ہندوستان میں کلکٹر بنا دیا گیا۔ سوائے اودھ کے بعض علاقوں کے اور پنجاب کے جہاں وہ ڈپٹی کمشنر کہلاتا تھا یا پھر ایک کوتوال شہر میں پولیس کا ایس ایچ او (اسٹیشن ہاؤس آفیسر) بنا دیا گیا۔

تاہم ایک بڑی اور رجعت پسندانہ تبدیلی یہ ہوئی کہ دیہی پنچایتیں جو ہندوستان میں زمانہ قدیم سے رائج چلی آ رہی تھی انہیں خاموشی سے ختم ہو جانے دیا گیا۔ یہ پنچایتیں گاؤں کے بزرگوں کی مشاورتی کونسلیں ہوتی تھیں۔ ان کا انتخاب نہیں ہوتا تھا لیکن گاؤں والوں کی صوابدید سے مقرر ہوتے اور ان کی اخلاقی حمایت حاصل ہوتی۔ پنچایتیں گاؤں کے تقریباً تمام معاملات کا انتظام چلاتیں جن میں ابتدائی پولیس کا کام بھی شامل ہوتا۔ وہ جھگڑے نبٹاتیں اور بنیادی عدلیہ کی طرح کام کرتی تھیں۔ یہ ادارہ مغلوں کے آخری زمانہ میں روبہ زوال تھا۔ انگریزوں نے اسے مرنے دیا اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور بہت زیادہ قابل مذمت بھی نہیں اس سے دیہاتیوں کو یہ اشارہ ملتا تھا کہ وہ انگریز کے مقرر کردہ حاکم سے رجوع کئے بغیر اپنے معاملات خود طے کرنے میں آزاد نہیں۔ آزادی کا یہ احساس سامراجی مفادات کے منافی تھا۔ یہاں تک کہ منتخب لوکل ادارے بھی ایک کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر کے آگے ان لوگوں سے زیادہ جواب دہ تھے جنہوں نے انہیں منتخب کیا۔

آخری اور انگریزوں کا قائم کردہ اہم ترین ادارہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کا قیام تھا جس کی پر اسس جمہوریت کے تصور پر تھی۔ لوکل باڈیز کی طرح مرکزی اسمبلیوں کا آغاز بھی وائسرائے کی نامزد کردہ امپیریل کونسل سے ہوا اس کے بعد محدود حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا طریقہ رائج ہوا۔ رائے دہی کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ پھیلتا گیا اور آزاد سے کچھ پہلے عام حق رائے دہلی تسلیم اور رائج کیا گیا۔ اس کے بعد مرکزی اسمبلیوں کی طرح صوبائی اسمبلیاں بنائی گئیں اور آزادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے ارکان کا انتخاب عام رائے دہی کی بنیاد پر ہوا۔ اس ادارے کو ایک انگریز سول افسر نے ایک سیاسی پارٹی بنا کر

مستحکم کیا۔ یہ تھی انڈین نیشنل کانگریس جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی۔ چند عشروں کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی اس کے بانی برطانیہ کے وفادار مسلمان جاگیر دار تھے۔ بعد ازاں 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں اور بھی سیاسی پارٹیاں بن گئیں۔

حوالے

1۔ این کے سہنا کی تصنیف حیدر علی (مکرجی اینڈ کمپنی کلکتہ)

2۔ عبداللہ ملک کی تصنیف مولانا حمد علی لاہوری

MashalBooks.org

باب 6

مسلمان قوم کی بدعہدی

ہندوستان کے مشرق اور مغرب میں مسلم اکثریتی علاقوں کو جوڑ کر اگست 1947ء میں ایک نیا ملک پاکستان قائم کیا گیا۔ مغربی پاکستان میں بلوچستان، صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے مغربی اور آدھے سے زیادہ بڑے صوبے، اس کے ساتھ ہی پوری ریاست بہاولپور شامل تھے۔ مشرقی پاکستان میں صوبہ بنگال کا مشرقی حصہ اور صوبہ آسام کا ضلع سلہٹ شامل تھے جو بلحاظ آبادی اس صوبے کے نصف سے بھی بڑے تھے۔ مشرقی پاکستان میں تقریباً پوری آبادی بنگالی زبان یا اس کی بول چال کی کوئی اور زبان بولتی تھی۔ مغربی پاکستان میں کسی ایک صوبے کے اندر بھی سبھی لوگ ایک زبان نہیں بولتے۔ بلوچستان میں بلوچی، براہوی، پشتو، سرائیکی اور سندھی یہاں تک کہ بعض علاقوں میں فارسی بولی جاتی تھی۔ صوبہ سرحد میں پشتو، ہندکو اور کچھ سرائیکی بھی بولی جاتی تھی۔ سندھی لوگ سندھی اور سرائیکی بولتے تھے اور اس کے سب سے بڑے شہر کراچی میں گجراتی، یہاں تک کہ اردو بھی بولی جاتی تھیں۔ مسلم لیگی رہنماؤں کے خیال میں ان صوبوں کے درمیان ایک ہی اور سب سے مضبوط رشتہ مذہب اسلام کا تھا۔

آزادی کے بعد 14 اگست 1947ء کو ہندوستان کی بہت سے حصوں میں خاص طور پر مشرقی یا ہندوستانی پنجاب میں جو خون خرابہ ہوا اس نے ہندوستانی پنجاب کی پوری مسلمان آبادی کو ہجرت کر کے مغرب میں یعنی پاکستانی پنجاب میں آنے پر مجبور کر دیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر مسلمانوں نے پاکستانی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ جوابی عمل انسان کی وحشتی جبلت کا فطری اظہار تو ہوسکتا تھا لیکن یہ اسلام

MashalBooks.org

کے منافی تھا۔ بہرحال اس قتل و غارت گری کا نتیجہ ہندو اور مسلمان آبادی کے مکمل تبادلے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ عمل پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان ایک سمجھوتے کے تحت ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب کے مابین طے پایا۔ اس طے شدہ علاقے میں یوپی کے بیشتر مغربی حصے اور دہلی کے علاوہ راجپتوانہ کی کئی ریاستیں شامل تھیں۔ اس طرح پاکستان کی نو ساختہ حکومت کو اس اندوہناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑا لیکن دو سال کے اندر حالات معمول پر آنے لگے کیونکہ عام لوگوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے مہاجر بن کر یہاں آئے تھے اپنے درمیان گنجائش پیدا کر لی۔

ہندو مسلم کشیدگی پنجاب میں 1945ء کے وسط میں شروع ہوئی اور انتہا کو پہنچ گئی یہاں تک کہ محض ایک چنگاری سے لاوا پھٹ سکتا تھا۔ 1945ء کے انتخابات کے بعد ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ جو پاکستان کے مخالف تھے پنجاب کے وزیراعظم منتخب ہوئے۔ اس وقت خفیہ رپورٹیں یہ آ رہی تھیں کہ ہیجان برابر بڑھتا جا رہا ہے اور ہندو اور سکھ اسلحہ کے بھاری ذخائر جمع کر رہے ہیں لیکن مسلمان اشتعال انگیز نعرے لگا کر کشیدگی کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ چنانچہ خضر حیات نے حکم دیا کہ چھاپے مار کر اسلحہ برآمد کر لیا جائے۔ جیسا کہ توقع کی جاتی تھی بھاری مقدار میں اسلحہ جس میں رائفلیں، مشین گنیں اور دستی بم شامل تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے پاس سے برآمد کر لئے گئے۔ مسلمانوں کے ہاں سے صرف ڈنڈے اور فولادی خود ملے۔ یہ کہانی مجھے ممتاز صحافی سلیم علوی نے سنائی جنہوں نے ساری روداد ملک خضر حیات سے خود سنی تھی۔

ملک صاحب نے بتایا کہ گورنر جنکنسز کو خفیہ اداروں کی طرف سے اس مضمون کی اطلاعات ملی تھیں کہ ہندو اور سکھ تشدد پسند تنظیموں کو نہایت حساس نوعیت کے اسلحے دیئے جا رہے ہیں چنانچہ گورنر نے انہیں مشورہ دیا کہ ایسی تمام تشدد پسند تنظیموں پر پابندی عائد کر کے ان کے ہتھیار چھین لئے جائیں۔ اس مشورے کے تحت راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی دل اور مسلم نیشنل گارڈ کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور ان سے اسلحہ برآمد کر لینے کا حکم صادر ہوا۔ ان تنظیموں کے دفاتر پر چھاپے کے دوران آر ایس ایس اور اکالی دل سے خود کار اسلحے اور دستی بم نکلے اور مسلم لیگ گارڈ کے دفاتر سے لاٹھیاں اور لوہے کے خود ملے۔ پولیس ریکارڈ سے کوئی بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ ہندو اور سکھ تو خاموش رہے لیکن مسلم لیگ

نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا جس کے نتیجے میں خضر حکومت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جنکسنز نے کسی طرح کی احتیاطی تدبیر اختیار کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ پنجاب کی تقسیم کے دوران فسادات میں مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے باوجود مسلمان جن کی تیاری ناکافی تھی اور اسلحہ بہت کم تھا اپنی اشتعال انگیزی میں برابر لگے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو زبردست نقصان پہنچا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، 1945ء کے انتخابات جن کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، محدود رائے دہی کی بنیاد پر ہوئے تھے اور ان میں مجموعی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی بھاری تعداد نے مسلم لیگ کو ووٹ دیئے تھے لیکن الگ الگ صوبوں کی گنتی میں کانگریس جس پر ہندوؤں کی بالادستی اقتدار میں آ گئی۔ صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت کا قائد ایک مسلمان تھا۔ سرحد مسلمانوں کی بھاری اکثریت کا صوبہ تھا، پاکستان کی مخالف یونینسٹ پارٹی جس پر جاگیرداروں کا تسلط تھا پنجاب میں برسر اقتدار آ گئی۔ یہ بھی مسلمانوں کی کسی قدر اکثریت کا صوبہ تھا جن کی تعداد آبادی کا 57 فیصد تھی۔ تاہم یونینسٹ پارٹی کی حکومت کا سربراہ ایک مسلمان اور اسکے ارکان کی اکثریت بھی مسلمان تھی۔ سندھ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کا صوبہ تھا لیکن اس کے ساٹھ ارکان میں مسلم لیگی صرف 28 تھے۔ سندھ میں جاگیرداروں کی حاکمیت پنجاب سے بھی زیادہ تھی اور اس کا تعلیم یافتہ شہری متوسط طبقہ جنوبی پنجاب کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا۔ اگرچہ مسلم لیگ نے سندھ میں اپنی حکومت بنا لی لیکن یہ صوبائی اسمبلی میں تین یورپی ارکان کی مدد کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ ایک اقلیتی حکومت تھی البتہ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں کی کارکردگی بہتر تھی۔ یہی صورت بنگال میں تھی ذیل کے خاکے سے پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔

اسمبلی کا نام	کل نشستوں کی تعداد	مسلمانوں کی محفوظ نشستیں	مسلمانوں کی وہ نشستیں جو مسلم لیگ نے حاصل کیں	مسلم لیگ کی مسلم نشستیں اور فیصد شرح
مرکز	142	30	30	100

MashalBooks.org

یوپی	288	66	54	81.8
اڑیسہ	60	4	4	100
بمبئی	175	30	30	100
مدراس	215	21	29	100
بہار	152	4	34	85
سی پی	112	1	13	92.8
پنجاب[1]	175	86	73	84.88
آسام	108	34	31	91.1
سندھ	60	34	26	76.17
سرحد	50	38	17	44.73
بنگال	250	119	112	94.03

پنجاب کے مشرقی اور مسلم اقلیتی علاقے میں تمام مسلمان نشستیں مسلم لیگ نے جیت لی تھیں۔ مسلم لیگ مغربی اور موجودہ پاکستانی پنجاب میں کئی نشستوں پر ہار گئی۔ بحوالہ تاریخی فیصلہ از عبدالوحید قریشی مکتبہ سیاسیہ، دہلی 1946ء

تبادلہ آبادی میں بھی پاکستان کے لئے خیر کا پہلو نکل آیا حالانکہ انسانی عذاب کی صورت میں اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کسانوں اور چند جاگیرداروں پر مشتمل تھی۔ مسلمان تعلیم یافتہ شہری متوسط طبقہ مایوس کن حد تک اقلیت میں تھا۔ ان کی بیشتر تعداد لاہور میں اور کچھ تھوڑے سے ملتان، راولپنڈی اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں تھے۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان متوسط بقے کے لوگوں کا یہاں آنا ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ اس سے متوسط طبقے کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ نہ تو سندھ اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اور نہ مشرقی پنجاب میں مسلمان متوسط طبقے کا نمایاں طور پر کوئی وجود تھا۔ انگریزوں کی تاریخوں سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ یہ متوسط طبقہ

MashalBooks.org

ہے جو کسی معاشرے کو اقتصادی اور سماجی تبدیلیوں سے دو چار کرتا ہے اور سماج کو بدلتا ہے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے شہری، تعلیم یافتہ مسلمان متوسط طبقے نے پاکستان کے معاشرے کی ہئیت بدل دی۔ بلوچستان تمام تر قبائلی اور بیشتر تہذیب کے اولین دور سے تعلق رکھتا تھا۔ سرحد کا صوبہ بھی جزوی طور پر قبائلی اور بلوچستان کی ہی طرح اقتصادی طور پر پسماندہ تھا۔ اسکے بعد ہندوستان کے باقی علاقوں سے خاص طور پر بمبئی، گجرات، کاٹھیا واڑ، وسطی صوبہ جات، سی پی، یو پی اور بہار سے مسلمان متوسط طبقے کے افراد کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ تارکین وطن سندھ بالخصوص کراچی میں آباد ہوئے۔ سندھ کا سماجی نقصہ بھی بدل گیا لیکن اس قدر نہیں جتنا پنجاب کا اس لئے کہ یہاں آنے والے زیادہ تر کراچی میں آباد ہو گئے۔ اس کے بعد حیدرآباد اور کچھ تھوڑے سے لوگوں نے سندھ کے دوسرے شہروں میں اقامت اختیار کی۔ اندرون سندھ وہی جاگیردار اور وہی کسان ہمیشہ کی طرح رہ گئے تھے۔

پاکستان میں مسلمانوں کی ہجرت کا سماجی پہلو سے یہ فائدہ ہوا۔ اقتصادی فائدے بہت اہم تھے۔ سارے پاکستان میں تجارت پر ہندوؤں اور سکھوں کی بالادستی تھی۔ ہندو قیادت نے اپنی تنگ نظری کی بنا پر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سارے ہندو اور سکھ تاجر پاکستان سے چلے جائیں اور اس کا مکمل اقتصادی خاتمہ یقینی ہو جائے۔ مثال کے طور پر اسٹینلے اے کوچنک نے جو پنسلوانیا (امریکہ) کی سٹیٹ یونیورسٹی سے وابستہ ہیں پاکستان بزنس رپورٹ مورخہ اگست 1994ء میں لکھا کہ سب سے بڑی مسلمان تاجر برادری جو ہجرت کر کے پاکستان آئی وہ ہالائی میمن برادری تھی۔ انہوں نے سوتی کپڑے کی درآمدتی تجارت کا سارا بندوبست سنبھال لیا۔ پہلے یہ ہندو تاجروں کا خاص کاروبار تھا۔ میمن سوتی کپڑے کی صنعت اور کاروبار میں پھیل گئے۔ پھر بینکنگ، انشورنس اور اشیائے صرف کی صنعت میں داخل ہو گئے لہٰذا جس خاتمے کا اندیشہ تھا وہ ٹیکسٹائل، بنکنگ اور انشورنس میں ہالائی میمنوں کے آنے سے دور ہو گیا۔ کوچنک ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ پاکستان میں میمنوں کی ہجرت کے برابر ہی دوسری کئی مسلمان تاجر برادریوں نے بھی یہاں کا رخ کیا مثلاً بوہرے، خوجے اور دلی اور شمالی ہند سے اردو بولنے والے کاروباری، ان برادریوں نے ہالائی میمنوں کے ہاتھ مضبوط کئے۔ قومی سطح کا حقیقتاً پہلا بینک اثناءعشری خوجہ برادری

نے قائم کیا۔ یہی بات دوسری خدمات پر صادق آتی ہے جیسے تعمیرات کی صنعت بجلی، اور پانی کی فراہمی اور نکاسی آب کا نظام اور وہ بہت سے کام جو صرف غیر مسلم انجام دیتے آئے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے سے ایسی بہت سی خدمات بند ہو جاتیں لیکن تارکین وطن نے ایک بار پھر خاص طور پر سندھ اور کراچی میں صورتحال کو سنبھال لیا۔ یہی صورتحال تعلیم کے شعبے میں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تھی۔ ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مسلمان تاجروں، ٹیکنیکل کاریگروں، فنی ماہروں اور یونیورسٹی اور کالج کے علاوہ سکولوں کے اساتذہ نے ہندو قیادت کی عیاری اور سازش کو ناکام بنا دیا۔ ان تارکین وطن نے معیشت، تعلیم اور فنی خدمات کے نظام کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

یہ سب کیا تھا؟ میرے حافظے میں یہ معاملہ پوری طرح محفوظ ہے۔ 1948ء کے اوائل کا ذکر ہے میں ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طلبہ کو انجینئرنگ پڑھا رہا تھا۔ ایک صبح میرے استاد نے جو انجینئرنگ کے شعبے کے ڈین اور انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے اساتذہ اور سینئر طلبہ کا ایک اجلاس بلایا۔ پروفیسر ٹی ایچ میتھیو مین نے حکومت پاکستان کراچی کی جانب سے موصول ہونے والی اس درخواست کا ذکر کیا کہ پاکستان کو مسلمان انجینئروں کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ درخواست میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ ہندو اور سکھ انجینئروں کے چلے جانے سے بہت سے شعبوں میں کام کرنے والا ایک فرد بھی نہیں رہا اگر خالی جگہیں فوراً پر نہ کی گئیں تو صورتحال سنگین صورتحال ہو جائے گی۔ پروفیسر نے کہا کہ آپ وہاں چند سال کیلئے یعنی کم از کم پانچ سال کے لئے جانے پر تیار ہو جائیں۔ یہ اور بات تھی کہ تقریباً ایک ہی سال بعد سرحد بند کر دی گئی اور جو لوگ واپس جانا چاہتے تھے پھر واپس نہ جا سکے۔

پنجاب میں تبادلہ آبادی اور ہندوستان کے باقی حصوں سے نقل وطن کے عمل نے بے اندازہ مصائب پیدا کئے اور انسانوں کو عذاب کی صورت میں اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی لیکن اس نے معاشرے کا رنگ بدل دیا۔ سیاسی، سماجی اور ثقافتی اعتبار سے نہ سہی لیکن آبادی کی ساخت کی حد تک یقیناً ہجرت کر کے آنے والے متوسط طبقے نے جاگیردارانہ ثقافت اختیار کر لی اور پورا معاشرہ ذہنی طور پر جاگیردارانہ ہو گیا متوسط طبقے کے مہاجروں کے خواب و خیال میں بھی جاگیردارانہ سماجی تہذیب کے سرطان کی بات نہیں آئی

ہو گی۔ اسے دور کرنے کے لئے موثر قدم اٹھانے کی بات تو الگ رہی۔ مہاجروں میں اس سماجی نقل مکانی کو سندھ میں زیادہ محسوس کیا جاتا ہے جہاں انسانی مصائب پنجاب کے جاگیردارانہ علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں ان لوگوں سے امید کی جاتی تھی کہ یہاں ایک بیدار مغز متوسط طبقہ بناتے جس میں سندھ کے ساتھ وفاداری کا جذبہ موجود ہوتا۔ نیز وہ پنجاب میں مختصر سے متوسط طبقے کو استحکام دیتے لیکن سندھ میں ایک متوسط طبقہ تیار کرنے کے لئے ابھی پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا گیا۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں ایک متوسط طبقہ پیدا ہوا جو سماجی ارتقاء کا ایک تاریخی عمل تھا لیکن وہ جاگیردارانہ فریب کاریوں کا باآسانی شکار ہو گیا اور اسے کسی سماجی تبدیلی کو روکنے کی خاطر موثر طور پر استعمال کیا گیا۔ جاگیرداروں کا نعرہ تھا ''غیر ملکی تارکین وطن سے سندھ اور اس کے کلچر کو بچاؤ'' ابھرتے ہوئے سندھی متوسط طبقے نے یہ نعرہ بخوشی اپنا لیا۔ ملازمتوں کے لئے سخت مقابلے کا رجحان تو بہر طور تھا۔ سندھی اس کیلئے اولیت کے دعویدار تھے۔ نتیجہ یہ کہ سندھ کا متوسط طبقہ جاگیرداری کے خلاف مہم میں یہاں آنے والوں کا معاون بننے کے بجائے ان کا حریف بن گیا۔ تارکین وطن کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنی نادانی اور سماجی بے عملی کی بھاری قیمت 1950ء اور 1960ء کے عشروں میں ادا کی۔ اگرچہ پنجاب میں صورتحال اتنی سنگین نہیں تھی لیکن اندوہناک تو بہرحال تھی۔ ایک طرح سے پورے پاکستان میں حالات کو اندوہناک بنا دیا گیا کیونکہ متوسط طبقے نے جاگیرداری کلچر کو ختم کرنے کے بجائے اسے پوری طرح اپنا لیا تھا۔ ہجرتوں کے بالعموم اچھے اثرات نکلتے ہیں جیسا کہ امریکہ میں ہوا لیکن پاکستان میں ہجرت جس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی تمام تر رائیگاں گئی۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی ہجرت نے اگر پاکستان کے سماجی اور ثقافتی چلن کو بدل دیا ہوتا تو یہ پورے پاکستانیوں کے لئے نہایت نفع بخش ہوتی اور یوں تقسیم کے عمل میں جو قیمت ادا کرنا پڑی تھی وہ قربانی میں بدل جاتی۔ یہ وہ قربانی ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے جوش اور ولولہ پیدا کرتی۔

مشرقی پنجاب کی ہولناک خون ریزی اور باقی ہندوستان میں فسادات شروع ہونے سے پہلے، خوش قسمتی سے کل ہند مسلم لیگ کی مجلس عامہ نے قائداعظم سے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے اور ریاست کا سربراہ بننے کی درخواست کی۔ لیاقت علی خاں کو

وزیراعظم بنایا گیا۔ کابینہ کی تشکیل میں بڑی دشواری پیش آئی کیونکہ موزوں امیدوار دستیاب نہ تھے۔ بہرطور ایک کابینہ بنا دی گئی جس میں وزیرخزانہ کا اہم ترین عہدہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر غلام محمد کو تفویض کیا گیا۔ دوسرا اہم عہدہ وزیر خارجہ کا تھا۔ اسے ایک ماہر قانون دان ظفر اللہ خان کے سپرد کیا گیا۔ غالباً مسلم لیگ کے اپنے سیاستدان موجود نہ تھے جو ان دو بڑے عہدوں کے لئے موزوں ہو سکتے تھے۔ غلام محمد اور ظفر اللہ خان دونوں پنجابی تھے اور برطانیہ کے گہرے وفادار۔ یاد رہے کہ افسر شاہی میں پنجابی اور مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان افسر شامل تھے۔ کوئی اعلیٰ ترین یا دوسرے درجے کا اعلیٰ افسر بنگال سے نہیں لیا گیا، جو پاکستان کا اکثریتی صوبہ تھا اور سندھ اور سرحد سے بھی تقریباً کوئی نہیں آیا۔

لیکن اپنی اس بھاری سیاسی کوتاہی کے باوصف بنگال کے سیاستدانوں نے اپنی سوسائٹی کی اصلاح، ایک عظیم بنیاد پر شروع کی۔ اعلان آزادی کے بعد جلد ہی زمین کی جاگیردارانہ ملکیت ایک قانون کے تحت ختم کر دی گئی۔ اس فیصلے کی اہمیت اس وقت کئی گناہ بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زمینداری کے خاتمے کی پالیسی خواجہ ناظم الدین نے تشکیل دی جو صوبے کے وزیراعلیٰ تھے۔ بنگال کی قانون ساز اسمبلی میں مذکورہ قانون کا مسودہ نور الامین نے منظوری کیلئے پیش کیا تھا۔ خواجہ سر ناظم الدین نوابین ڈھاکہ کے چشم و چراغ اور مشہور جاگیردار اور رئیس تھے۔ نور الامین ایک متوسط درجے کے وکیل تھے۔ 1948ء کے اواخر میں جب خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنا دیا گیا تو نور الامین ان کی جگہ وزیراعلیٰ مقرر ہوئے۔

آزادی کے کچھ ہی عرصے یعنی ایک سال سے قدرے زائد مدت بعد پاکستان پر ایک بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ جناح بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور ان کے خاص نائب لیاقت علی خاں کو تین سال بعد قتل کر دیا گیا۔ ان دو بڑے رہنماؤں کے بعد پاکستان کے پاس صرف ایک بڑے لیڈر خواجہ ناظم الدین رہ گئے تھے۔ جناح کے انتقال کے بعد خواجہ ناظم الدین ان کی خالی جگہ پر آنے کے لئے کراچی آ گئے اور سربراہ مملکت کا منصب سنبھال لیا۔ لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد وہ وزیراعظم مقرر ہوئے۔ حاکمیت کے اعلیٰ عہدوں میں اب تک کوئی بنگالی شامل نہ تھا۔ جناح اور لیاقت کے بعد وہی افسر شاہی سارے اقتدار کا مرکز تھی۔ ناظم الدین بے اختیار تھے حالانکہ خود انگریزوں نے انہیں عظیم تجربے اور

MashalBooks.org

استعداد کا حامل بلند پایہ منتظم تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے یہ شہرت آزادی سے قبل غیر منقسم بنگال کے وزیراعلیٰ ہونے کی بنا پر حاصل کی تھی۔ بنگال میں 1943ء میں قحط پڑ گیا تھا اور ناظم الدین نے اپنی انتظامی چابک دستی سے اس پر قابو پا لیا تھا۔

ان واقعات کے ساتھ ساتھ آزادی کے چند ہی مہینوں کے اندر چند سیاستدان جن میں دور اندیشی زیادہ نہ تھی، اپنی من مانی کرتے ہوئے کشمیر میں مجاہدین بھیجنے لگے تاکہ کشمیر کے ڈوگرہ حکمران کے خلاف بغاوت کر دیں۔ مجاہد عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جنگ کرنے والا، یعنی اسلام اور اسلامی اقدار کے دفاع میں جنگ کرنے والا۔ اس عمل نے پاکستان کو ایک بڑے قضیئے میں الجھا دیا حالانکہ ایک بہت بڑا کام مہاجر آبادکاری کا موجود تھا جس سے لاکھوں پاکستانیوں کی فلاح وابستہ تھی بلکہ خود پاکستان کا وجود داؤ پر لگ گیا تھا۔ اس سے بھی بڑی بات مجاہدوں کا طرزِ عمل تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ کشمیر کی پوری وادی پر قبضہ کر کے ہندوستانی فوجوں کو وہاں آنے سے روک دیتے، انہوں نے بارہ مولا میں مالِ غنیمت بٹورنا شروع کر دیا۔ یہ وادی کشمیر کا پہلا ہی شہر ہے جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اسی طرح ہندوستان کو مہلت مل گئی کہ اپنی فوجوں کو جہازوں کے ذریعے کشمیر میں اتار دے۔ پہاڑوں کی بلندی کے سبب زمینی راستے سے گزرنا ناممکن نہ تھا۔ ادھر پاکستان میں شدید مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ اس سے بھی کشمیری مسلمانوں نے خود کو تنہا محسوس کیا۔

آزادی کے بعد چند سال کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کے پاکستان میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا تھا جس کی رو سے تمام ہندوستانی مسلمان ایک ہی قوم کے باشندے تھے اور پاکستان سارے مسلمانوں کا وطن تھا۔ پاکستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے ویزا کے بغیر داخلے پر پابندی کا مطلب یہ تھا کہ وہ غیر ملکی تھے۔ [1] یہ درحقیقت دو قومی نظریے پر مرگ آخرین حملہ تھا۔ یہ درست ہے کہ دو قومی نظریہ ایک نعرہ تھا لیکن نعرے جو کچھ کہتے ہیں ان پر عمل کے نتیجے میں وہ حقیقت بن جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں ایک مثال سے کروں گا۔ پاکستان کی طرح اسرائیل کی تشکیل بھی اس نعرے کی بنیاد پر ہوئی تھی کہ دنیا کے سارے یہودی ایک قوم ہیں۔ اگر اسرائیل کے لیڈروں نے دنیا کے سارے یہودیوں کے لئے اور ہر وقت اسرائیل میں

MashalBooks.org

داخلے کی یقینی ضمانت نہ دی ہوتی تو یہ بھی ایک نعرہ ہی رہتا چونکہ آزادانہ داخلے پر کبھی پابندی نہیں لگائی گئی اور تمام یہودی اسرائیل کے شہری تسلیم کئے گئے اور دنیا کے سارے یہودیوں کو ایک قوم تسلیم کرنے کا نعرہ محض نہیں رہا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے پاکستان میں داخلے پر پابندی لگا کر اس کے رہنماؤں نے دو قومی نظریے کو منسوخ کر دیا اور جب 1971ء میں بنگالیوں کو پاکستان سے نکال دیا گیا تو اس منسوخی کی مزید توثیق ہوگئی۔ ایک بار پھر توثیق 1990ء کے برسوں میں ہوئی جب پختون، سندھی، سرائیکی، بلوچ اور بالآخر مہاجر بھی الگ قوم بن گئے حالانکہ اس میں ان کی کوئی خطا نہ تھی پاکستانی قیادت کی عام حکمت عملی اور تثلیث پر مبنی حکمرانوں کی پالیسیوں نے بطور خاص ان میں سے ہر ایک کو اس ناپسندیدہ فیصلے پر مجبور کر دیا۔ان زعمائے ثلاثہ میں فوجی جنرل، افسران اعلیٰ اور جاگیردار شامل تھے۔ پاکستان 1997ء میں اپنی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بہت سی قوموں میں بٹا ہوا ملک تھا۔

اب ہم پاکستان کی سیاسی صورتحال کی طرف آتے ہیں۔مشرقی پنجاب اور دہلی کے مہاجروں کو اور مغربی یوپی اور راجپوتانہ سے بھی بعض کنبوں کو ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر نکلنا پڑا تھا لیکن جتنی جائیداد مسلمانوں نے ہندوستان میں چھوڑی تھی اس سے زیادہ جائیداد پاکستان میں ہندو چھوڑ گئے تھے۔ میاں افتخار الدین کو جو ایک باصلاحیت جواں سال لیڈر تھے، مہاجر آبادکاری کا وزیر بنایا گیا۔ ان کا زندگی میں ایک مشن تھا اور ان میں دور اندیشی تھی اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ پنجابی معاشرے کی ساخت بنیادی طور پر جاگیردارانہ ہے جو قوم کیلئے نقصان دہ ہے لہٰذا انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی ساری زمین قومی ملکیت میں لے کر مہاجر کسانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ جاگیردار اتنے احمق تو نہ تھے، جو یہ بھی نہ دیکھتے کہ قوم کا بھاری مفاد اپنی جگہ لیکن وہ تجویز ان کے محدود طبقاتی مفاد کے لئے خطرہ تھی۔ انہوں نے افتخار الدین کی تجویز کی شدید مخالفت کی اور انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ میاں افتخار الدین بجائے خود ایک جاگیردار تھے بلکہ بڑے جاگرداروں میں سے ایک تھے لیکن دوسرے ٹھیٹ جاگیرداروں کے برعکس ان کے دل میں اپنے عوام کا درد تھا۔ وہ ایک نادر شخص تھے۔ آخر بہت تباہی پھیلی اور ہندوؤں کی زرعی زمینیں مسلمان جاگیردار مہاجروں کو الاٹ کر دی

گئیں۔ یوں پاکستان کا جاگیردارانہ نظام اور بھی مضبوط ہو گیا۔

جاگیرداروں نے پاکستان کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی وزارت کیلئے بھی خطرہ پیدا کر دیا۔ خواجہ صاحب نے مشرقی پاکستان میں زمینداری ختم کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ یوں مغربی پاکستان کے جاگیردار انہیں جاگیردار طبقے کا غدار سمجھتے تھے۔ افسر شاہی بھی ایک تجربہ کار منتظم اور بڑے مدبر کی موجودگی کو اپنے لئے خطرہ سمجھتی تھی لہٰذا مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور افسر شاہی نے غلام محمد کی سربراہی میں جو لیاقت علی خاں کی وفات کے بعد ریاست کے سربراہ بن گئے تھے، باہم مل کر فوج کے سربراہ ایوب خاں کی خاموش رضا مندی کے ساتھ ناظم الدین کو ہٹانے کے لئے ایک سازش تیار کی۔

سالہا سال کی فکر کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زرعی اصلاحات کے سلسلے میں مشرقی پاکستان کی حکومت کا فیصلہ مغربی پاکستان کے حکمران جاگیردار طبقے کے لئے ایک انتباہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا بڑا صوبہ ایسی ہی زرعی اصلاحات مغربی پاکستان میں بھی نافذ کرے گا چونکہ اس اقدام کی بدولت مغربی پاکستان میں معیشت پر جاگیرداروں کا قبضہ ٹوٹ جاتا لہٰذا یہ فیصلہ یقیناً اس وقت کیا گیا ہو گا کہ مشرقی پاکستان کو فیصلہ کن مرحلے سے باہر رکھا جائے۔ اس کے آغاز میں پیرٹی یعنی برابری کا فارمولا پیش کیا گیا تا کہ مشرقی پاکستان کا اکثریتی صوبہ زرعی اصلاحات جیسے انقلابی اقدامات مغربی پاکستان کے کسانوں کے مفاد میں نافذ نہ کر سکے۔ کالا باغ، گردیزی، گیلانی اور قریشیوں کے جاگیردار طبقے کے اندر یہ خاموش سمجھوتہ بعد میں مشرقی پاکستان کے درمیان اس احساس محرومی کا باعث بنا کہ انہیں فیصلے کے اختیارات سے باہر رکھا گیا ہے اور یہی احساس ملک کے دونوں بازوؤں میں علیحدگی کا بڑا سبب بن گیا۔ (2)

ناظم الدین کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے کیلئے پنجاب کے عیار جاگیردار وزیراعلیٰ ممتاز محمد خاں دولتانہ نے ایک سازش تیار کی جس میں افسر شاہی نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ پنجاب کے دوسرے جاگیرداروں کی پشت پناہی کی بدولت انہوں نے مولویوں کو بھڑکایا کہ وہ قادیانیوں کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیں۔ ایجی ٹیشن قابو سے باہر ہو گیا اور ناظم الدین کے علاوہ دولتانہ کے پاؤں بھی اکھڑ گئے، ان کی نوکری گئی جو انہیں پھر واپس نہیں ملی۔ سارے پنجاب میں پھیلی ہوئی نراجیت اور انتشار کو روکنے کے لئے لاہور میں مارشل لاء لگانا

پڑا۔ پورا سیاسی نظام غیر مستحکم ہو کر رہ گیا۔ جرنیلوں نے سیاستدانوں کی کمزوری اور کھوکھلے پن کو اور حکومت کی کمزوری کو بھی دیکھ لیا۔ جاگیردار اور سرکاری عہدیدار دونوں کوتاہ نظر اور خودغرض کے مارے اندھے ہو رہے تھے۔ انہوں نے اس بات کو نہیں سمجھا۔ اس کے فوراً بعد قومی اسمبلی میں جب سالانہ بجٹ بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی ناظم الدین حکومت کے حق میں اعتماد کی ایک زبردست قرارداد بھی منظور کی گئی۔ اس کے باوجود غلام محمد نے اس آئینی شق کی رو سے جو برطانوی وائسرائے کیلئے رکھی گئی تھی، ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ نامور مورخ کے کے عزیز نے غلام محمد بارے میں لکھا ہے۔ ''ملک غلام محمد ایک پنجابی اور سابق سول ملازم تھے، وہ گورنر جنرل بن گئے۔ انہوں نے بڑی جلدی یہ ثابت کر دیا کہ ان میں ہندوستان کے دیگر وائسرائے کی چابک دستی اور اختیارات کے استعمال کی وہی صلاحیت ہے جو اپنے وقت میں جناح میں تھی، ناظم الدین کی برطرفی پورے طور پر غیر جمہوری تھی۔ اس وقت بنگالی اور زیادہ مایوس ہوئے حالانکہ انہوں نے پاکستان کے لئے مغربی پاکستان کے لوگوں سے کہیں زیادہ ووٹ ڈالے تھے۔ (3)

خواجہ ناظم کو نکال دینے کے بعد جاگیرداروں کی بڑی آرزو تھی کہ برطانیہ نے جو اقتدار ان کو عطیہ کیا ہے اس کا تحفظ کریں اور سرکاری افسروں کی خواہش تھی کہ وہ خطرہ ٹل جائے جو ایک ایماندار سیاستدان کی موجودگی سے پیدا ہو سکتا ہے لیکن دونوں فریق کچھ نہیں کر سکتے تھے جب تک فوج کے سربراہ کی رضا مندی نہ ہو اور فوجی سربراہ کے ذہن میں اس کے اپنے مفادات تھے۔ چونکہ مالی خسارہ بڑھتا آیا تھا اور غذائی اجناس کی شدید قلت تھی لہٰذا ناظم الدین فوجی بجٹ میں تخفیف کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کے لئے فوج کے بجٹ میں تخفیف کر کے اس کی تعداد ایک لاکھ 25 ہزار تک لانا چاہتے تھے۔ ادھر امریکہ پاکستان کی فوج کو روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف اسے خوفزدہ رکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ غلام محمد اور ایوب خاں نے اس خطرے سے بچنے کے لئے جو ان تینوں کو لاحق تھا امریکہ کے ساتھ سازش کی۔ (4)

بریگیڈیئر نور احمد حسین ایک لائق احترام اور معروف ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ ایوب کو ناظم الدین سے ایک ذاتی رنجش بھی تھی۔ ایوب نے اپنی ملازمت کی مدت میں توسیع کے لئے درخواست دی تھی اور اپنی سرکاری رہائش گاہ

کی تجدید اور تزئین و آرائش کے لئے رقم کی منظوری مانگی تھی۔ ناظم الدین نے دونوں درخواستیں رد کر دیں۔ پہلی اس لئے کہ وہ ایک غلط مثال قائم کرنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری اس بنا پر کہ اس مکان میں اگر ایک انگریز جنرل رہ سکتا تھا تو ایوب کیوں نہیں رہ سکتے؟ نور احمد حسین نے یہ بھی وثوق سے بتایا کہ ناظم الدین فوج کو صحیح خطوط پر منظّم کرنا چاہتے تھے۔ بریگیڈیئر نور سے میں نے دو وجوہ سے انٹرویو کیا تھا۔ وہ قائد کے اے ڈی سی اور پیشہ وارانہ اہلیت کی بنا پر بہت محترم تھے، فوج کے بہت سے اندرونی معاملات سے واقف تھے اور اس لئے بھی کہ ان کی شادی خواجہ ناظم الدین کے خاندان میں ہوئی تھی۔

غلام محمد کا کردار، جمہوریت کو جڑ سے اکھاڑ دینے اور تباہ کرنے میں بہت اہم تھا۔ یہ پاکستانی قوم سے ان کی صریح دغا بازی کا کردار تھا۔ غلام محمد نے ایسے کئی کام کئے جو آئینی طور پر گمراہ کن اور یقینی طور پر غیر جمہوری تھے۔ انہوں نے وزیراعظم کو برخواست کر دیا جن کو اسمبلی میں اکثریتی ارکان کی تائید حاصل تھی اور ذاتی پسند کی بنا پر ان کی جگہ محمد علی بوگرہ کو جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے وزیراعظم بنا دیا۔ مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی ایک دن پہلے تک خواجہ ناظم الدین کے ساتھ وفادار تھے۔ دوسرے ہی دن اس نے اتفاق رائے سے محمد علی بوگرہ کی تائید کر دی۔ غلام محمد نے قومی اسمبلی کو برخواست کر دیا اور ان کے اس فعل کو فیڈرل کورٹ نے قانونی قرار دے دیا۔ اس کے بعد بننے والی پارلیمنٹ میں مسلم لیگ پارٹی نے اسے درست مان لیا۔ غلام محمد نے ایک نئی کابینہ بنائی جس کے ارکان میں کمانڈر انچیف بھی شامل تھے۔ مسلم لیگ نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ انہوں نے بہت سی صوبائی اسمبلیوں کو کالعدم قرار دے دیا کیونکہ وہ ان کی اس خواہش کو قانونی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں تھی کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ختم کر کے ایک یونٹ بنا دیا جائے۔ ہر صوبے میں مسلم لیگ کے برخواست شدہ وزیراعلیٰ کو برطرف رکھا گیا اور گورنر جنرل نے نیا وزیراعلیٰ نامزد کیا۔ جسے لیگ اسمبلی پارٹی نے تسلیم کر لیا۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں نئے انتخابات ہوئے جس میں مسلم لیگ کا کلیتاً صفایا ہو گیا۔ اس کے باوجود پارٹی مرکز میں حکومت کرتی رہی۔ (5) تاریخ دان کے عزیز کے بیان کے مطابق ''چھوٹے صوبوں نے یہ دیکھا کہ پنجاب یوپی دھڑا اپنے بھرپور عزائم اور کامل مستعدی کے ساتھ ان پر حکومت کر رہا تھا۔'' یوپی سے پروفیسر عزیز کی مراد اقلیتی صوبوں کے اردو بولنے والے

MashalBooks.org

سرکاری افسر تھے جن میں یوپی اور بہار کی بالادستی تھی۔

ضمیر نیازی نے اپنی کتاب ''صحافت پابند سلاسل'' (Press in Chains) میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے کہ افسر شاہی نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں جناح کی تقریر کس طرح ''اسلام کی سربلندی کے لئے'' سنسر کرنے کی کوشش کی۔ ایک اور کوشش لیکن پاکستان کی بدقسمتی سے کامیاب کوشش جس نے جمہوریت کو چولیں ہلا دیں صوبہ سرحد میں کانگریسی حکومت کی برطرفی تھی حالانکہ اسے اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ یہ کام جناح صاحب نے خود کیا۔ جو آزادی کے فوراً بعد ان کی جمہوریت پسندی پر ایک دھبہ تھا۔ یہ فیصلہ ایک ایسی شق کے تحت کیا گیا تھا جو برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں وائسرائے کے استعمال کے لئے رکھی تھی۔ یہ شق غیر جمہوری اور آئین سے بالاتر ہوتے ہوئے آمرانہ اقتدار پر مبنی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سرحد کے وزیراعلیٰ قیوم خاں نے یہ کارروائی ایک سازش کے تحت کی تھی۔ کچھ بھی ہو اس نے مسلم لیگ کی قیادت کا پول کھول دیا تھا۔ ایک سیاسی قیادت جسے سازش کے ذریعے اتنی آسانی کے ساتھ حسب منشا استعمال کیا جا سکے اور خاص طور پر اس صوتر میں کہ اس سے جمہوریت پر زد پڑ رہی ہو ایسی قیادت کو یا تو نااہل کہا جائے گا یا یہ کہ جمہوریت کے ساتھ اس کی وفاداری نہ تھی یا قرین امکان یہ دونوں ہی باتیں ہوں گی۔

باڑا کے مقام پر پٹھانوں کے اجتماع پر جو پرامن احتجاج کرنے کے لئے اکٹھا ہوتے تھے، پولیس کی فائرنگ نے پاکستان کی سیاست میں تشدد اور تصادم کی بنیاد رکھ دی۔ یہ ایک روایت تھی جس کی پاسداری پوری وفاداری کے ساتھ ہوتی رہی اور اس عمل کے نتیجے میں قوم 1971ء میں دو ٹکڑے ہو گئی کیونکہ مشرقی پاکستان کو تابع بنانا ضروری تھا۔ پھر 1974ء میں بلوچستان میں فوجی کارروائی ہوئی، 1983ء میں سندھ میں فوجی کارروائی ہوئی اور 1992ء میں کراچی میں فوج کا آپریشن کلین اپ ہوا جو فوج کے واپس ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ عام لوگوں کی گہری مایوسی، احساس محرومی اور غم وغصہ کا یہی سبب تھا اور یہی بدعہدی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1990ء کے عشرے میں حکمرانی کا سارا عمل ناکام ہو گیا۔ پروفیسر عزیز نے اپنی کتاب دی پاکستانی ہسٹورین میں اس صورتحال کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

MashalBooks.org

''تاریخ اور جغرافیے سے پیدا ہونے والے ہر ناگوار عمل کا ازالہ کرنے اور اسے روکنے کی بجائے پاکستان میں اسے اور بڑھایا گیا اور اس میں توسیع کی گئی۔ یہ نتیجہ تھا اس سیاست کا جو یہاں برتی گئی (غالباً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کھیلی گئی) اب میں ایک اور نکتے کی طرف چلتا ہوں۔

اس رسمی حقیقت کو کہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ پاکستانی کی بانی تھی، مختلف نوعیت کا مذہبی رنگ دیا گیا۔ اسے ایک کلیہ، ایک روحانی صداقت اور ایک عقیدہ بنا دیا گیا۔ یہ قوم کا دینی مسلک قرار پایا۔ پاکستان مسلم لیگ نے جو سرکاری طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کی وارث تھی اپنی توانائی، مقبولیت، ساکھ اور شہرت اگست 1947ء کے بمشکل چند ماہ بعد تک باقی رکھی، یہاں تک کہ ستمبر 1948ء میں جناح صاحب کی وفات سے پہلے ہی غم وغصہ کا اظہار سرگوشیوں میں ہونے لگا تھا اور سنائی بھی دیتا تھا۔ حکومت پنجاب کی نااہلی، سرحد میں عبدالقیوم خاں کا آمرانہ کردار سندھ کے سیاسی منظر نامے میں دھڑا دھڑ تبدیلیاں بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملنے میں ناکامی، سرکاری انتظامیہ میں تیزی سے پھیلتی ہوئی کرپشن اور ایسی ہی بہت سی باتوں نے کچھ لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا نئی قومی حکومت ان کی توقعات پر پوری اتر رہی ہے۔ مشرقی پاکستان میں لوگوں کے اندر غصہ زیادہ تھا اور اس وقت نمایاں ہو کر سامنے آ گیا جب جناح صاحب نے علانیہ اور محکم لہجے میں کہا کہ اردو ہی واحد قومی زبان ہوگی۔(6)

بالآخر افسر شاہی نے غلام محمد کی سربراہی میں جو ریاست کے بھی سربراہ تھے، پاکستان فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس منیر کیمنظوری کے ساتھ 1954ء میں آئین ساز اسمبلی برخواست کر دی۔ اب افسر شاہی کا مکمل قبضہ تھا۔ جہاں بھی اسے فائدہ نظر آتا حکومتوں اور اسمبلیوں کو توڑ دیتی۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار سیاستدان، نوکر شاہی کی ہدایات پر پوری وفاداری کے ساتھ عمل کرتے تھے کیونکہ جمہوریت اسی طرح جاگیرداروں کے مفادات کے منافی تھے جیسے وہ افسر شاہی کے فائدوں کے خلاف تھی لیکن بنگالی اتنے تابع دار نہ تھے۔ آبادی میں 57 فیصد ہونے کی بنا پر قومی اسمبلی میں ان کی اکثریت تھی۔ افسر شاہی نے اس اکثریت کو برابر کی سطح پر لانے کیلئے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ایک چال چلی اور ماہرانہ انداز سے 1956ء کا آئین جاری کیا۔ جس کا مسودہ انہی کے

طبقے کے ایک فرد نے تیار کیا تھا۔ یہ تھے چودھری محمد علی جو ان دنوں وزیراعظم تھے۔ پنجاب، سرحد، سندھ اور ساری ریاستوں کو، بلوچستان سمیت جو براہ راست مرکزی حکومت کے زیر انتظام تھا، مغربی پاکستان کے ایک انتظامی یونٹ میں ضم کر دیا گیا اور مشرقی پاکستان کو ایک الگ یونٹ بنا دیا گیا یعنی اب بنگال کی 57 فیصد اکثریت کو قومی اسمبلی کے ارکان کی اتنی ہی تعداد منتخب کرنا ہو گی جتنی مغربی پاکستان کی 43 فیصد کو۔ یہ فارمولا ایک فرد ایک ووٹ کے بنیادی جمہوری اصول کے منافی اور صریحاً بے ایمانی کا فارمولا تھا۔ جسے پیرٹی (برابری) کا نام دے کر بنگالیوں کو ان کی جائز اکثریت سے محروم کر دینا تھا۔ بنگالیوں نے اس تمام تر غیر جمہوری بے انصافی کو اس ملک کی خاطر جسے ان کی غالب اکثریت نے بنایا تھا تسلیم کر لیا اور اس طرح پھر قربانی دی۔

جنرل صاحبان ان واقعات کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہوں گے اور منتظر ہوں گے کہ قوم کی مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ یہ مایوسی 1958ء کے وسط تک پوری طرح پھیل چکی تھی اور اکتوبر 1958ء کی فوجی سازش میں جرنیلوں نے ایوب خاں کی زیر قیادت مکمل اقتدار سنبھال لیا جس میں افسر شاہی ان کے چھوٹے معاون کے طور پر شریک ہو گئی۔ وہ انتخابات جو 1945ء کے بعد اب 1956ء کے آئین کے تحت ہونے والے تھے، منسوخ کر دیئے گئے۔ پھر جیسا کہ آمریت میں ہوتا آیا ہے، خوشامدیوں اور جوتے چاٹنے والوں کے ساتھ احتجاجیوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی حالانکہ انہیں سیاست دان کہا جاتا تھا لیکن وہ سارے خوشامدی اور ابن الوقت تھے۔ سیاستدان تو ایک سیاسی عمل کے درمیان پیدا ہوتے اور تربیت پاتے ہیں۔ ایوب نے سیاسی عمل کو یکسر پوری طرح روک دیا۔ ایسے چاپلوس، جنہوں نے سیاستدانوں کا روپ اختیار کیا تھا، مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں منعم خاں تھے۔ احتجاجیوں میں سب سے نمایاں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن تھے۔ بھٹو انتہائی چالاک جاگیردار تھے، وہ برطانیہ کے ایک وفادار ملازم کے بیٹے تھے۔ منعم خاں زیادہ ذہین نہ تھے اور ان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔

چونکہ پاکستان کے باب میں بھٹو کا حوالہ اہمیت رکھتا ہے اس لئے میں ان کے معاملے کا تجزیہ تفصیل سے کروں گا۔ بھٹو کی چاپلوسی کو روزنامہ ڈان کراچی نے اپنے ''اداریے'' دی پری فکس اینڈ فکس'' (The Prefix and Fix) مطبوعہ 28 نومبر

1967ء میں بہت صفائی سے واضح کیا ہے۔ اداریے کی متعلقہ عبارت درج ذیل ہے:

''نام سے پہلے سابق لگ جانے سے مسٹر زیڈ اے بھٹو کے اندر کتنی حیرت ناک تبدیلی رونما ہوئی ہے، وہ ان کی ان تقریروں اور بیانات میں دیکھا جا سکتا ہے، جو آج اخبار میں اس صفحے پر شائع کی گئی ہیں۔ انسان ایک سماجی جانور ہے اور ایک استدلالی جانور کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ لیکن مسٹر بھٹو نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ تیزی سے بولنے والا جانور بھی ہے۔ وہ اپنی جگہ لومڑی سے بھی زیادہ تیزی سے بدل سکتا ہے اور تیندوے کے برعکس سالہا سال اپنی کھال کی چتیاں بھی بدل سکتا ہے اور جب وہ بدلتا ہے تو اس کو ساری دنیا بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ آج جو چیز اس کیلئے روشنی ہے وہ کل اندھیرا بن سکتی ہے آج جو سچ ہے، وہی کل جھوٹ ہوسکتا ہے۔ آج جو خیر ہے، کل وہ شر ہوسکتا ہے۔''

مسٹر بھٹو نے جب وہ ایندھن، پاور اور قدرتی وسائل کے محکموں کے وزیر تھے پاکستان اینول 1961ء کیلئے ایک مضمون لکھا، جس میں صدر ایوب کو ''نراجیت سے ہماری نجات کی علامت'' قرار دیتے ہوئے کہا:

''یہ مرد تاریخ ہمارے لئے لنکن سے بھی زیادہ اہم ہے کہ اس نے سختی کئے بغیر انتشار پھیلانے والے رجحانات کو ختم کر دیا اور یہ کام لینن کے کارنامے سے بھی بڑا ہے۔ اس نے کسی سختی اور دباؤ کے بغیر ملک کی معیشت کو اور سماجی مقاصد کو ایک بلند اور روشن سطح پر پہنچا دیا۔ وہ ہمارا اتاترک ہے کیونکہ ترکی کے اس عظیم رہنما کی طرح اس نے قوموں کی برادری میں ہماری فوج کی عزت نفس اور اس کا وقار بحال کیا ہے اور ان سب کے سوا وہ صلاح الدین ہے کیونکہ اسلام کے اس عظیم غازی کی طرح، اس پر عظمت ورثے کے ایک وارث کی مانند اس نے بھی دس کروڑ عوام کے افتخار اور خود اعتمادی کو دوبارہ حاصل کیا ہے کہ یہ زندگی کی سب سے اعلیٰ صفات ہیں جن کے بغیر

لوگ بے روح ہوتے ہیں۔''

ایوب کے دور نے آئندہ برسوں کے لیے پاکستان کی سیاست کا رخ متعین کر دیا۔ اس سے مراد کیا ہے اور اس کے اثرات کیا ہوئے؟ اسے سمجھنا ضروری ہے۔ اس تخمینے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایوب بھی جنوبی کوریا کے لیڈر پارک چنگ کی طرح، جو اس زمانے میں تھے، یہ بڑی خواہش رکھتے تھے کہ پاکستان کے سیاسی کلچر کو مزید خراب ہونے سے روک دیں۔ اگر ایسا تھا تو انہوں نے تو بڑی کوشش سے ایسے طریقے اختیار کئے ہوں گے جو بڑھتی ہوئی خرابی کو روک دیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ان کی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' موجود ہے جس کی مدد سے ہم ان کے ذہن کے اندر جھانک سکتے ہیں۔

یہ بات لوگوں کے بخوبی علم میں ہے کہ سندھ اور پنجاب کے صوبوں میں سماجی اور سیاسی مسائل کا بنیادی سبب بڑی حد تک چند ہاتھوں میں اراضی کا مرکوز ہونا ہے۔ انگریز نے انہی جاگیرداروں کے ذریعے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے مغرب اور شمال مغرب میں روسی سلطنت کی پیش قدمی کے خلاف جو قریبی وسط ایشیا سے ہو رہی تھی، اپنی گرفت مضبوط رکھی تھی۔ اس کے علاوہ پنجاب برطانیہ کیلئے وفادار اور سستی افرادی قوت فراہم کرنے کا ذریعہ تھا جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے 1940ء کے خطبہ الٰہ آباد میں کہا ''مسلمانوں کی۔ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب کے مسلمانوں کی تقدیر کا آخری فیصلہ جس کی فوج اور پولیس نے ہی برطانوی حکمرانی کو یہاں ممکن بنایا ہے بالآخر ہندوستان اور ساتھ ہی ایشیا کے مسائل کا حل انہی کے ہاتھوں ہو گا۔ اس افرادی قوت کو بڑی بڑی اراضی کے مالک جاگیرداروں کے ذریعے سے ہی متحرک کیا جا سکتا ہے۔ جاگیرداروں کو اس اہم علاقے کو اپنے قابو میں رکھنے اور نادار رکھنے کے صلے میں تاکہ جوان فوج میں بھرتی ہوں، کسانوں پر حکمرانی کے لامحدود اختیارات دے دیئے گئے۔ یہی وہ بے انتہا طاقت تھی جسے جاگیردار آزادی کے بعد بھی اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔

ایوب نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا تعلق حکمران جاگیردار طبق سے تھا۔ دراصل ان کے خاندان کے پاس تھوڑی سی زمینیں تھیں اور ان کا باپ فوج میں ایک چھوٹا سا معمولی درجے کا افسر تھا۔ ایوب نے 1953ء کی سازش میں ان

MashalBooks.org

لوگوں کی خاموشی سے مدد کی جو ناظم الدین کو اقتدار سے ہٹانا چاہتے تھے۔ بالآخر ایوب نے سندھ میں کوٹری بیراج کے نئے نہری علاقے میں پاکستانی فوج کے جرنیلوں کو بڑے بڑے قطعات اراضی الاٹ کر کے ایک نیا جاگیردار طبقہ پیدا کیا اور یوں جاگیرداری نظام کو مستحکم بنایا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ وہ زمین تھی جو سندھی کسانوں سے چوری کی گئی۔ اگر ایوب نے مغربی پاکستان میں زمینیں ضبط کر کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کی ہوتیں تو وہ پاکستانی سماج سے سرطان کے ایک سبب کو جو سب سے بڑا سبب تھا دور کر سکتے تھے۔ جنوبی کوریا کی فوج کے سربراہ پارک چنگ نے بالکل یہی کیا اور جنوبی کوریا بیس سال کے اندر ایک ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ ایوب اور پارک کی فوج بغاوتیں اپنے اپنے ملک میں چند سال کے فرق سے رونما ہوئیں۔ جنوبی کوریا نے ترقی اس لئے نہیں کی کہ اس نے پاکستان کو اپنے لئے نمونہ بنایا تھا۔ اس نے تو اس کے بالکل برعکس کیا۔ پاکستان نے اپنا جاگیرداری نظام برقرار رکھا اور 1990ء کے عشرے میں بھی پسماندہ رہ گیا۔ جنوبی کوریا نے اپنے یہاں جاگیرداری نظام جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور 1980ء کے عشرے میں ہی ایک مکمل ترقی یافتہ ملک بن گیا۔

ایوب عہد کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایوب صریحاً غاصب تھا۔ اس نے ابتداء سے ہی پاکستانی سیاستدانوں کی کمزوریوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان کی نااہلی کو جانچتے ہوئے وہ ان کو تیزی سے کمزور کرتا رہا۔ 1951ء کا راولپنڈی سازش کیس اسی نے بنایا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ پاکستانی فوجی افسروں کے اندر بے چینی نہیں تھی۔ یقیناً وہ بے چین تھے اور وہ ایوب کے لئے خطرہ تھا لہٰذا یہ مقدمہ بنا کر اس نے اپنے حریفوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور سیاسی نظام کو کمزور کر دیا۔ اس کی کتاب سے صاف ظاہر ہے کہ اسی کے سیاسی عزائم تھے اور وہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ انتظامیہ اور سیاسی میدان میں اپنے چیلوں کی مدد سے حکومتوں کو تیزی سے تبدیل کراتا اور اس طرح سیاسی نظام کو برابر غیر مستحکم کرتا تھا۔ جب عام لوگ اس غیر مستحکم صورتحال سے اچھی طرح بیزار ہو گئے تو انہوں نے استحکام کا خواہ وہ کسی بھی صورت میں آئے خیر مقدم کیا۔ 1958ء میں ایوب کی فوجی سازش بہت بڑی غداری تھی۔

حکومت پر ایوب کے قبضے کا پہلا اثر یہ ہوا کہ طاقت سول افسروں کے ہاتھوں

سے نکل کر جرنیلوں کے پاس پہنچ گئی۔ ان میں بنگالی اکثریت کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اکثریت کا اقتدار میں کوئی حصہ نہیں اور اس لئے ریاستی امور میں شراکت نہیں۔ اسی تعلق سے یہ تبدیلی سامنے آئی کہ جو تھوڑے سے تجربہ کار سیاستدان تھے، دوسرے سے بے مصرف اور غیر ضروری ہو کر رہ گئے۔ چونکہ سیاسی عمل روک دیا گیا تھا لہٰذا ریاست کے معاملات چلانے کیلئے مزید سیاستدانوں کی تربیت کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ آمریت یا تو خوشامدی پیدا کرتی ہے یا احتجاجی، سیاستدان پیدا نہیں کرتی۔

جاگیرداری نظام ہندوستانی مسلمانوں اور آزادی کے بعد پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی اور سماجی لعنت تھا۔ ایوب نے نہ صرف یہ کہ اسے ختم نہیں کیا بلکہ جرنیلوں کی وفاداریاں خریدنے اور ناجائز غاصبانہ طاقت کو مزید مستحکم بنانے کے لئے ان میں زمینیں تقسیم کیں اور اس طرح جاگیرداری کو مزید طاقتور بنایا۔ اس مقصد کے تحت ایوب نے صحافیوں اور ادیبوں کی وفاداریاں خریدیں اور اس طرح نام نہاد دانشوروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا جس نے عوام کے مفاد کے خلاف کام کیا۔ نئے اور سچے سرمایہ کاروں کو جنہوں نے اپنے پیسے اور اپنی محنت سے چھوٹی صنعتیں لگائی تھیں۔ ایوب نے ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس مقصد سے اپنے طرف دار سرمایہ داروں کو بڑی بڑی صنعتیں لگانے کے لئے ٹیکس دینے والوں کا سرمایہ بانٹ دیا۔ نوکر شاہی نے ایوب کے لئے بونس واؤچر کی ایک نئی سکیم بنا دی تھی۔ اس کا طریقہ سادہ سا تھا۔ مالدار تاجروں کو یہ آزادی دی گئی کہ پاکستانی مصنوعات غیر ملکی منڈیوں میں جتنی سستی بیچ سکتے ہوں بیچ دیں۔ اس سے جو زرمبادلہ حاصل ہوگا وہ پاکستان میں اپنی بازار کی قیمت سے دو تین گنا زیادہ قیمت پر بیچا سکے گا۔ اس طریقے نے مالدار تاجروں کو ایوب کا گرویدہ بنا لیا کیونکہ اب وہ بونس واؤچرز کی ناجائز دولت سے ضمیر کی ملامت کے بغیر صنعتیں لگا سکتے تھے۔ وہ مال جو برآمدی منڈیوں میں بہت سستا فروخت ہوتا تھا اس کی معمول سے تین گنا زیادہ قیمت اپنے ملک کا ایک عام آدمی ادا کرتا تھا تاکہ برآمدی تاجر کا خسارہ پورا ہو جائے۔

نوجوان فوجی افسروں کو خوش رکھنے اور بڑے افسروں کے خلاف ان کے غم و غصے کے ازالے کے لئے جن میں زیادہ تر جنرل اور کچھ بریگیڈیئر بھی تھے اور جنہیں بڑے بڑے قابل کاشت رقبے مل رہے تھے، ایک نادر طریقہ وضع کیا گیا۔ کراچی میں سینکڑوں

ایکڑ سرکاری زمین ڈیفنس آفیسرز کوآپریٹو سوسائٹی کو نہایت ارزاں دام پر دے دی گئی۔ ٹیکس گزاروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اس زمین کو ڈیولپ کیا گیا۔ اس پر پلاٹ نکالے گئے اور یہ پلاٹ فوجی افسروں کو مکان بنانے برائے نام قیمت پر دے دیئے گئے جن لوگوں کو وہ پلاٹ ملے ان میں سے بیشتر نے انہیں نہایت مہنگے داموں بیچ دیا۔ اس طرح ایوب نے آبادی کے ایک بااثر حصے میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو اس غاصب کے ذاتی طور پر وفادار ہو گئے۔

اپنے ناجائز اقتدار کو محفوظ بنا لینے کے بعد، ایوب نے اپنے گرد خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض عناصر نے جن کے سرغنہ ذوالفقار علی بھٹو تھے، ایوب کا نام تاریخ میں لکھوانے کے لئے ایک نہایت نادر طریقہ نکالا۔ انہوں نے ایوب کو مشورہ دیا کہ کشمیر کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے وہاں تربیت یافتہ چھاپہ مار مجاہدین کے طور پر بھیجیں تا کہ وہ وادی میں گوریلا جنگیں شروع کر دیں۔ اس سے دنیا یہ باور کر لے گی کہ یہ کشمیریوں کی جائز طور پر اپنی بغاوت ہے۔ 1965ء کے وسط میں اس کارروائی کا آغاز ہوا اور بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ کشمیری مجاہدوں کی کامیابیوں کی خبروں سے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ ہوتے گئے۔ اس طرح عوام کو ایوب کا طرفدار بنایا گیا۔ فوری بعد پاکستانی فوج نے ایک محاذ جموں گجرات بارڈر پر جو چھمب جوڑیاں سیکٹر کے نام سے مشہور ہے، کھول دیا۔ یہ گویا ہندوستانی فوج کو سزا دینے کے لئے تھا جو کشمیریوں اور مجاہدوں پر ستم ڈھا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کام جنرل اختر ملک کے سپرد کر دیا گیا تھا جو ایک نہایت اہل جنرل تھے، اگرچہ پاکستانی جرنیلوں میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔ جنرل اختر ملک آناً فاناً جموں میں راوی دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

ہندوستانی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کے فوجی دستے نے 5 اگست 1965ء کو لاہور اور سیالکوٹ کے اضلاع میں بین الاقوامی سرحد کو عبور کر لیا اور مشرق میں پاکستانی علاقے پر سیکڑوں میل تک قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ لاہور میں بی آر بی نہر کے علاقے سے موسوم تھا۔ انہوں نے مزید کئی سو مربع میل زمین ضلع سیالکوٹ میں اپنے قبضے میں لے لی لیکن پاکستان نے راجپوتانہ کے غیر آباد بنجر ریگستان میں واقع ہندوستان کے ہزاروں مربع میل علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اور اخبارات میں کامیابی کی خبریں جس کروفر

سے سنائی جا رہی تھیں ان سے عام لوگ بہت خوش ہوتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ پاکستانی فوج پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیتی اور مجاہدین کشمیر فتح کر لیتے اقوام متحدہ نے مداخلت کر دی اور جنگ بند کرا دی۔ اطلاع یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی اس مداخلت کا اہتمام ''فتح مند پاکستانی حکمرانوں'' نے خود کیا تھا۔ پاکستان کے لوگ اس سے بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے بڑی طاقتوں پر پھٹکار بھیجی جنہوں نے پاکستان کو اس کی اچھی بھلی کامیابی سے محروم کر دیا تھا۔

سوویت یونین نے تاشقند کے مقام پر ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک امن کانفرنس کا اہتمام کیا اس میں جس امن سمجھوتے کی دستاویز پر دستخط ہوئے اس سے پاکستان کی فتح ظاہر نہیں ہوئی تھی جو ان کے یقین کے مطابق پاکستانی فوج نے حاصل کی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی فوجیں بین الاقوامی سرحدیں چھوڑ کر اپنے اپنے علاقے میں واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد بہت سے پاکستانیوں نے ایوب کے خلاف اس بات پر احتجاجی جلوس نکالے کہ پاکستان نے جو کامیابی حاصل کی اس کا تاثر اس سمجھوتے میں نہیں ملتا۔ لوگ بے حد دل شکستہ تھے اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ کانفرنس میں ہندوستان نے ایوب کو چمہ دے دیا۔

پاکستانی قوم کے خلاف یہ تو ایک اور بڑی بدعہدی تھی۔ عام لوگوں کی محرومی کا ازالہ کرنے اور ایوب کی اس ناکامی کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے الطاف گوہر نے جو ایک انتہائی ذہین افسر تھے اور ان کی سربراہی میں نوجوان چلتے پرزوں نے سال 1968ء کو عشرہ ترقی کا نام دے کر ایک جشن منانے کا اعلان کیا کیونکہ اس عشرے کا آغاز ایوب حکومت کی بدولت ہوا تھا۔ پھر تو پورے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دور دور تک اور وسیع پیمانے پر سال بھر تک جشن منائے جاتے رہے۔ ادھر تو وہ جشن، جن کا وجود محض سرکاری سطح پر تھا، منائے جا رہے تھے، مردہ باتیں ہوئیں۔ ملتان کا بجلی گھر بند ہو گیا۔ اس سے مغربی پاکستان کا ایک بہت حصہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس عرصے میں چینی مہنگی ہو گئی۔ عام لوگ مشتعل ہو گئے۔ ایوب کے عشرہ ترقیات کا الٹا اور شدید ردعمل ہوا۔

اب چونکہ تجربہ کار سیاستدان موجود نہ تھے، لہٰذا اس کا خلا خوشامدیوں نے پر کیا جو زیادہ تر مغربی پاکستان کے جاگیردار طبقے سے تھے اور کچھ احتجاجی تھے، جن کا تعلق مشرقی

MashalBooks.org

پاکستان کے متوسط طبقے سے تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو جو برطانیہ کے منظور نظر ایک رئیس کا بیٹا اور سندھ کا جاگیردار تھا، چاپلوسوں میں سب سے آگے تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کی ایک بنگلہ سیاسی جماعت کا کارکن اور ایک سرکردہ احتجاجی (ایجی ٹیٹر) تھا۔ بھٹو ایک نہایت چالاک اور عیار نوجوان تھا۔ وہ ایوب کا وزیر خارجہ تھا۔ اسے تاشقند کے معاہدے سے پیدا ہونے والے عوام کے احساس محرومی کا علما ور اس فتح کا بھی کچا چٹھا معلوم تھا۔ تاشقند کا معاہدہ ہونے کے بعد جوں ہی احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا اس نے بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا اور ہیرو بن گیا۔ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے برطرف کیا گیا تھا، حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، جب ایوب کے خلاف احتجاج نے 1968ء میں زور پکڑا تو اس نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ذریعے جس کا جھکاؤ بظاہر بائیں بازو کی طرف تھا، احتجاجی مہم کی قیادت خود سنبھال لی۔ یہ پارٹی، بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والے چند دانشوروں نے بنائی تھی۔ خود ان کے اندر کرشمہ سازی کی کمی تھی، چنانچہ انہوں نے اسے جاگیردار بھٹو کو پیش کر دیا۔ اس کیلئے یہ ایک خداداد تحفہ تھا۔ اب ایک جاگیردار نے سوشلزم کی تبلیغ شروع کر دی۔ (8)

مجیب، عوامی لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا اس کی بنیاد پر ایک پختہ کار سیاست داں سہروردی نے 1950ء کے عشرے میں رکھی تھی۔ ایوب مارشل لاء کے بعد وہ بیروت میں جلا وطنی کے دوران انتقال کر گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں، انہیں قتل کیا گیا تھا۔ مجیب نے مشرقی پاکستان میں ایوب کے خلاف احتجاج کی مہم اپنے ذمے لی۔ مجیب کو جس چیز نے بے انتہا مقبولیت دی وہ اس کے لئے ایوب کا ''ایک تحفہ'' تھا۔ احتجاج کو شدید تر ہوتے ہوئے دیکھ کر ایوب بوکھلا گئے۔ اب ان کی خفیہ ایجنسیوں نے مجیب کے خلاف سازش تیار کی۔ انہوں نے مجیب پر الزام عائد کیا کہ اس نے جیل میں اسیری کے دوران ہندوستان کی مدد سے حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش کی ہے اور اسے اگرتلہ سازش کیس کا نام دیا گیا۔ اگرتلہ مشرقی پاکستان کے ضلع کومیلا میں ہندوستانی سرحد سے متصل واقع ہے۔ ایوب کی اس سازش کا الٹا ردعمل ہوا اور مجیب کو باعزت طور پر رہا کرنا پڑا۔

ایوب نے بہت سی چالیں چلیں جو ناکام ہوتی گئیں۔ بالآخر انہوں نے 1968ء میں حکومت سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کا ایک سیاسی حل معلوم کرنا چاہا لیکن اس

MashalBooks.org

وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور ایجی ٹیشن اپنے عروج پر تھا۔ فوج کے سربراہ یحییٰ خاں نے 25 مارچ 1969ء کو فوجی کارروائی کر کے ایوب کو برطرف کر دیا اور ایک بار پھر اسی طرح مارشل لاء لگا دیا جس طرح خود ایوب نے 1958ء میں اپنے سیاسی آقاؤں کو برطرف کیا تھا۔ یحییٰ ایوب کے نہایت معتمد جنرل تھے حالانکہ وہ ایک عیاش شخص اور شرابی تھے لیکن انہیں بہت سے بہتر جنرلوں پر فوقیت دے کر فوج کا سربراہ بنایا گیا تھا۔ بنگالیوں کو اس بات کا غصہ تھا کہ عددی مساوات (پیرٹی) کا فارمولہ بنا کر ان کی اکثریت کو ختم کر دیا گیا تھا اور اس غرض سے مغربی پاکستان کی وحدت بنائی گئی تھی۔ یحییٰ نے ان کی اس برہمی کا ازالہ کرنے کے لئے مغربی پاکستان کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا اور بنگالیوں کی اکثریت بحال کر دی۔ اس کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پہلی بار ایک بنگالی افسر کو چیف سیکرٹری بنایا گیا اور صوبائی سیکرٹریوں میں بھی بنگالی افسروں کی اکثریت ہو گئی۔

ان اقدامات کے بعد یحییٰ نے 1970ء کے اواخر میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور اس سے کچھ قبل سیاسی پارٹیوں کی بحالی کا بھی اعلان کر دیا۔ مجیب نے صوبوں کیلئے زیادہ خودمختاری کے اصول پر انتخابات میں مقابلہ کیا، یہ جناح کے چودہ نکاتی پروگرام کے خطوط پر تھا۔ بھٹو کا مطالبہ سب کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان تھا۔ اس کانٹے کے انتخابی معرکے میں مجیب نے مشرقی پاکستان میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ مغربی پاکستان میں جمعیت العلمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے اتحاد نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں کامیابی حاصل کی جبکہ بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کو سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل ہوئی۔ تاہم پورے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے ارکان کی اکثریت تھی لیکن مشرقی پاکستان میں مجیب کی عوامی لیگ کے رائے دہندوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا اس کا بھرپور اظہار مغربی پاکستان میں بھٹو کی پیپلز پارٹی کے لئے نہیں تھا۔

مجیب کے لئے اس واضح اور صریح تائید پر یحییٰ اور اس کے حواری ششدر ہو کر رہ گئے۔ [9] ان کی توقعات بری طرح پامال ہوئی تھیں۔ اقتدار مجیب کے حوالے کیا جانا چاہئے تھا لیکن یحییٰ اپنی صدارت کے لئے مجیب کے ساتھ اقتدار میں شراکت اور اس غرض سے معاملہ کرنا چاہتا تھا۔ عوام کی طرف سے اس صریح اور واضح تائید کے بعد مجیب کی طرح کوئی بھی شخص ایک غاصب کے ساتھ اقتدار میں شرکت گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجیب

MashalBooks.org

نے انکار کر دیا اور یحییٰ نے بھٹو سے معاہدہ کر لیا جو خود بھی ایک غاصبانہ عمل اور مارشل لاء کی پیداوار تھا۔ لیکن بھٹو نے مجیب کے ساتھ اقتدار میں شرکت کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے ایک ہی ملک میں دو اکثریتی پارٹیوں کی ایک انوکھی غیر منطقی دلیل پیش کی۔ یحییٰ نے اس غیر جمہوری مطالبے میں بھٹو کی طرفداری کی۔

یحییٰ نے بھٹو کی خوشنودی کے ساتھ مشرقی پاکستان میں مارچ 1971ء میں فوجی کارروائی شروع کر دی۔ اب جہاں تک بھٹو کی سیاست فراست کا تعلق ہے، بنگالیوں کے خلاف فوجی کارروائی کے شروع ہوتے ہی اس نے کہا ''خدا کا شکر ہے، پاکستان بچ گیا۔'' ہر ہوش مند پاکستانی کے نزدیک یہ جناح کے پاکستان کا خاتمہ تھا۔ عملاً ساری بنگالی آبادی نے اس کے خلاف مزاحمت کی۔ اس میں استثنا ایک نہایت چھوٹی سی اقلیت جماعت اسلامی میں شامل بنگالیوں کی تھی اور ہندوستان سے آئے ہوئے بہاری مہاجرین کی تھی۔

جنرل ٹکا خان جو اپنی سفاکی کیلئے مشہور تھے انہیں مشرقی پاکستان کا فوجی گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ٹکا خاں کی کمان میں فوج کو کھلی چھٹی دے دی جائے۔ چنانچہ یحییٰ جونہی ڈھاکہ سے اسلام آباد روانہ ہوئے، پاکستانی فوج نے پوزیشن سنبھال لی۔ آدھی رات کے وقت ڈھاکہ یونیورسٹی کو گھیرے میں لے کر زبردست گولہ باری کی گئی۔ بے رحمی اور سفاکی کے علاوہ ٹکا خاں انتہائی پیچیدہ مسائل کا آسان ترین حل پیش کر دینے کے لئے مشہور تھا۔ مثال کے طور پر جنگ لڑنے کے لئے بھاری رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے عالمی بینک کو پریشانی لاحق ہوئی جس کا ایک نمائندہ پیٹر کارگل وہاں موجود تھا۔ اس نے ڈھاکہ میں ٹکا خاں سے نقد رقم کی ضرورت اور اس کے مساوی املاک کے معاملے پر سوالات کئے۔ ٹکا خاں نے پہلے تو پوچھا کہ نقدی کی آمد سے کیا مراد ہے۔ کارگل نے وضاحت کی تو ٹکا خاں نے عالمی بینک کی لاعلمی پر نہایت حقارت سے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کارگل سے یوں کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے ''کراچی ہمارا سکیورٹی پرنٹنگ پریس ہے، جو بینک کے نوٹ چھاپتا ہے۔ میں صدر سے کہوں گا اور وہ ٹنوں کے حساب سے نوٹوں کی چھپائی کا حکم دیں گے۔'' یہ کہانی مجھے پیٹر کارگل کے ایک رفیق نے سنائی جن کا تعلق آزادی سیپ ہلے انڈین سول سروس سے تھا۔

مشرقی پاکستان کی کامرانیوں کے حوالے سے ایک اور ایسا ہی واقعہ ہے۔ کلیئر

ہالنگ ورتھ ڈیلی ٹیلی گراف لندن کی نامہ نگار تھی۔ اس نے ٹکا خاں سے ایک انٹرویو میں سوال کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ ٹکا کی فوج نے تین لاکھ بنگالی ہلاک کئے ہیں؟'' ٹکا خاں نے ترنت جواب دیا۔'' نہیں ہم نے صرف تیس ہزار مارے ہیں، فوج میں تعلقات عامہ کے افسروں کے لئے یہ جواب وحشت ناک ثابت ہوا۔ ڈیلی ٹیلیگراف کی سرخی یہ تھی ''پاکستانی فوج نے تیس ہزار بنگالیوں کی ہلاکت کی تصدیق کر دی'' ٹکا کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس نے پاکستانی فوج کے ہاتھوں اپنے ہی شہریوں کو قتل کئے جانیکی تصدیق کی تھی، یہ کسی دشمن فوج کا کام نہیں تھا۔ بی بی سی نے 16 دسمبر 1996ء کو اپنے ایک نشریے اردو اور ہندی میں بنگالی مقتولین کی تعداد تیس لاکھ قرار دی۔ یہ وہ تعداد ہے جس پر وہ اپنے نشریوں میں خاص طور پر 16 دسمبر کے نشریوں میں ہر سال اصرار کرتی آئی ہے یہاں تک 1998ء میں بھی اسی تعداد کا حوالہ دیا۔ پاکستان میں کسی سرکاری ایجنسی نے اس کی تردید نہیں کی۔

پاکستان کے ساتھ اپنا بدلہ چکانے کے لئے ہندوستان نے چھاپہ ماروں کا ساتھ دیا۔ جنرلوں کی نااہلی اور بزدلی کی تلافی پاکستانی سپاہیوں کی شجاعت سے نہ ہو سکی۔ بددیانت اور نااہل جنرل حوصلے ہار چکے تھے۔ انہوں نے امن کی درخوات کی اور اس کیلئے نوے ہزار پاکستانی سپاہیوں اور نوجوان افسروں کو سات ہزار ہندوستانی سپاہیوں کے آگے جنہیں وہاں طیاروں سے اتارا گیا تھا، ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ پاکستان کے عوام کے ساتھ یہ ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی غداری تھی۔ اس صورتحال کا ایک نہایت بھیانک پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ جنرلوں نے بنگالی بہاری فسادات کروائے۔ بنگالیوں کے قتل پر بہاریوں کو بھڑکایا گیا اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بہاریوں کو پاکستان میں لانے کے بجائے وہیں چھوڑ دیا گیا۔ [11] یہ ایک نہایت بدترین غداری تھی۔ کم از کم تیس ہزار پاکستانیوں کے قتل پر جس کی تصدیق ہوگئی تھی، کسی جنرل سے تو کیا، ایک سپاہی سے بھی باز پرس نہیں کی گئی۔

وہ صوبہ جس کی مسلمان آبادی نے قیام پاکستان کے لئے ہندوستان کے دوسرے تمام مسلم اکثریتی صوبوں سے زیادہ ووٹ ڈالے تھے، اس کو پاکستان سے نکال کر بنگلہ دیش بننے پر مجبور کر دیا گیا اور یہ کام ان پاکستانی جنرلوں سے کیا، جنہوں نے سرکار برطانیہ کی نہایت وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کی ستم ظریفی لیکن ستم ظریفی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ جناح 1920ء کے عشرے تک ہندو مسلم اتحاد کی علامت

MashalBooks.org

تھے لیکن جب انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان کے وفاق میں صوبوں کے مکمل حق اختیاری سے انکار کر دیا تو صرف اس وقت انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ مغربی پاکستان کے لیڈروں نے ہمیشہ یہ اعلان کیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے سچے پیروکار ہیں لیکن یہ بھی ایک سنگین المیہ ہے کہ انہی مغربی پاکستان کے لیڈروں نے جو بیشتر پنجاب کے کچھ اور کچھ کراچی کے اردو بولنے والے تھے، 1956ء کے آئین میں نہ صرف یہ کہ صوبوں کے حق خود اختیاری سے انکار کیا بلکہ مشرقی پاکستان کو ان کی اکثریت سے محروم کر دیا۔ انہوں نے جناح کے بجائے گاندھی کی پیروی کی لیکن تعریف کرنی چاہئے بنگالیوں کی، جنہوں نے جناح کے پاکستان کی سلامتی کی خاطر 1956ء کا غیر منصفانہ آئین بھی تسلیم کر لیا تھا۔

اس المیے کی حد یہیں تک نہیں، پنجاب کے شہری متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اور انہی کی سماجی حیثیت کے اردو بولنے والے مہاجروں نے جو ہندوستان سے ترک وطن کر کے کراچی میں آباد ہو گئے تھے بنگالیوں کے خلاف یحییٰ کی فوجی کارروائی کی حمایت کی۔ 1971ء کی فوجی کارروائی کے بعد پنجابیوں اور متوسط طبقے کے کراچی والوں کو یہ حتمی یقین تھا کہ بنگالیوں نے پاکستان توڑ کر اس ملک سے غداری کی ہے لیکن کچھ ذی شعور سیاستدانوں کو ابتداء سے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حکمران طبقے کے لوگ دراصل آزادی ملنے کے بعد ہی سے بنگال سے جان چھڑانے کے لئے حیلے تراش رہے تھے کیونکہ وہ حقیقی جمہوریت کے خطرے سے خائف تھے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان میں جوٹ کی فصل سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ، بنگالیوں کو پاکستان سے نکال باہر کرنے سے پہلے مغربی پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے استعمال کر لیا جائے۔ اس بات کی کوئی تحریری شہادت ''فرام جناح ٹو ضیاء'' کی اشاعت مورخہ 1988ء سے پہلے دستیاب نہ تھی۔ مذکورہ کتاب پاکستان کے چیف جسٹس محمد منیر نے لکھی، جنہوں نے ملکہ برطانیہ کے مقرر کردہ گورنر جنرل کے ہاتھوں ایک خودمختار آئین ساز اسمبلی کی تنسیخ کو جائز قرار دیا تھا۔ ایوب کی حکومت میں وزارت کے عہدے پر منیر کا تقرر ایک فطری انتخاب تھا، ایوب کو معلوم تھا کہ کسی بھی غیر جمہوری مقصد کو جائز قرار دینے کے سلسلے میں منیر پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ انہی سے یہ معلوم ہوا کہ جب وہ 1962ء میں ایوب کی کابینہ میں شامل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا

MashalBooks.org

کہ:

> اسمبلی میں کوئی بھی تعمیری کام نہیں ہو رہا تھا۔ ہر روز پورا دن مشرقی پاکستان کے ارکان کی لمبی لمبی تقریریں سننے میں گزر جاتا تھا جن میں مشرقی پاکستان کے استحصال اور اس صوبے کے ساتھ سوتیلے پن کے سلوک کا گلہ ہوتا۔ ایوب وہ تقریریں ریڈیو پر سنتے اور صورتحال سے بیزار ہو جاتے تھے کیونکہ کوئی بھی وزیر یا اسمبلی کے ارکان میں سے کوئی ایک رکن بھی خواہ اس کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہو یا مغربی پاکستان سے، ان الزامات کی تردید کے لئے اپنی جگہ کھڑا نہ ہوتا۔ میں نے ایوب سے بات کی اور کہا کہ دونوں صوبوں کے درمیان ہم آہنگی یا کوئی مشترکہ مقصد موجود نہیں لہٰذا مشرقی پاکستان سے کہہ دینا چاہئے کہ اپنے معاملات اپنے ہاتھ میں لے اور انہیں خود سنبھالے۔ ایوب نے مشورہ دیا کہ مجھے یہ بات مشرقی پاکستان کے بعض بااثر لیڈروں کے ساتھ کرنی چاہئے۔ ایک روز میں مسٹر رمیض الدین سے باتیں کر رہا تھا جو بنگال یا مشرقی پاکستان میں وزیر رہ چکے تھے۔ میں نے اس معاملے کو ان کے سامنے رکھا تو ان کا جواب نہایت برجستہ اور فوری تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کیا علیحدگی کی بات کر رہا ہوں؟ میں نے جواب دیا جی ہاں، یا اس طرح کی کوئی اور چیز کنفیڈریشن یا زیادہ خودمختاری۔ انہوں نے جواب دیا دیکھئے ہم ہیں اکثریتی صوبہ اور اب یہ معاملہ اقلیتی صوبے کا ہے کہ وہ چاہے تو الگ ہو جائے کیونکہ ہم پاکستانی ہیں۔ بات یہیں ختم ہو گئی اور اسمبلی میں شکایتوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ (12)

جج صاحبان جو فیصلے دیتے ہیں، وہ صریح اور صاف ہوتے ہیں خواہ وہ ہمیشہ درست نہ ہوں۔ یہ فیصلہ ایک نہایت ممتاز جج کا ہے، جس کا تعلق پنجاب کے متوسط طبقے سے تھا۔ ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی شکایتیں منیر اور ایوب دونوں کے خیال میں جائز نہ تھیں اور اس لئے ''بیزار کن تھیں'' نیز حکمرانوں کے خیال میں چونکہ ''دونوں

MashalBooks.org

صوبوں کے درمیان ہم آہنگی اور ایک مشترکہ مقصد'' کا تعین ممکن نہ تھا، اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس خرافات کو برداشت کرنے کے بجائے مشرقی پاکستانیوں سے کہا جائے کہ وہ الگ ہو جائیں۔ منیر کا فیصلہ یہ تھا کہ دونوں صوبوں کے درمیان ہم آہنگی اور کسی مشترکہ مقصد کا تعین ممکن نہ تھا اس لئے بظاہر تو یہ جناح سے کہنا ہوا کہ آپ کا دوقومی نظریہ مہمل تھا۔ یہ خیالات محض انفرادی نہیں تھے، یہ خیالات حکمران گروہ کے تھے۔ اول تو یہ کہ ان خیالات سے جناح کے نظریہ پاکستان کی نفی ہوتی تھی اور دوئم صاف ظاہر ہے کہ یہ حکمران چونکہ عوام کے نمائندے نہیں تھے اس لئے انہیں ان کے مسائل کو سمجھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہ کہ وہ جمہوریت کے معنی اور عوام کے اتفاق رائے کا مفہوم سمجھنے سے عاری تھے۔ تیسری اور نہایت اہم بات یہ کہ اس سے ان کی نااہلی ظاہر ہوتی تھی کیونکہ مشرقی پاکستان کو الگ کر دینے کے بعد پنجاب کے حکمران رائے مفہوم سمجھنے سے عاری تھے۔ تیسری اور نہایت اہم بات یہ کہ اس سے ان کی نااہلی ظاہر ہوتی تھی کیونکہ مشرقی پاکستان کو الگ کر دینے کے بعد پنجاب کے حکمران طبقے اور مغربی پاکستان کی اشرافیہ کے خلاف سندھیوں، پختونوں، بلوچوں اور آخر میں مہاجروں کی شکایات بھی تو ویسی ہی ہیں۔

آدھی صدی گزرنے کے بعد اب جو لوگ منیر کی کتاب پڑھیں گے تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس قوم میں منیر جیسے افراد اعلیٰ ترین عدالتوں کے جج ہوں اس کا یہی حال ہونا چاہئے جو پاکستان کا ہے۔ استحصال کو روکنے میں وزراء کی ناکامی کو جو کہ جج سمجھ نہیں سکتا تھا اس سے کس طرح ممکن تھا کہ وہ عام شہریوں کے حقوق اور انسانیت اور جمہوریت کا تحفظ کرے گا۔ منیر اس سے مستثنیٰ نہیں تھے لہٰذا پاکستان پر جو کچھ گزری ہے وہ سمجھ میں آتی ہے۔

جسٹس حمود الرحمٰن ایک بنگالی تھے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ پاکستان میں رہ گئے۔ انہوں نے جسٹس منیر کے فیصلے پر سخت تنقید کی ہے کہ انہوں نے کیلسینین کے اصول (Kelsenian Doctrine) پر اپنے فیصلے کی اساس رکھتے ہوئے۔ اقتدار کے غاصبوں کو ایک مبہم سا جواز فراہم کر دیا تھا اور فوجی بغاوت کو جائز قرار دے دیا تھا۔ (13)

جسٹس حمود الرحمٰن نے لکھا ''میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ جسٹس منیر نے اول تو کیلسینین کے اصول کی صراحت میں غلطی کی، دوسرے پاکستان کے حقائق اور حالات کے

پیش نظر اس اصول کو منطبق کرنے میں بھی غلطی کی۔ انہوں نے جو اصول وضع کیا ہے وہ درست نہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اسے ایک اچھا قانون تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ (14)

پاکستان کے مصائب و آلام میں ایوب نے محض یہی اضافہ کیا کہ 1951ء کے بعد جمہوریت کو غیر مستحکم کیا بلکہ 1958ء میں اقتدار پر غاصبانہ تسلط کے بعد پاکستان کو سیاسی عمل سے محروم کر دیا اور مخلص سیاستدانوں کی تربیت کا عمل رک گیا اور یوں پاکستان پارہ پارہ اور جاگیرداری مستحکم ہو گئی۔ اس سے مضرت رساں خوشامد خوروں کو فروغ ہوا تھا جن کی سماج سے کوئی وفاداری نہ تھی۔ سرکاری افسروں کو انہوں نے بے حوصلہ کیا اور تعلیم کے نظام کو مسخ کر دیا۔ انہوں نے نہایت لائق افسروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا، جو من مانی کارروائیوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ صرف ان سے کمتر اہلیت کے افسر، بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ صرف نااہل اعلیٰ عہدیدار باقی رہ گئے تھے تاکہ وہ ایوب کی ناجائز خواہشات کی تکمیل بے چوں چرا کرتے رہیں۔

پاکستان کو جو تعلیمی نظام ورثے میں ملا اس کا مقصد برطانوی راج کے لئے مستعد قسم کے کلرک تیار کرنا تھا، بس اتنے ہی مستعد کہ ہدایات پر سوال کئے بغیر عمل کرتے رہیں۔ اس نظام کا ایک طریق عمل تھا۔ یقینی اور غلطیوں سے پاک عمل جس میں اس امر کو یقینی بنا دیا گیا تھا کہ تعلیم یافتہ افراد کو اپنی کوئی رائے نہ ہو، ان میں نئی باتیں سوچنے کی اہلیت اور تحقیق، تلاش اور تجسس کی روح باقی نہ رہے۔ چنانچہ 1947ء اور 1958ء کے درمیانی عرصے میں تعلیم کے نظام کو جو برطانوی حکومت کے زمانے میں تھا، باقی رکھا گیا۔ ایوب نے تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر شریف کی سرکردگی میں ایک تعلیم یافتگان کو ایسا بنایا جائے جن میں اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت نہ رہے اور اگر کوئی قومی یا سماجی شعور ان میں باقی رہ گیا ہو تو وہ اس سے بھی محروم ہو جائیں۔ انہیں آمرانہ حکومتوں کے لئے اس طرح مفید بنایا جا سکتا تھا۔ شریف نے اپنا کام موثر طور پر انجام دیا۔ مثال کے طور پر شریف کے خیال میں ایک کلرک کے پیشے کے لئے تاریخ اور جغرافیے کے مطالعہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی، یہ تو محض عیاشی تھی، چنانچہ ان مضامین کو سکول کے نصاب سے عملاً نکال دیا گیا۔ ''فیلڈ مارشل ایوب خاں کی حکومت نے تاریخ کو ایک مضمون کے طور پر سکولوں سے ختم کرایا۔ اس کی جگہ ایک اور مضمون معاشرتی علوم نے لے لی جو پہلی سے آٹھویں درجے تک کیلئے ہے اور

ایک اور مضمون مطالعہ پاکستان میں شامل کیا گیا ہے جو نویں کلاس سے بارہویں درجے تک کیلئے ہے۔ دونوں مضامین ایک ملغوبہ ہیں، جن میں تھوڑا تھوڑا جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، شہریت، اسلامی تعلیمات اور بین الاقوامی امور کے مضامین شامل ہیں۔ [15] 1865ء کے بعد آنے والا نوجوان ایوب کی تعلیمی اصلاحات کا حاصل ہے۔

یہ سب تو تھا ہی برا۔ اس کی حتمی بالادستی صوبوں میں ٹیکس بک (نصابی کتب) کے بورڈ کے حکام سے ہوگئی۔ اس مقصد کے لئے صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈوں پر لازم ہو گیا کہ وہ اپنی درسی کتب کے مسودے حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کی نیشنل ریویو کمیٹی سے لکھوائیں اور ان کو پیش کریں جو ان کتب کے نظریاتی متون کو جانچنے کے بعد ان کی منظوری دے گی۔'' روزنامہ دی نیشن لاہور نے 9 جون 1994ء کے اداریے میں بالکل صحیح نشاندہی کی کہ درسی کتب کا محاسبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ ہمارے حکمران نہایت منظّم انداز سے تاریخ کو مسخ کرتے آئے ہیں تاکہ اپنے لئے جگہ پیدا کریں اور اپنے سیاسی اقتدار کو برقرار رکھنے اور اسے طول دینے کی گنجائش نکالیں۔ پاکستان کی نصابی کتب میں قاری کیلئے نہایت نادرست حقائق، مسخ شدہ اور مبالغہ آمیز باتیں اور متعصّبانہ عبارتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب کو سرکاری طور پر مرتب اور نصاب میں شامل کیا گیا ہے اور ان میں نجی کاروباری ناشروں کی نمائندہ کتب بھی ہیں جنہیں وسیع پیمانے پر درسی کتب میں رکھا گیا ہے۔ [17] یہی بات دوسرے مضامین پر صادق آتی تھی۔ جیسے زبان اور ادب، سماجی علوم، سیاسیات، فزکس، ریاضی، کیمیا، زوالوجی، نباتیات، انجینئرنگ اور دوسرے مضامین۔

یحییٰ نے اپنے سرپرست ایوب خاں کے خواب کی تعبیر کرتے ہوئے مشرقی پاکستان سے نجات حاصل کر لی اور ان چند سو سرکاری افسروں سے بھی چھٹکارا پا لیا جن میں ابھی کچھ استعداد اور ضمیر کی روشنی باقی رہ گئی تھی۔ جنرل گل حسن نے یحییٰ کو حکومت چھوڑنے پر مجبور کر دیا جس طرح خود یحییٰ نے ایوب کو الگ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کی ذلت آمیز کارروائی کے بعد گل حسن غالباً خود حکومت سنبھالنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے دوسری بہتر بات یہ کہ کہ اپنا کام بھٹو کے سپرد کیا۔ بھٹو کو پاکستانیوں نے حزب اختلاف کے قائد کے طور پر منتخب کیا تھا۔ اس منصب کو انہوں نے نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا لیکن فوج کے سربراہ کی مہربانی سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونا قبول کر لیا۔

MashalBooks.org

بھٹو نے قائدحزب اختلاف بننے سے انکار کر دیا جو انتخابات کے سیاسی عمل کا نتیجہ تھا لیکن فوجی سازش کے عمل میں ریاست کا سربراہ بننے کو ترجیح دی۔ بھٹو بیوقوف تو نہیں تھا لہٰذا اس نے اپنے محسن گل حسن کو اس طرح ٹھکانے لگا دیا جس طرح اپنے سابق محسن ایوب کی چھٹی کر دی تھی۔ بھٹو نے سوچا کہ اب وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کہ دنیا میں یہ اپنی نوعیت کا واحد عہدہ تھا اور امید ہے آخری ہوگا، اپنی حکومت کا آغاز قوم کے نام ایک خطاب سے کیا جس میں اپنے اس عہد کی تکرار کی گئی تھی کہ عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان ملے گا۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ نئے پاکستان میں ہر شہری کو روزگار، اسباب صحت، تعلیم اور بھی بہت کچھ حاصل ہوگا۔ اپنی اصلاحات کے جوش میں اس نے تمام صنعتوں کو، تمام تعلیمی اداروں کو، تمام پاکستانی بینکوں کو اور تمام بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ایوب یا یحییٰ نے سرکاری انتظامیہ کو جتنی شکل بگاڑی تھی بھٹو نے ان سے کہیں زیادہ بگاڑ دی۔ ایوب نے اعلیٰ عہدیداروں کو درجنوں کے حساب سے اور یحییٰ نے سینکڑوں کی تعداد میں نکالا تھا۔ بھٹو نے سب سے پہلے ہزاروں اعلیٰ افسر نکال دیئے۔ اس نے چھوٹے سرکاری عہدیداروں کو بھی نہیں چھوڑا، دوئم بھٹو نے نئے افسروں یہاں تک کہ نہایت اعلیٰ عہدوں پر حاکموں کے تقرر کا ایک نیا نظام نافذ کیا جسے لیٹری انٹری یعنی انتظامیہ میں باہر سے داخلے کا نام دیا گیا۔

بھٹو کو فوری طور پر ایک عبوری آئین نافذ کرنا پڑا تھا اس کے لئے انہوں نے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلایا جس کے ارکان کا انتخاب یحییٰ کے مارشل لاء دور میں ہوا تھا تاکہ آئین کا مسودہ تیار کیا جائے۔ خاصی جرح بحث کے بعد جس میں بھٹو کی یہ کوشش تھی کہ مسودے کی ہر شق میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سیاسی فائدہ رکھا جائے، مسودہ تیار کر لیا گیا۔ چونکہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد انہوں نے وزیراعظم بننے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا آئین کی متعلقہ شق میں وزیراعظم کے لئے کچھ اضافی اختیارات حاصل کرنے کی تجویز بھی تھی۔ بہرطور پاکستان کا وہ پہلا آئین تھا جسے صحیح معنوں میں منتخب نمائندوں نے مرتب کیا اور کامل اتفاق رائے سے منظور کیا، اگرچہ وہ کلیتاً جمہوری آئین نہ تھا۔

بھٹو وزیراعظم بن گئے اور چاروں صوبوں میں حکومتیں قائم ہوگئیں۔ بلوچستان اور سرحد میں جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی۔ سندھ

MashalBooks.org

میں بھی پیپلز پارٹی نے اگرچہ اسے واضح اکثریت حاصل نہ تھی کچھ ارکان کو ساتھ ملا کر حکومت بنا لی۔ آئین نافذ ہونے کے فوری بعد بھٹو نے ہنگامی حالات کو نافذ کر دیا جس کے تحت پاکستانیوں سے ان کے بنیادی جمہوری حقوق چھین لئے اور حکومت کو یہ اختیار دے دیا کہ جسے بھی ناپسند کرتی ہو، گرفتار کر لے۔ یہ ہنگامی حالت دسمبر 1985ء تک برقرار رہی۔ ابھی مسودہ آئین کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ بھٹو نے آئین میں ترمیم شروع کر دی۔ اس نے اپنے مخالفوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا اور بالآخر صوبہ سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں کو جبراً الگ کر کے ان کی جگہ (پاکستان پیپلز پارٹی) کی حکومتیں قائم کر دیں۔ انہوں نے نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) پر پابندی لگا دی جو بعد میں عوامی نیشنل پارٹی یا اے این پی کے نام سے کام کرنے لگی۔ بھٹو نے اپنے سیاسی مخالفوں کو جیل بھیج دیا اور بلوچستان کو جبراً اپنے ساتھ ملانے کے لئے بلوچستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی لیکن بلوچوں نے مقابلہ کیا اور ہتھیار نہیں ڈالے۔ رفتہ رفتہ بھٹو عوام سے کٹ کر اکیلا ہوتا گیا اب اس نے افسر شاہی پر زیادہ بھروسہ کرنا شروع کیا اور پاکستان کے عوام اور سیاست دانوں پر کم سے کم اعتماد کرنے لگا۔ چونکہ وہ ایک چالاک اور عیار شخص تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ 1971ء کی شکست کے باوجود فوجی جنرل اصل طاقت ہیں لہٰذا اس نے اپنے خاص آدمی جنرل ٹکا خاں کو فوج کا سربراہ بنا دیا۔ تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے ٹکا خاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد فوج کی سربراہی کیلئے جنرل ضیاء الحق کا انتخاب کیا۔ ضیاء الحق بہت کم درجے کا افسر تھا اور کچھ ایسا ذہین بھی نہیں تھا۔ اسے دس یا بارہ جنرلوں پر ترقی دی گئی۔ بھٹو نے سوچا کہ اس سے احسان مند ہو کر ضیاء ہمیشہ اسکا وفادار رہے گا۔ عملاً بھٹو نے اپنی ہی پارٹی یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کو الگ چھوڑ دیا تھا۔ عوام اور پارٹی سے تعلق رکھنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو چاپلوسوں اور افسر شاہی کے رحم و کرم پر ڈال رکھا تھا۔ ادھر افسر شاہی نے اس کا خیال رکھا کہ بھٹو کا رابطہ عوام سے نہ ہو، تاکہ وہ ان کے مسائل اور خود افسر شاہی کی نااہلی اور کرپشن سے واقف نہ ہو سکے۔

بھٹو اس عدم استحکام کے باوجود پنجاب اور سندھ کے عوام میں مقبول رہا۔ درحقیقت تنہا پنجاب کی ہی بڑی اہمیت تھی جس کی آبادی پورے پاکستان کی آبادی کا 65 فیصد تھی۔ سندھ کی حمایت اضافی تھی۔ بھٹو کی گرفت آبادی کے اس حصے پر جو نہایت اہم تھا

بدستور برقرار رہی لہٰذا قبل اس کے کہ اس کی شخصیت کا طلسم ٹوٹتا اس نے مارچ 1977ء میں عام انتخابات کا فوری اعلان کر دیا۔ وہ بڑا سخت انتخابی مقابلہ تھا لیکن پاکستان میں انتخابی کارستانیوں سے سبھی واقف ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انتخابات خواہ کتنے ہی صاف ستھرے ہوں بھٹو اسمبلی میں اپنی اکثریت برقرار رکھے گا۔ بھٹو، مرکز اور صوبوں کی اسمبلیوں میں بھاری اکثریت چاہتا تھا تاکہ لوگوں کو یہ دکھا سکے کہ وہ واقعی قائد عوام ہے۔ اس طرح وہ دو تہائی اکثریت کے بل پر آئین کو بھی حسب منشاء اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر سکے گا۔ بھٹو کا تمام اعلیٰ عہدوں پر اپنے وفاداروں کا تقرر انجام کار ایک تباہ کن فیصلہ ثابت ہوا۔

حفیظ کاردار پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک سابق وزیر اور بھٹو کے گہرے دوست تھے۔ اپنی کتاب ناکام امیدیں (Failed Expectations) میں انہوں نے پاکستان کے سابق صدر چودھری فضل الٰہی کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ ''بھٹو نے انتخابی مشینری میں میری موجودگی میں مداخلت کی، اس نے وزیر قانون سے کہا کہ چیف الیکشن کمشنر کو جسے نامزد کیا گیا تھا، یہ پیغام دے دیں کہ ان کا تقرر میری حکومت کی حمایت کی شرط پر ہو گا۔ بھٹو کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔ اس (گالیاں) سے کہہ دو کہ اس کے عہدے میں کسی جمہوریت کسی آزادی کا دخل نہیں۔ لہٰذا اس تابعدار چیف الیکشن کمشنر کو جسے بھٹو نے ہی مقرر کیا تھا اس امر کو یقینی بنانا پڑا کہ وہ اور اس کے وزرائے اعلیٰ بلامقابلہ منتخب ہوں۔ ضلعی انتظامیہ میں اس کے مقرر کردہ لوگوں کا کام یہ تھا کہ کاغذات نامزدگی داخل کرنے والے ان افراد کو آگے جانے سے روک لیں جو اس کے اور وزرائے اعلیٰ کے مخالف ہو سکتے تھے۔ انتخابات کے دن اس کے وفادار عملے نے مصروف اور نہایت حساس طریقوں سے جو پاکستان میں وضع کئے گئے ہیں، پی پی پی کے بہت سے مخالفوں کی شکست کو یقینی بنا دیا۔ چنانچہ بھٹو کو کامل اکثریت حاصل ہو گئی۔ اتنی بڑی اکثریت کہ اب وہ حسب خواہش و ضرورت آئین میں ترمیم کر سکتا تھا۔ حزب اختلاف کے لیڈروں اور بہت سے معاملہ فہم پاکستانیوں نے خیال کیا کہ رائے شماری کے عمل میں دھاندلی ہوئی ہے چنانچہ اس کا فوری ردعمل بڑے شہروں بالخصوص لاہور اور کراچی میں مظاہروں کی صورت میں ہوا۔ بھٹو نے سوچا کہ عام لوگ تو اس کے ساتھ ہیں، یہ احتجاج کچھ دنوں بعد رفع دفع ہو جائے گا لیکن معلوم

ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ اس خیال سے کہ معمولی درجے کے مخالف لیڈر کہیں اہمیت نہ اختیار کر لیں بھٹو کو سیاسی بات چیت شروع کرنا پڑی حالانکہ وہ اس سے ہمیشہ بچتا آیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ نہایت غیر اہم باتوں کو بنیاد بنا کر مذاکرات کو طول دیتا رہا، یہاں تک لیبیا کے سربراہ سے رسمی ملاقات کے لئے لیبیا چلا گیا۔

بھٹو کی لاتعلقی سے پی پی میں بدنظمی اور مایوسی پیدا ہو گئی اور جب تک وہ انتخابات کا اعلان کرتا، پارٹی محض برائے نام باقی رہ گئی تھی اب کوئی منظم سیاسی جماعت باقی نہیں رہ گئی تھی جو احتجاجی مظاہروں کے خلاف اس کا دفاع کرتی۔ چنانچہ احتجاج کے شر کو دور رکھنے اور مظاہرین کو اپنی طرف لانے کے لئے اس نے کچھ اقدامات محض ان پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کی محبت میں وہ مولویوں سے زیادہ مخلص ہے۔ بھٹو کے خلاف احتجاجی مہم میں مولوی آگے تھے۔ بھٹو نے شراب کی فروخت پر پابندی لگا دی اور اتوار کے بجائے جمعہ کی تعطیل کا اعلان کیا۔ اس کے عقائد میں بڑی لچک تھی، اس سے پہلے بھٹو نے قادیانیوں کو کچھ انہی اسباب کے تحت غیر مسلم قرار دے دیا تھا حالانکہ قادیانی پوری طرح اس کی حمایت کر رہے تھے۔

لیکن جون 1977ء میں بھٹو کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی چالیں بے اثر ہو گئیں، چنانچہ وہ سنجیدہ مباحثوں کیلئے جم کر اکیلا بیٹھ گیا۔ اکیلا اس کے لئے کہ اس کی اپنی سیاسی پارٹی بے توجہی اور مایوسی کے باعث سیاسی عمل کی طاقت کھو چکی تھی۔ 4 جولائی 1977ء کو رات گئے امن کی شرائط طے پا گئیں۔ بھٹو کو صرف بیس یا تیس نشستوں پر دوبارہ انتخابات کرانے تھے۔ اس کے مخالفوں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر اس پر اتفاق کر لیا۔ انہیں یہ علم تھا کہ بھٹو کی طلسماتی کشش ابھی باقی ہے اور اس کی کامیابی یقینی ہے۔

بھٹو مذاکرات میں اپنی کامیابی کا جشن منانے کے بعد اطمینان کے ساتھ سونے چلا گیا۔ کوئی آدھی رات کو اس کی خواب نگاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سبب جاننے کے لئے وہ باہر نکلا۔ ایک فوجی افسر نے اسے سلیوٹ کیا اور احترام سے کہا کہ ملک میں مارشل لاء لگ چکا ہے اور اب وہ حفاظتی تحویل میں ہے۔ بھٹو کو اس کے اپنے ہی تابعدار نے برطرف کر دیا تھا۔ چند سال بعد ضیاء الحق نے جس کا انتخاب فوج کی سربراہی کیلئے خود بھٹو نے کیا تھا، اسے پھانسی دے دی۔ جنرلوں نے صاف طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ بھٹو کا جادو

ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اس کی زندگی انکے لئے خطرہ ہوسکتی ہے۔ ضیاء نے ثابت کر دیا کہ عیاری میں وہ بھٹو سے بھی زیادہ چست ہے۔

مستقبل کا مؤرخ جب بھٹو کے عہد پر نظر ڈالے گا تو یہی کہے گا کہ اس وقت تک پاکستان کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ حکمران بھٹو ہی تھا۔ وہ ایک کرشمہ ساز شخص تھا جسے لوگوں کا دل جیتنا آتا تھا۔ وہ فطین اور نہایت ذہین تھا۔ عقل اس بات پر حیران ہے کہ اس نے محض تیس نشستوں کے لئے جن میں سے کئی نشستیں وہ جیت ہی لیتا مذاکرات کو اتنا طول کیوں دیا؟ جب بھٹو کے مخالفوں کو بھی اس کی کامیابی کا یقین تھا تو اسے انتخابات میں دھاندلی کرنے اور بلامقابلہ انتخاب کا ڈرامہ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟ محض تھوڑے سے سیاسی فائدے کی خاطر اسے تعلیم کو بڑے پیمانے پر قومی ملکیت میں لینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ قومیائے گئے سکولوں اور کالجوں کو چلانے کے لئے سرکاری خزانے میں پیسہ بھی نہیں تھا۔ صنعتوں کو اس نے قومی ملکیت میں آخر کیوں لیا جبکہ اس کے پاس تربیت یافتہ منیجر انہیں چلانے کے لئے نہیں تھے۔ صنعتوں کو افسر شاہی نے چلایا جس کے تباہ کن نتائج نکلے اور بھاری نقصان ہوا جس کی ادائیگی ٹیکس دہندوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے ہوئی۔ صوبائی حکومتوں کو جنہیں مخالف پارٹیاں دوستانہ طور پر چلا رہی تھیں انہیں غیر مستحکم کرنے کی آخری عجلت کیوں تھی، جبکہ اس سے دشمن زیادہ پیدا ہوئے اور عدم استحکام ظاہر ہوا۔ بلوچوں کے خلاف فوجی کارروائی کر کے اسے کیا فائدہ ہوا، سوائے اس کے کہ جنرلوں کے آگے اس کی نااہلی ظاہر ہوگئی کہ وہ مذاکرات کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر سیاسی مسائل حل نہیں کر سکتا اور جنرلوں کو ایک بار پھر حکومت پر قبضہ کرنے کا عندیہ مل گیا۔ وہ جاگیرداری نظام کو ختم کر کے ایک سماجی انقلاب کے ذریعے تاریخ میں اپنا مقام بنا سکتا تھا، پھر اس نے برسر اقتدار رہنے کے لئے چالاکی اور عیاری کے حیلوں پر کیوں انحصار کیا؟ حکومت میں آنے کے بعد اس نے قوم میں تفرقوں کے گھاؤ کے اندمال کیلئے اور ایوب کی پیدا کردہ خلیج کو پاٹنے کے لئے کوئی تدبیر کیوں نہیں کی؟ اس کے بجائے اس نے اور بھی گھاؤ لگائے، بڑے پیمانے پر لوگوں کو برطرف کر کے اس خلیج کو اور بھی پھیلا دیا، فوجی کارروائیاں کیں، اپنے مخالفوں کو جیل میں ڈالا اور گھروں کی حرمت پامال کی اور آخر میں یہ کہ اسے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے کی ضرورت کیا تھی اور مارشل لاء لگائے رکھنے پر اصرار کیوں تھا، جبکہ وہ

جمہوریت کا دعویدار تھا اور اسے عوام کی تائید کا پورا یقین تھا؟

ان سوالوں کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جاگیردار ہمیشہ جاگیردار ہی رہتا ہے، اس کے جاگیردارانہ تکبر میں تعلیم سے کوئی کمی نہیں آتی۔ کسی قسم کی چالاکی اور محض تعلیم سے کوئی سیاستدان نہیں بنتا۔ ایک خوشامدی جسے آمریت نے اپنے درمیان سے نکال پھینکا ہو، جمہوریت پسند نہیں بن سکتا۔ وہ سیاسی مسائل کو سیاسی طریقے سے حل کرنے کا اہل نہیں رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ مفاہمت کے ذریعے قومی تفرقوں کے زخموں پر مرہم رکھنے اور مسائل کو اتفاق رائے سے حل کرنے کے بجائے بھٹو نے سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنتے ہی اپنے مخالفوں سے معمولی نوعیت کے پرانے تنازع چکانا شروع کردیئے۔ بھٹو تہہ دل سے جاگیردار تھا، آکسفورڈ اور برکلے کی تعلیم کے باوجود جاگیردار ہی رہا۔

بھٹو نے وہ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا اور وہی کیا، جو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا اور اس عمل میں پاکستان اپنے ایک ذہین، مقبول عوام اور کرشمہ ساز لیڈر سے محروم ہو گیا۔ یوں قوم ایک اور غاصب کے رحم و کرم پر رہ گئی جو پہلے سے بھی زیادہ ادنیٰ درجے کا عیار تھا، وہ تھا ضیاء الحق۔

ایوب اور بھٹو نے وہ سارے کرتب آزمائے تھے جنہیں غاصب، آمر اور استبدادی حکمران آسانی کے ساتھ استعمال کرتے آئے ہیں چنانچہ ضیاء کے پاس داؤ پر لگانے کے لئے اسلام ہی رہ گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس نے یہ ہتھیار شریعت اور اسلامی قوانین کو مسخ کرتے ہوئے نہایت موثر طریقے سے استعمال کیا۔ اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اور اخبارات میں اسلام کو اس قدر استعمال کیا کہ لوگ اس سے لاتعلق ہونے لگے۔ لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ عدلیہ نے ضیا کو نظریہ ضرورت کے قانون کے تحت حکمرانی کا جواز مہیا کر دیا۔ اسے یہ اجازت مل گئی، اگرچہ اجازت محدود نوعیت کی تھی کہ وہ بعض اہم مقاصد کی خاطر آئین میں ترمیم کر سکتا تھا۔ یہ اختیار ملتے ہی ضیاء نے پہلی ترمیم یہ کی کہ عدلیہ سے اس کے فیصلوں پر نظر ثانی اور فیصلوں کو کالعدم قرار دینے کا اختیار چھین لیا۔ اب عدلیہ کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسے یہ اختیار خود عدلیہ نے ہی دیا تھا۔ اس کے ساتھ ضیاء الحق نے آئین میں ایک اور ترمیم کے ذریعے کسی بھی جج کو جسے وہ ناپسند کرتا تھا، برطرف کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔

MashalBooks.org

افغان مہاجرین کیلئے ضیاء کی میزبانی سمجھ میں آتی تھی لیکن نام نہاد جہاد میں اس کی بیجا شمولیت نے پاکستان پر کلاشنکوف اور منشیات کی معاشرت کا دروازہ کھول دیا۔ ضیاء کس طرح سوچتا تھا؟ اس کا تو علم نہیں لیکن اس کی حکومت کے اعلیٰ عہدیدار کیا سوچ رہے تھے، اس کا تو علم ہے۔ انہوں نے یہ فلسفیانہ نکتہ نکالا کہ برطانیہ نے انیسویں صدی میں چین سے افیون کی تجارت کے ذریعے بے اندازہ دولت کمائی تھی۔ پاکستان میں منشیات کے اجارہ دار سوداگر مغرب کو اس کے طریقے سے ادائیگی کر رہے تھے۔ میں نے خود اسلام آباد میں اعلیٰ افسروں کو نہایت بے شرمی سے اور اس زعم کے ساتھ کہ وہ حق پر تھے، یہ کہتے سنا تھا۔ اس صورتحال نے اتنے دیو ہیکل منشیات فروش پیدا کر دیئے جنہیں پاکستان کی کوئی بھی حکومت شکست نہیں دے سکتی تھی۔ خود پاکستان میں 1990ء کے عشرے میں لاکھوں کی تعداد میں عادی نشہ خور پیدا ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں کلاشنکوف کی کثرت نے پاکستان کے شہروں میں خاص طور پر کراچی میں نظم ونسق کو غیر ممکن بنا دیا جو اس ملک کا سب سے بڑا شہر اور مالیات اور کاروبار کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اب اس شہر میں دن دیہاڑے ڈکیتیاں، قتل، جبری آبروریزی اور کاریں چھیننے کے واقعات ہر روز کا معمول ہو گئے۔ ان جرائم میں پولیس اور سکیورٹی کے افراد کا آلودہ ہونا اور بھی بری بات تھی۔ ان سب سے سوا بہت سے افغان مہمانوں نے اس دعوے کی بنیاد پر کہ وہ ایک مشترکہ اسلامی ملت کے رکن ہیں، پاکستان میں ہی قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ضیا نے اپنے ناجائز اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش میں معاشرے کی نسلی، لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیاد پر مزید تقسیم کر دیا۔ بھٹو کی شخصیت کے طلسم کو سرے سے ختم کرنے کے لئے جو اس کی پھانسی کے بعد بھی برقرار تھا ضیاء نے اس کے بیٹوں، بیٹی اور بیوی کو بڑی بے رحمی سے ایذائیں دیں۔ اس کا نتیجہ شدید محاذ آرائی کی صورت میں نکلا اور بھٹو خاندان کے لئے تنگ اور بجنگ آمد کے مصداق مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ بھٹو کے بیٹوں نے اسلحہ سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بیٹی جس کی کوئی سیاسی مہارت یا تربیت نہ تھی، سیاست دان بن گئی۔ ضیاء کی ظالمانہ کارروائی کے نتیجے میں وہی پاکستان پیپلز پارٹی جسے بھٹو نے عملاً ختم کر دیا تھا، ایک نئی توانائی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ضیاء نے اپنا سیاسی قدم جمانے کے لئے پنجاب میں ایک چھوٹے سے صنعتکار کے بیٹے کو سیاستدان کے طور پر

آگے بڑھایا۔ وہ بھ ایک تربیت یافتہ سیاستدان بن گیا۔ 1980ء کے عشرے کے اواخر اور 1990ء کے عشرے کی ابتداء میں بھٹو کی بیٹی اور صنعتکار کے بیٹے کو پاکستان کے سیاسی میدان میں من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح فضائی حادثے میں ضیاء کی ہلاکت اور پاکستان کے تقریباً آزادانہ اور شفاف انتخابات اور اگست 1988ء کے بعد سیاسی انتشار کچھ اور بڑھ گیا۔

ضیاء بیشتر وقت قومی سرمائے کا بڑا حصہ اپنے غاصبانہ قبضے کے عدم جواز پر پردہ ڈالنے اور اپنے حلقہ انتخاب یعنی مسلح افواج کو مضبوط بنانے کے لئے صرف کرتا رہا۔ معیشت پر کوئی توجہ نہ تھی اور کاروبار کے لئے بنیادی سہولتوں میں کوئی سرمایہ کاری نہیں تھی۔ چنانچہ اقتصادی حالت برابر بگڑتی رہی۔ چونکہ تعلیم پر بھی کوئی توجہ نہ تھی اس لئے تعلیم کا معیار جو پہلے ہی پست تھا، مسلسل پست ہوتا گیا۔ اس کا نتیجہ بیروزگاری، خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری کی صورت میں نکلا جن کی استعداد تعلیم کے مطلوبہ معیار سے کمتر ہوتی۔ اس کے اثرات سارے ملک میں محسوس کئے گئے لیکن شہروں میں بالعموم اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں خاص طور پر دیکھے گئے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ایک پس پردہ مطالعہ 1980ء کے عشرے کے وسط میں کیا تھا۔ اس مطالعہ کے مطابق کراچی کے ہر تیسرے متوسط گھرانے میں ایک نوجوان بیروزگار تھا۔ معیشت کی سطح جس تیزی سے گرتی گئی، بیروزگاروں کی تعداد بھی اس تناسب سے بڑھتی گئی۔

اوائل 1980ء کے عشرے میں سارے پاکستان میں اور زیادہ نمایاں طور پر کراچی میں یہ شرح بڑھ گئی۔ کراچی میں اس لئے کہ یہاں مختلف نسلی اور لسانی آبادی کا ارتکاز ایک چھوٹے سے علاقے میں ہو گیا تھا اور وہ خاصی بڑی آبادی تھی۔ المیہ یہ تھا کہ پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور داخلی تحفظ کے شعبے پر مامور عملے کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور انہیں غیر معمولی اختیارات دیئے جا رہے تھے لیکن جرائم کی شرح میں پھر بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ حکومتی ادارے بجائے اس کے کہ اپنے اختیارات کو جرائم کے خلاف استعمال کرتے انہیں سیاسی مخالفوں، خاص طور پر بھٹو خاندان کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ سیاسی مخالفوں کے خلاف رویے کے استعمال کی سب سے بڑی مثال یہ تھی کہ 1983ء کی بحالی جمہوریت کی تحریک کو جو تمام تر پرامن تھی سندھ میں خاص طور پر کچل دیا گیا۔ جنرلوں کی کارروائیوں

MashalBooks.org

کے نتیجے میں گاؤں کے گاؤں جلا کر ہموار کر دیئے گئے اور سندھی نوجوانوں کو خاص طور پر بے رحمی سے اور بہت بڑی تعداد میں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ قانون نافذ کرنے والوں کے لئے تحریک آزادی کو کچل دینا جرائم کے خاتمے سے مقابلتًا زیادہ ضروری تھا۔ جرائم جس تیزی سے بڑھ رہے تھے اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں خفیہ ایجنسیاں اور پولیس زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتی گئیں۔ دراصل خفیہ ایجنسیاں اور ان میں انٹر سروسز انٹیلی جنس یعنی آئی ایس آئی عملاً اپنے طور پر خود ایک حکومت بن گئی۔ آئی ایس آئی اس لئے طاقتور ہوگئی کہ اس کے ارکان غاصب حکمران کے سوا کسی اور کے آگے جواب دہ نہیں تھے۔ یہ صورتحال خراب تر ہوگئی کیونکہ افغانی جو پوری طرح مسلح تھے سارے ملک میں اور خاص طور پر کراچی میں پھیل گئے تھے اور ہیروئن اور اسلحہ کی تجارت کو فروغ دے رہے تھے۔

شہروں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری ستم ڈھا رہی تھی لیکن ان کی تعداد دور تک بکھری ہوئی تھی۔ کراچی میں ایک چھوٹے سے علاقے میں ان کا ارتکاز تھا۔ پھر جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں ایک سے زیادہ نسلی اور لسانی گروہوں کے افراد شامل تھے۔ ان میں چونکہ سیاسی اور سماجی شعور نہ تھا اس لیے وہ اپنی بیروزگاری کے اسباب کا تجزیہ کرنے سے معذور تھے چنانچہ انہوں نے دوسرے لسانی اور نسلی گروہوں کو اپنی بیروزگاری کے اسباب کا تجزیہ کرنے سے معذور تھے چنانچہ انہوں نے دوسرے لسانی اور نسلی گروہوں کو اپنی بیروزگاری کا ذمہ دار قرار دینا شروع کیا۔ ان میں اکثریت مہاجر نوجوانوں کی تھی لہٰذا انہوں نے خود اپنے بزرگوں سے بھی بغاوت کر دی اور ان کے مشورے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں ضیاء نے ایک ریفرنڈم کے ذریعے خود کو پاکستان کا صدر منتخب کرا لیا اس ریفرنڈم میں رائے دہی کا عمل کھلا دھوکہ تھا بلکہ اس موقع کیلئے ایک خصوصی مارشل لاء آرڈر جاری کیا گیا تھا جس کے تحت ایسے بیانات کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا جن میں عام لوگوں سے ووٹنگ کا بائیکاٹ کرنے کے لئے کہا گیا ہو۔ تاریخ میں یہ واحد انتخاب تھا جس میں بیلٹ پیپر پر امیدوار کا نام درج نہیں تھا۔ (20) پھر یہ کارنامہ کیسے انجام پایا؟ ووٹروں سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ اسلام چاہتے ہیں؟ ضیاء نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ اقرار کے ووٹ کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ضیاء کو بطور صدر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب منطق

MashalBooks.org

تھی لیکن وہ ڈکٹیٹر ہی کیا ہوا جو ناممکن کو ممکن نہ بنا دے۔ ریفرنڈم میں کامیابی کے بعد ضیاء نے اسمبلیوں کیلئے ایک غیر جماعتی انتخابات کروائے اور جب اسمبلی منتخب ہوگئی تو اسے مجبور کیا کہ تمام ناجائز فیصلوں کو جائز تسلیم کرے اور آئین کی رسوائے زمانہ آٹھویں ترمیم کے ذریعے کامل اختیارات حاصل کئے اور اس کے بعد ہی مارشل لاء اٹھایا۔

کالج کی ایک طالبہ بس کے نیچے آ کر کچلی گئی۔ کراچی کی زیادہ تر بسیں ایک خاص لسانی گروہ کے لوگوں کی ملکیت ہیں، جبکہ وہ لڑکی دوسرے گروہ کی تھی۔ ہر طرف اشتعال پھیل گیا جس سے زبردست لسانی فسادات ہوئے۔ یہ شورش کی ابتداء تھی۔ نسلی فسادات یکے بعد دیگرے ہوتے گئے۔ اس دوران میں ضیاء نے اس اسمبلی کو جسے اپنے انتخاب کی توثیق اور اپنی حکمرانی کا جواز حاصل کرنے کے لئے منتخب کرایا تھا، برخواست کر دیا اور اس کے وزیراعظم محمد خاں جونیجو کو بھی برطرف کر دیا۔ پاکستان کے سیاسی چھٹ بھیوں میں جونیجو ایک اوسط درجے کے لیڈر تھے۔ اگرچہ وہ غیر جماعتی بنیاد پر منتخب ہوئے تھے لیکن انہوں نے آمر کو مجبور کیا کہ وہ سیاسی جماعتوں کو بحال کرے اور یہ کام جونیجو نے وزیراعظم بننے کے دو ہی دن بعد کیا۔ پھر اپنے تقرر کے چند ہی دنوں کے اندر اس نے اعلان کر دیا کہ مارشل لاء اب مزید برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اب آمر کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ وزیراعظم کا ظاہری بھرم رکھنے کے لئے کہ وہ اس قدر بے اختیار بھی نہیں، مارشل لاء اٹھانے پر تیار ہو جائے۔ تاہم اس سے جمہوریت کے مقاصد کچھ آگے بڑھے اور آمر کو انتخابات کرانے کی غلطی کا اندازہ ہوا کہ ایک تابع دار قسم کی اسمبلی اور اپنا مقرر کردہ سیاستدان بھی آمریت کے لئے بے چینی کا سبب بن سکتے ہیں۔

ضیاء نے خفیہ ایجنسیوں کو یہ ذمہ داری سپرد کی تھی کہ وہ پوری قوم کو کسی ایک مقصد کی خاطر ایک مرکز پر متحد نہ ہونے دیں کیونکہ اس سے آمریت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ایجنسیوں نے اس فریضے کو کامیابی سے بلکہ ایسی کامیابی سے جس کا انہیں گمان بھی نہیں تھا، انجام دیا۔ ایک رائے یہ تھی کہ کراچی میں نسلی فسادات اگر حقیقتاً ایجنسیوں نے نہیں کرائے تو ان فسادات کو بڑھایا ضرور۔ بعض لوگوں کو یقین تھا کہ اس کا سلسلہ اس وقت ایجنسیوں نے ہی شروع کیا جب ان کے اپنے آدمیوں نے یا ان کے تنخواہ دار افراد نے کراچی کی افغان بستیوں سے نکلنے والے مہاجروں کے ایک جلوس مہاجروں کے ایک جلوس

MashalBooks.org

پر جو حیدرآباد جا رہا تھا، گولی چلائی۔ حیدرآباد اندرون سندھ کراچی سے شمال میں سو میل کے فاصلے پر ہے۔ گویا قومی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کراچی کے نسلی فسادات کافی نہ تھے۔ انہوں نے ایک اور جلوس حیدرآباد میں اپنے تنخواہ دار لوگوں کے ذریعے نکلوایا اور مہاجر کثیر تعداد میں قتل کئے گئے۔ یہ ہولناک سانحہ پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں انجام کو پہنچا۔ ایجنسیوں نے جس تفرقے کا منصوبہ بنایا تھا وہ مکمل ہو گیا کیونکہ اس عمل کے صحیح اسباب و نتائج کو سمجھنے کے لئے ان میں بھی پختہ کار قیادت کی کمی تھی۔ اگر ان میں پختہ کار لیڈر ہوتے تو وہ دوسرے نسلی اور لسانی قومیتوں کے لیڈروں سے رابطہ پیدا کرتے اور خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیوں کے اثرات دور کرنے کے لئے کوئی متفقہ منصوبہ بناتے۔

دراصل سندھی مہاجر تعلقات میں پہلے ہی بدمزگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود کہ جاگیرداروں نے مہاجروں کو حقارت سے مکڑہ کہا اور اسے ہی دوسرے تحقیر آمیز سلوک کا نشانہ بنایا لیکن عام سندھیوں نے ان کا خیر مقدم کھلے دل سے کیا۔ مہاجروں میں اکثریت متوسط طبقے کے لوگوں کی تھی تاہم بدقسمتی سے ان کے اندر کچھ جاگیردار بھی تھے۔ سندھی جاگیرداروں سے ان کے مفادات کا ٹکراؤ ہوتا تھا۔ اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت کے لئے انہوں نے پنجابی آبادکاروں کے ساتھ جو بڑے بڑے قطعات اراضی کے مالک تھے اور جن کے اپنے ناجائز مفادات بھی سندھی جاگیرداروں کے ناواجب مفادات سے ٹکراتے تھے، ایک جماعت بنا لی۔ پھر یہ ہوا کہ اپنی گندی جنگ آپس میں لڑنے کے بجائے مہاجر جاگیرداروں اور بڑے بڑے پنجابی آبادکاروں نے اپنے خودغرضانہ مفادات کو باوزن اور باوقار بنانے کے لئے اپنی اپنی قومیتوں کے لوگوں کو بھی اس میں گھسیٹ لیا۔ اس طرح مہاجر جاگیرداروں کی سرکردگی میں ایک مہاجر پنجابی پختون محاذ بن گیا۔ مہاجروں، پنجابیوں اور پختونوں کے متوسط طبقے کے افراد بھی ان کے جال میں پھنس گئے۔ فطری بات تھی کہ سندھی جاگیرداروں نے اپنے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے لوگوں کو ساتھ ملانے کے لئے اس محاذ کو سندھ کے خلاف سازش قرار دیا اس طرح یہ خلیج پوری طرح بن گئی۔ اس تفرقے سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ اول مہاجر متوسط طبقہ چوکنا رہتا اور اس میں اتنی سیاسی اور سماجی بصیرت ہوتی کہ وہ مفاد پرستوں کے جال میں نہ پھنستا کچھ الزام پنجابی متوسط طبقے پر عائد ہوتا ہے جو سندھ میں آباد تھے۔

MashalBooks.org

چھوٹی سی جو ابتداء ہوتی تھی اسے روک کر ضیاء نے پھر بدعہدی کی، نتیجہ یہ کہ سیاسی عمل شروع ہو گیا۔ جونیجو حکومت رکی برطرفی اور اسمبلی کی تنسیخ اب اس غاصب کے کسی کام کی نہ رہی کیونکہ ان واقعات کے جلد ہی بعد وہ ہوائی حادثے میں انتقال کر گیا لیکن اس کے فیصلے سے اور پاکستان کے آئین کو مسخ کر دینے سے صدر کو آمرانہ اختیارات مل گئے اور عدم استحکام یقینی ہو گیا۔ اس کے بعد مختصر مدت کی جو اسمبلیاں اور مختصر عرصے کی جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ ریاست کے معاملات پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکیں۔ چونکہ بیشتر توجہ کراچی پر مرکوز ہوئی، لہٰذا اندرون سندھ خصوصاً دیہات میں قانون اور امن عامہ کی حالت بگڑتی گئی۔ سندھ کی ایک دیرینہ روایت ہے کہ جب کمزور حکومت آتی ہے اور معیشت بھی کمزور ہوتی ہے تو دن دیہاڑے ڈاکے ڈالنے والے دھریل دیہات اور چھوٹے قصبات کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کو خود جاگیردار تحفظ دیتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لوٹ کا مال جاگیردار کا ہو گا اور دھریل کو اس میں سے اچھا خاصا کمیشن مل جائے گا۔ وہ جاگیردار جو دھریلوں کو ہر طرح کے خطرے، یہاں تک کہ سرکاری خطرے سے تحفظ دیتے ہیں، پتھارے دار کہلاتے ہیں۔ جدید دور میں سندھی دھریل کو نہایت جدید اور حساس ہتھیاروں سے مسلح کیا گیا جن میں مشین گنیں، بم اور راکٹ لانچر بھی شامل تھے۔ انہوں نے شاہراہوں پر دن کے وقت بھی آمدورفت مشکل بنا دی تھی اور رات میں نکلنا تو ناممکن تھا۔ جو لوگ تاوان فوراً ادا نہیں کر سکتے تھے، انہیں اغواء کر لیا جاتا تھا اور ان کے قریبی عزیز جب تاوان دے دیتے تو رہائی عمل میں آتی۔ باقی رہا کار چھیننا تو وہ کسی مشغلے کی طرح آسان کام بن گیا تھا۔

بدقسمتی سے دھریلوں کی دلیرانہ وارداتوں کی نقل کراچی میں بھی کی جانے لگی، خاص طور پر اغواء برائے تاوان اور کاریں چھیننے کے واقعات رونما ہونے لگے بلکہ حقیقتاً ایسی ہی وارداتیں دوسرے بڑے شہروں میں اگرچہ کمتر پیمانے پر ہونے لگیں۔ کمتر سے مراد کراچی کی آبادی کے تناسب سے کمتر درجے کی واردات۔

جرائم پیشہ افراد کے علاوہ شہروں میں خاص طور پر کراچی میں منشیات اور اسلحہ کی فروخت اور زمینوں پر قبضہ کرنے والے گروہ یا مافیا پیدا ہو گئے اور یہ سب نہایت سرگرم، بااثر اور طاقتور تھے۔ قتل کی وارداتیں جن کے محرکات سیاسی تھے وہ بھی ہوتی رہیں۔ جبری

MashalBooks.org

رقوم کی وصولی بھی ہوتی رہی جسے بھتے یعنی گزارے کے لئے رقم کا باعزت نام دیا گیا۔ مجرمانہ کام پاکیزہ سیاسی اداروں کے تحت اور ذاتی فائدوں کے لئے اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے کہ دونوں کے درمیان فرق کرنا ممکن نہ رہا۔

1980ء کے عشرے میں دل برداشتہ مہاجر نوجوانوں نے خود اپنی سیاسی پارٹی مہاجر قومی تحریک ایم کیو ایم کے نام سے قائم کر لی۔ ایم کیو ایم نے دوسری سیاسی پارٹیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ معتدل مزاجی سے کام نہیں کیا، اگرچہ اس جنگ جویانہ طریقے سے کیا جیسے دوسری نسلی پارٹیوں نے یا ان گروہوں اور پارٹیوں نے کیا جنہیں ایم کیو ایم کے خلاف تیار کیا گیا تھا اور یہ سب کچھ اس دعوے کے باوجود تھا کہ پاکستانی معیار کے مطابق مہاجر نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ ایم کیو ایم کے پیچھے مہاجروں کی بڑی ٹھوس حمایت تھی جو لوکل باڈیز اور صوبائی و قومی اسمبلیوں کے انتخابات میں ثابت ہو گئی۔ 1988ء کے انتخابات کے بعد ایم کیو ایم اور پی پی پی کے درمیان اشتراک قائم ہوا، لیکن دونوں نے ذمہ دارانہ طرز عمل کو سرے سے ٹھکرا دیا۔ دونوں پارٹیوں کے کارکن، ایک دوسرے کو اغواء کر لیتے اور ان پر تشدد کرتے یہاں تک کہ فوج کے ایک جنرل کو جن کے ذمے کراچی تھا ''جنگ بندی اور قیدیوں کے تبادلے'' کا بندوبست کرنا پڑا لیکن پاکستان کی سیاسی پارٹیوں میں تفرقے کی جو روایت ہے کہ اس کے برعکس ایم کیو ایم متحد رہی۔ ایم کیو ایم سے ٹوٹ کر الگ ہونے والوں کا صرف ایک چھوٹا سا گروہ تھا جس کی عوام میں جڑیں نہیں تھیں اس کی تصدیق 1993ء کے انتخابات میں ہو گئی۔ اس کے باوصف خرابیاں خراب تر ہوتی گئیں اس فوجی جنرل نے جس کے سپرد کراچی تھا 1991ء میں اس خواہش کا علانیہ اظہار کر دیا تھا کہ وہ ایم کیو ایم میں تفریق چاہتا ہے۔

اس زمانے میں ایک بار ایسا ہوا کہ کراچی کی ایک بستی میں ایم کیو ایم کے کارکنوں نے ایک شخص کی پٹائی کر دی، جس پر الزام تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر فائرنگ کر رہا تھا اور ایم کیو ایم کے دفتر پر قبضے کے لئے مخالف دھڑے کی مدد کر رہا تھا۔ بعد میں اس شخص کو چھوڑ دیا گیا۔ اندرون سندھ دھریلوں کے جرائم اور اس کے سب سے بڑے شہر کراچی میں مجرمانہ وارداتیں پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ اغواء کرنے والے، گاڑیاں چھیننے والے، دن دیہاڑے ڈاکے ڈالنے والے، گاؤں میں، شہروں میں اور شاہراہوں پر ہر جگہ

بڑی آزادی سے وارداتیں کر رہے تھے۔ پولیس اپنے بچاؤ کیلئے بھاگی پھر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب جنرلوں نے حکومت پر زبردست دباؤ ڈالا کہ انہیں جرائم کے خاتمے کے لئے آزادانہ کارروائی کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ 1992ء میں حکومت مزید دباؤ برداشت نہ کرسکی۔

جنرل نے جونہی انتظام سنبھالا ڈکیتیاں اور دوسرے سنگین جرائم جو اندرون سندھ ہو رہے تھے چشم زدن میں ختم ہو گئے۔ اگرچہ کچھ ڈاکوؤں کی ہلاکت کی بھی اسلاع ملی، تاہم جرائم بڑے پیمانے پر ہو رہے تھے ان کے مقابلے میں ہلاکتوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ بہت سے لوگوں نے دعویٰ کیا کہ ڈاکو روپوش ہو گئے ہیں اور موقع پاتے ہی پھر آ جائیں گے۔ انصاف کے نفاذ میں کچھ زیادتی بھی ہوئی۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ کچھ بے گناہ دیہاتی ایک مقابلے میں ڈاکو سمجھ کر مار دیئے گئے بعد میں معلوم ہوا کہ ایک جاگیردار نے اپنے سرکش ہاریوں کو سزا دینے کیلئے ایک فوجی افسر کا تعاون حاصل کیا تھا۔ کورٹ مارشل کے بعد اسی فوجی افسر کو سزائے موت دی گئی۔ کیا اس طرح کی بے انصافیاں اور بھی ہوئیں اور اگر ہوئیں تو کس تعداد میں؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔

جنرل نے فوجی دستے کو حکم دیا کہ کراچی میں پورے کروفر سے داخل ہوں لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ عین اس روز ایک متوازی ایم کیو ایم کے قیام کا اچانک اعلان ہوا جسے حقیقی کہا گیا لیکن حقیقی جس طرح اچانک ظاہر ہوئی۔ ایم کیو ایم اپنے بیشتر لیڈروں سمیت غائب ہو گئی۔ اعلیٰ فوجی اسروں کے پیش نظر ایم کیو ایم کے مفرور رہنماؤں کو گرفتار کرنا تھا لیکن ساری چالاکیوں کے باوجود کوئی بڑا لیڈر گرفتار نہ کیا جا سکا تاہم اب حقیقی نے جگہ لے لی تھی۔ ایم کیو ایم کے کارکنوں کی، جو کچھ ایسے نمایاں بھی نہ تھے، گھائل اور اذیت خوردہ لاشیں ایدھی فاؤنڈیشن کے حوالے سے ان کے رشتے داروں کے سپرد کی جانے لگیں۔ یہ مولانا عبدالستار ایدھی کی قائم کردہ ایک رفاہی تنظیم ہے۔

فوج کے اندرون سندھ داخل ہونے کے بعد دھریل پر اسرار طریقے سے غائب ہو گئے اور اس کے باوجود کہ پتھارے داروں کے خلاف جن کی ایک فہرست حکومت نے فوج کو مہیا کر دی تھی، کوئی کارروائی نہیں ہوئی، امن قائم ہو گیا۔ 72 مجرموں کی فہرست میں جن کے نام افشا ہو گئے تھے، کچھ بڑے جاگیرداروں کے نام بھی شامل تھے جبکہ شہر کے

MashalBooks.org

مجرموں کی تعداد صرف چار تھی۔ کراچی میں قتل اگرچہ کم لیکن پھر بھی ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ جنرلوں کے لئے یہ بات پریشان کن ہوسکتی تھی، ورنہ وہ سندھ سے فوج کو واپس کیوں بلاتے۔ لیکن فوج کی جگہ پیرا ملٹری رینجرز جو اجڈ اور بے رحم تھے، تعینات کرائے گئے۔ ان کے مقابلے میں فوج قانون کی نسبتاً زیادہ پابند اور باضابطہ تھی۔

بعد ازاں ایم کیو ایم کے لیڈروں پر مقدمے کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ جس شخص کو ایذا دی گئی اور مارا پیٹا گیا اور جو اندھا دھند فائرنگ کر کے مخالف عناصر کو ایم کیو ایم کے دفتر پر قبضہ کرنے میں مدد دے رہا تھا وہ سادے لباس میں ایک فوجی افسر تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ کراچی میں فوجی کارروائی کا مقصد اس فوجی افسر کی اہانت کا انتقام لینا تھا جو اپنی خفیہ نوعیت کی ذمہ داری انجام دے رہا تھا۔ یعنی ایک سیاسی پارٹی کے دشمنوں کو مدد دے رہا تھا جو جنرل صاحبان کے لئے ناپسندیدہ تھی، ہر چند کہ وہ اپنے ہی ملک کی پارٹی تھی۔ ظاہر ہے کہ جنرلوں نے مشرقی پاکستان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی کوئی سبق نہیں سیکھا، جہاں وہ اس طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ حالات، بالخصوص کراچی کے حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں کیا گیا اور نہ اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا گیا۔ کراچی کے بند ہونے کے معنی تھے، صرف کراچی کا نہیں بلکہ پوری قوم کا اقتصادی نقصان۔ کچھ ماہرین معاشیات نے کراچی میں ہڑتالوں اور کاروبار کی بندش سے پیدا ہونے والے اقتصادی نقصان کا مطالعہ کیا ہے۔ کراچی میں فسادات کی وجہ سے یومیہ 2.515 بلین کا نقصان ہو رہا تھا جس میں زرمبادلہ کا خسارہ 0.548 بلین، درآمدات کا خسارہ 0.822 بلین، مصنوعات کے شعبے میں خسارہ 0.192 بلین، دوسرے شعبوں میں خسارہ 0.638، بلین اور ٹیکسوں کی آمدنی میں 0.315 بلین روپے کا نقصان ہو رہا تھا۔ یہ اعداد و شمار 1994ء کے وسط کے ہیں۔

حقوق انسانی کے کمیشن برائے پاکستان (ایم آر سی پی) نے ممتاز شخصیات پر مشتمل ایک کمیشن کراچی کے حالات کی تفتیش کے لئے بھیجا۔ اس کی رپورٹ ''کراچی، مسئلے کے حل کی تلاش'' (Karachi:Quest for a wayout) کے عنوان سے 2 جون 1995ء کو شائع ہوئی۔ جس میں لکھا تھا ''کراچی کی صورت حال اتنی گمبھیر ہے کہ اسے

اختصار کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں، دہشت اور عدم تحفظ کے احساس نے پوری آبادی کو کرب و اندوہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس صورتحال کو ملک کے اہم مفادات کے لئے سنگین خطرہ سمجھنا چاہئے۔ حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق پولیس کے دستوں اور بکتر بند گاڑیوں کی موجودگی کے باوجود جن میں گرفتار شدہ نظر بند بھرے ہوتے ہیں حکومت کے حق حکمرانی کو بہت زک پہنچی ہے۔ پولیس کا حوصلہ خطرناک حد تک کم ہو گیا ہے۔ پولیس کے نظام انصاف سے عوام کا اعتماد بے حد گر چکا ہے۔ انصاف نافذ کرنے والے ادارے بے گناہ لوگوں اور مجرموں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر ہیں۔ اس وجہ سے عام لوگ انتظامیہ سے اور بھی دور ہو گئے ہیں اور بہت سے لوگوں کے خیال میں دہشتگردی، ریاست کی طرف سے ہونے والی زیادتی کا ردعمل ہے، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور رینجرز نے شہریوں پر جو سختی کی ہے اس سے ان میں گہری مایوسی پیدا ہوئی ہے اور صبر و ضبط باقی نہیں رہا۔ سکیورٹی ایجنسیوں کو ان کے دائرہ اختیار سے باہر استعمال کیا گیا ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں جس کی وجہ سے ان کے درمیان قدرے کم پختہ کار عناصر کو غیر قانونی کارروائیوں میں حصہ لینے کا حوصلہ مل گیا ہے اور اس خیال کی بنا پر سکیورٹی ایجنسیوں کے غیر قانونی اقدامات کے بارے میں ایسی کہانیوں کو بڑی آسانی سے درست مان لیا جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ شکایات ارباب اقتدار تک پہنچتی ہیں تو سرے سے شنوائی نہیں ہوتی اور انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔''

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سخت رویے کا حوالہ محتاط انداز سے دیا ہے۔ عملاً یہ ہوا کہ جب 1994ء میں فوج کی جگہ رینجرز، خفیہ اجنسیوں اور دیگر سکیورٹی ایجنسیوں نے اختیارات سنبھالے تو انہوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا مشکوک لوگ یا وہ لوگ جنہیں ایجنسیوں نے ترجیحاً مشکوک سمجھا، پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے لگے۔ بعض افراد کے سلسلے میں تو پولیس مقابلہ کا ڈرامہ رچانے کا بھی تکلف نہیں کیا گیا اور گولی مار دی گئی۔ سب سے بری بات یہ ہوئی کہ حکمران سیاستدانوں نے بیرون عدالت قتل کے بجائے اسے مجرموں کو دی جانے والی سزا قرار دیا۔ کمیشن نے حقوق انسانی کے معاملے کی ایک اندوہناک تصویر کھینچی ہے، کہ یہ صورتحال سارے ملک میں تھی اور نہ صرف 1995ء میں بلکہ 1996ء کی رپورٹ میں بھی تھی۔ دراصل اس کی اندوہنا کی بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ

MashalBooks.org

1999ء میں مہذب معاشرے کا عملاً خاتمہ ہو چکا تھا۔

جبر و تشدد کا اس سے بڑا اور یقینی ثبوت اور کیا ہو گا جو ریاست کے سربراہ یعنی صدر پاکستان نے فراہم کر دیا۔ صدر پاکستان 12 اکتوبر 1995ء کو کراچی کے مدیران اخبارات اور سینئر صحافیوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو پولیس کے وحشیانہ طرز عمل، پولیس تھانوں کی نیلامی اور جبری بھتوں کی بابت معلوم ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ہاں معلوم ہے۔ اس بیان کو سارے پاکستان میں تمام اخبارات نیا ور خاص طور پر سندھ کے اخبارات نے شائع کیا۔ روزنامہ ڈان (13 اکتوبر 1995ء) کے مطابق صدر لغاری نے کہا کہ انہیں معلوم ہے کہ بہت سے گروہ اور ان میں پولیس بھی شامل ہے جبری بھتے وصول کرتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اس حقیقت کا علم ہے کہ تھانے، پورے پاکستان میں بیچے جاتے ہیں جو نہایت اندوہناک اور قابل مذمت بات ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس معاملے کو قانون کی حدود میں طے کیا جائے، نہ کہ عدالت سے باہر۔ صدر پاکستان ریاستی جبر کا اقرار اس سے زیادہ واضح انداز میں اور کیا کرتے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ بدعہدی حکمرانوں کی نااہلی کا نتیجہ تھی۔ یہ تھے جاگیردار سیاستدان، افسر شاہی کے سرکردہ ارکان اور ان سب کے سوا فوج کے جنرل، جنہوں نے خود اپنے ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھا اور یہ سب کچھ اتنی آسانی سے اس لئے ہوا کہ ملک میں ایسے دانشور نہ تھے، جن کی بات کا اثر ہوتا اور متوسط طبقے کا تعلیم یافتہ دانش مند طبقہ موجود نہ تھا۔ بجائے اس کے کہ حالات کو سیاسی طور پر روبہ راہ لاتے اور منصوبہ بنانے کے لئے کچھ وقت لیتے، فوج نے جس کے سپاہی اور نوجوان افسر چوکس اور نسبتاً کم بددیانت تھے، ان کو ہٹا کر انتہائی بددیانت اور نااہل فوجی دستے یعنی رینجرز مقرر کر دیئے۔ انہوں نے جبر و تشدد میں کئی گناہ اضافہ کیا۔ سزاؤں کا طریقہ، سماجی اصلاح کے بجئے ترجیحاً اختیار کیا گیا۔ بجائے اس کے کہ معیشت کو اوپر اٹھانے اور نجی سرمایہ کاری کو پرکشش بنانے کے لئے سماجی اور اقتصادی دروبست میں توسیع اور بہتری کی صورت نکالتے اور اس میں سرمایہ لگاتے انہوں نے ملکی سرمایہ فوج پر، سکیورٹی اور خفیہ پر لگا دیا۔ مصارف زندگی بڑھ رہے تھے، بیروزگاری پھیل رہے تھے، معیشت کا حال خراب تھا، اخلاقی اور روحانی قدریں

MashalBooks.org

روبہ زوال تھیں اور مفت کی دولت سمیٹنے کے لئے ایک اندھی دوڑ جاری تھی لیکن ایسا کوئی موجود نہ تھا جو یہ محسوس کرتا کہ ایسے حالات میں کوئی فوج چاہے کتنی ہی بااثر ہو اور کوئی پولیس خواہ کتنی ہی مستعد ہو، کچھ نہیں کر سکتی۔

بدعہدی کے اس سارے عمل کا تجزیہ کیا جائے تو ایک سوال سامنے آتا ہے کہ آزادی کے بعد ہی جب خرابیاں شروع ہوئیں تو کسی بھی مرحلے میں اس کے ازالے کی تدبیر کیوں نہیں کی گئی؟ برصغیر میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ چوری اس گھر میں ہوتی ہے جس کا مالک چوکس نہیں رہتا۔ پاکستان کے مالک پاکستان کے عوام تھے۔ ظاہر ہے خرابی شروع اس لئے ہوئی کہ عوام، سیاسی لیڈروں، اعلیٰ افسروں، خوشامدی سرمایہ داروں اور فوجی جنرلوں کو تباہی پھیلانے سے باز نہ رکھ سکے۔ مغرب کے جمہوری ملکوں میں ہوشیار اور خود آگاہ ووٹر جن سیاستدانوں کو منتخب کرتے ہیں ان پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی منتخب فرد صحیح طرح کام نہیں کرتا یا اس کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے کہ غلط راہ پر جا رہا ہے اور بددیانتی بے عملی یا ایسی ہی دیگر غلط باتوں کا مرتکب ہو رہا ہے تو آئندہ انتخابات میں اس کی چھٹی کر دی جاتی ہے۔ سیاستدان سرکاری انتظامیہ کو درست اور موثر حالت میں رکھتے ہیں تاکہ ان کی نوکری بچی رہے۔ اس سے سرکاری افسر بھی مستعد اور دیانتدار رہتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں فوج کے اندر غلط عزائم سر نہیں اٹھاتے اور وہ اپنے پیشہ وارانہ کام سے لگے رہتے ہیں۔

معاشرے عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے قربانیاں دیتے ہیں۔ اس معاملے میں پاکستان کے اندر کیا ہوا؟ یہاں میں اپنے ذاتی اور کچھ اپنے قریبی دوستوں کے تجربات بیان کروں گا۔ میں 1949ء میں لاہور سے کراچی ٹرین کے تیسرے درجے میں سفر کر رہا تھا۔ بہاولپور ریاست کے ایک سٹیشن پر جہاں ابھی سفر کا آدھا راستہ رہ گیا تھا ایک پولیس کانسٹیبل نہایت غصے کی حالت میں ٹرین کے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ڈبہ فوراً خالی کر دیا جائے۔ میں بیس دیگر مسافروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ دوسرے مسافروں نے جو بیچارے غریب دیہاتی تھے، کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، کانسٹیبل نے بدتمیزی سے جواب دیا، میرے افسر کی فیملی کو اس کی ضرورت ہے۔ میں نے جرح کی اور کہا کہ یہ تو بے انصافی ہے۔ یہ سن کر کانسٹیبل بپھر گیا یہاں تک

کہ اس نے بندوق میرے اوپر تان لی۔ اس پر دوسرے مسافروں نے کہا کہ آپ ذرا ٹھنڈے ہو جائیں تا کہ کوئی بڑا حادثہ نہ ہو جائے۔ بالآخر ہمیں ڈبے سے نکلنا پڑا اور ہم میں سے ہر ایک کو دوسرے ڈبوں میں جو پہلے ہی بھرے ہوئے تھے، گھس پس کر اپنے لئے بمعہ سامان جگہ بنانی پڑی۔ یہ قریبی ڈبوں کے مسافروں کی مہربانی تھی، جو ہماری بے بسی کو دیکھ رہے تھے۔

ایک اور واقعہ کچھ یوں ہے کہ میری ملاقات ایک نوجوان اسسٹنٹ سب انسپکٹر سے ہوگئی، جو کم و بیش میری ہی عمر کا تھا۔ وہ سکندر مرزا کی گورنری کا زمانہ تھا۔ اس کے فرائض کی نوعیت خفیہ تھی اور وہ کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ یعنی سی آئی ڈی کے ساتھ منسلک تھا۔ ایک روز میں نے اسے اپنے دفتر میں دیکھا کہ ایک دوسرے پولیس والے کے ساتھ گرما گرم بحث میں مصروف ہے۔ بظاہر وہ معاملہ ایک غلط آدمی سے پستول کی برآمدگی کا تھا۔ جب وہ کانسٹیبل چلا گیا تو میں نے اے ایس آئی سے سوال کیا، پستول کسی غلط آدمی سے کس طرح برآمد کیا جا سکتا ہے؟ وہ ہنسا اور بولا کانسٹیبل کو اوپر سے حکم ملا تھا کہ ایک خاص آدمی کے قبضے سے پستول برآمد کرنا ہو گا۔ اس نے پستول کسی دوسرے آدمی سے برآمد کر لیا۔ میں بہت حیران ہوا میں نے پوچھا لیکن پستول تو اس کے پاس سے برآمد کیا جا سکتا تھا جس کے پاس وہ تھا۔ اب کے وہ اور زیادہ کھل کر ہنسا اور بولا یہ تو ہماری مہارت ہے کہ کسی سے کچھ بھی برآمد کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی تنخواہ ملتی ہے۔ تو کیا کسی معصوم شخص سے بھی؟ میں نے سوال کیا وہ بولا معصوم ہو یا نہ ہو، یہ میرا فرض ہے۔ مجھے تنخواہ اس بات کی ملتی ہے کہ اپنے افسروں کا حکم بجا لاؤں۔ پھر مذاق سے کہنے لگا، ابھی اسی وقت میں اپنے دوست غلام کبریا کے قبضے سے گواہوں کی موجودگی میں کوکین برآمد کر سکتا ہوں۔ اس نے مزید کہا، اگر مجھے حکم دیا جائے تو ایک مولوی کے حجرے سے کنجری برآمد کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ گورنر جنرل کے دولت خانے سے بھی۔ کنجری کے معنی ہیں طوائف اور حجرے کے معنی وہ کمرہ جو مسجد سے متصل ہوتا ہے اور میرا وہ دوست ایک باخبر پولیس مین تھا۔ پنجاب کے متوسط طبقے کا فرد اور ہوشیار پور کا مہاجر تھا۔

تیسرا دفعہ ہمارے ایک قریبی دوست کے تجربے پر مبنی ہے۔ ان کا خاندانی تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا۔ مشرقی پنجاب میں پانی پت کے نواب گھرانے کے فرد تھے۔ دہلی میں جن

دنوں وہ زیر تعلیم تھے، وہ ترقی پسندانہ فکر اور اشتراکیت سے دلچسپی لینے لگے۔ جیسا کہ ساری دنیا میں نوجوان متاثر ہوتے آئے تھے۔ فطری طور پر یہی سوچ رکھنے والے ان کے اور بھی دوست تھے لیکن یہ کم و بیش محض ایک دانشورانہ مشغلہ تھا کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی جاگیر کو یا پرتعیش زندگی کو خیر باد نہیں کہا تھا۔ تاہم کچھ بھی ہو برطانوی ہند کی پولیس ان پر توجہ کئے بغیر کیسے جانے دیتی۔ نواب صاحب پولیس کی نگرانی میں تھے۔ ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی حالانکہ وہ ایک بالکل بیکار بات تھی۔ ایک نواب زادہ اپنی پرتعیش زندگی کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ ایک دہشت گرد، انقلابی کا پرخطر پیشہ کیسے اختیار کر سکتا تھا؟

اس کے بعد آزادی آ گئی۔ میرے وہ دوست لاہور چلے آئے۔ اس طرح ان کی جاگیر مشرقی پنجاب سے مغربی پاکستان منتقل ہو گئی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمین سے انہیں اراضی الاٹ کر دی گئی۔ جس طرح مشرقی پنجاب میں ان کی چھوڑی ہوئی زمین مغربی پنجاب سے جانے والے ہندوؤں کو دی گئی تھی۔ نوابزادہ صاحب پر ایک روز یہ راز منکشف ہوا کہ وہ اب بھی زیر نگرانی ہیں اور نگران وہی پولیس والا ہے جو انگریز دور میں دہلی میں ان پر نگراں تھا۔ آزادی سے پاکستان میں کچھ نہیں بدلا، وہی پولیس، وہی نجی آزادی پر غاصبانہ تسلط اور دیہی زندگی میں پولیس کا دھڑکا۔

یہ متوسط طبقے کی بدعہدی تھی جو بالآخر مہلک ثابت ہوئی۔

حوالے

1۔ غلام کبریا، مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی A Shattered Dream

2۔ عبدالحفیظ کاردار۔ بک ٹریڈرز لاہور۔ Failed Expectations

3۔ کے کے عزیز۔ ویلنگ گارڈ بکس لاہور The Pakistan Historian

4۔ قطب الدین عزیز، دی اسلامک میڈیا کارپوریشن کراچی Exciting Stories to Remember

5۔ کے کے عزیز، ویلنگ گارڈ بکس لاہور The Pakistan Historan

MashalBooks.org

6۔ ایضاً

7۔ سی ایم نعیم، سائر کیوز یونیورسٹی 1979ء

Iqbal Jinnah and Pakistan: The Vision and Reality.

8۔ مصنفہ لارنس زائرنگ

The Enigima of Political Development

9۔ جی ڈبلیو چودھری

Last Days of United Pakistan

10۔ لارنس زائرنگ

Pakistan: Enigma of political Development

11۔ The Military in Pakistan: Image and Reality

12۔ محمد منیر

From Jinnah to Zia

13۔ ہینس کلسن

General theory of Law and State.

14۔ Pakistan Law journal PLD 1972 Sc 152-81

15۔ کے کے عزیز، ونگ گارڈ بکس لاہور۔

The Murder of History in Pakistan, The Pakistan Historian.

17۔ ایضاً

18۔ ازاسٹیفلے کوچی نانک

Elhnic Conflict and Policisation of Pakistan, Pakistan Business Report, August 1994.

19۔ ایضاً

20۔ کے کے عزیز، وینگ گارڈ بکس لاہور۔

The Murder of History in Pakistan.

MashalBooks.org

باب نمبر 7

بدعہدی کے سلسلے کا آغاز

ہندوستان میں 1945ء اور 1946ء کے انتخابات جن سے انجام کار اس ملک کی قسمت کا فیصلہ ہوا نہایت محدود رائے دہی کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ وہ لوگ جو صاحب جائیداد تھے، یا جو کم سے کم، ایک خاص حد تک انکم ٹیکس دیتے تھے یا جنہوں نے گریجوایشن کیا تھا، وہی لوگ ووٹ دے سکتے تھے۔ اس حساب سے آبادی کے بمشکل دس فیصد حصے نے ووٹ دیئے تھے۔ کسانوں اور محنت کش طبقے افراد کو یکسر خارج کر دیا گیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں دس فیصد سے بھی کم لوگ تھے، جنہوں نے قرارداد لاہور کی بھرپور انداز سے حمایت کی تھی۔ اس قرارداد میں ہندوستان کے شمال اور شمال مغرب میں ایک جداگانہ وطن اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

1945ء کے انتخابات میں مسلمانوں کے پاس یہ اختیار تھا کہ یا تو ایک جداگانہ آزاد مسلم پاکستان کا انتخاب کر لیں یا ایک متحدہ ہندوستان میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو گی رہنا پسند کریں۔ پنجابی اور سندھی مسلمان جاگیردار اگرچہ زبردست سیاسی رسوخ رکھتے تھے کیونکہ وہ شہنشاہت کے حمایتی تھی لیکن نہایت معمولی اقلیت میں تھے۔ ان کی ترجیح تو یہ تھی کہ آزادی کے مقابلے میں برطانوی راج خواہ جس صورت میں بھی ہو برقرار رہے۔ اب برطانیہ کے پاس اختیار یہ تھا کہ یا تو بھاری ووٹوں کے فیصلے کو قبول کرے یا شہنشاہت کی حامی مختصر سی تعداد کی خواہش کا احترام کرے۔ برطانیہ نے لوگوں کے فیصلے کا احترام کیا اور اپنی حکومت سے دستکش ہو گئے۔ پاکستان اس لئے قائم ہوا کہ انگریز جمہوریت کا احترام کرتے تھے اور پاکستان اس لئے ٹوٹا کہ پاکستانی جرنیلوں، اعلیٰ افسروں اور جاگیرداروں

MashalBooks.org

کے پاس جمہوریت کیلئے شدید حقارت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بدقسمتی سے مسلم لیگ نے جو ہندوستانی مسلمانوں کی پسندیدہ جماعت تھی کبھی بھی سیاسی عمل کو تسلیم نہیں کیا اور نہ اس پر عمل کیا۔ پارٹی کے اندر سنجیدگی کے ساتھ انتخابات نہیں کرائے اور اس کے پاس کل وقتی اور تجربہ کار سیاسی کارکنوں یا سیاسی لیڈروں کی بڑی تعداد کبھی نہیں رہی۔ مسلم لیگ کے تقریباً تمام سیاستدانوں کا تعلق متمول طبقوں سے تھا جو زیادہ تر جاگیردار یا خوشحال وکلاء تھے۔ بدیہی طور پر آل انڈیا مسلم لیگ میں داخلی طور پر اور خالصتاً جمہوریت کبھی نہیں رہی، جبکہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے اندر یہ بات تھی۔ کانگریس میں بالکل ابتدائی سطح پر بہت سے کارکن تھے کچھ کل وقتی سیاستدان تھے اور ان میں کچھ دانشور بھی شامل تھے، جن کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔

چنانچہ پاکستان نے اپنا آغاز ہی ایک واضح کمی سے کیا۔ یعنی اس سے پہلے کہ 14 اگست 1947ء کی نصف شب کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا اس کی ابتداء ایک ادارے کے طور پر جمہوریت کی نفی اور اس پر شخصیتوں کے تسلط سے ہوئی۔

قائد کی مثال سے جو غیر معمولی حالات میں ایک غیر معمولی آدمی تھے، ان کے بعد آنے والوں نے کوئی مدد نہیں لی۔ بلکہ اس سے ان کے ذہن اور بھی چکرا گئے۔ اس سے بھی سوا ان کے دماغ میں بڑائی کا سودا سما گیا۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے گوش گزار کیا کہ گورنر جنرل کے طور پر انہیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو وزیراعظم کہیں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ بطور گورنر جنرل وہ ہدایت دیں گے کہ وزیراعظم کو کیا کرنا چاہئے اور عملاً یہی ہوا اور اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہوئیں جیسے وہ صوبائی وزارتوں کی تنسیخ حالانکہ ایوان میں ان کے ارکان کی اکثریت تھی۔

جناح کے بعد آنے والے ان کے مقابلے میں حد درجہ معمولی حیثیت کے لوگ تھے لیکن ان (قائد) کی عبا پہننے کے شوق میں وہ اپنے سینے پھلانے لگے۔ مقبول عام حکومتوں کے جو آداب و روایات ہوتی ہیں انہیں ان لوگوں نے معمولی سمجھ لیا اور اپنے ذاتی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ لیاقت علی اگرچہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جمہوری تھے لیکن انہوں نے بھی ہر سیاسی اختلاف کو غداری جانا اور پارلیمنٹ کو حکمران مسلم لیگ کے تابع سمجھا۔ غلام محمد نے ایک ایسی وفاقی حکومت کو جسے اکثریت کی تائید حاصل تھی

اپنے فالج زدہ ہاتھوں سے بیک قلم برطرف کر دیا اور باہر سے اپنی پسند کا وزیراعظم بلوا لیا۔ پھر بعد میں پوری آئین ساز اسمبلی کو بھی فرضی الزامات کے تحت برطرف کر دیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے بھی اپنی باری آنے پر جمہوریت کے بوسیدہ تابوت میں کیلیں گاڑیں اور تقریباً ہر مرتبہ جب عدلیہ سے رجوع کیا گیا تو اس نے بھی اسے قبر میں پہنچانے کی ذمہ داری انجام دی۔

دراصل گڑ بڑ اس کی بنیاد میں پیوست ہے۔ [1] جمہوریت کی ابتداء اس سوال سے ہوتی ہے کہ قومی حاکمیت کا امین کون ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو یہ حق کبھی نہیں ملا، نہ انہوں نے اس کی آرزو کی۔ قرارداد مقاصد نے کہا کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس کے اقتدار اور اختیار کو عوام کی جانب سے ریاست استعمال کرتی ہے۔ لہٰذا ایک طرف حاکم کل اللہ تعالیٰ ہے دوسری طرف اس کے امور کی انجام دہی ریاست کے سپرد ہے، لوگوں کا حوالہ محض اتفاقاً آ جاتا ہے یہ گویا بیچ کے آدمی ہیں، میک گارتھ کی اصطلاح میں دوسروں کو ملانے والا ایک جوڑ۔ پھر عوام کو اگر اتنی کم حیثیت دی گئی تو اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔

مسلمان اشرافیہ کی مسلم لیگ میں قیادت کی تربیت کا کوئی طریق کار موجود نہیں تھا۔ قیادت کو انہوں نے اپنی حد تک پابند رکھا تھا۔ پاکستان میں ایک باضابطہ پیشہ ور سیاستدانوں کا کاڈر کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ جمہوری ملکوں میں سیاستدان بالعموم عام لوگوں کے درمیان سے نکل کر آتے ہیں اور وہ کل وقتی پیشہ ور افراد ہوتے ہیں، ایک طرح سے بااجرت رضا کار، مشنری جذبے سے کام کرنے والے، ان کے لئے ادائیگی پارٹی کے فنڈ سے ہوتی ہے۔ یہ فنڈ لوگوں کے عطیات سے جمع ہوتا ہے اور لوگ یہ عطیے اپنی پسند کی پارٹی کو اپنے فائدے میں ہونے والی سیاسی خدمات کے صلے میں دیتے ہیں۔ چونکہ مسلمان سیاستدان خوشحال اور طبقہ اشرافیہ سے تھے اور کسی سیاسی عمل سے نہیں گزرے تھے لہٰذا انہیں عام لوگوں کے بارے میں کوئی علم ہی نہیں تھا اور نہ انہیں کسی اجرت کی ضرورت تھی۔ پاکستانیوں کے لئے ایک پیشہ ور سیاستدان ایک ممنوعہ جنس تھا۔ وہ اسے بڑی حقارت سے چندہ خور کہتے تھے۔ پاکستان کے معاملے میں یہ بڑی سیاسی محرومی تھی۔ پھر اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ آزاد پاکستان کی پہلی انتظامیہ کو افسرشاہی پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا پڑا۔

MashalBooks.org

نہایت حساس، بااختیار اور بہت اہم منصب وزیرخزانہ کا تھا جو ایک سرکاری عہدیدار ملک غلام محمد کے سپرد کیا گیا۔ غلام محمد کو 1946ء میں برطانوی ہند کی حکومت کی اعلیٰ خدمات کے عوض سلطنت برطانیہ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ انہوں نے اس خطاب کو غالباً اپنی قوم پرستی کا بھرم رکھنے کے لئے چھپائی۔ ان کا تعلق انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس سے تھا۔ کابینہ کا دوسرا اور نہایت اہم عہدہ وزیر خارجہ کا تھا جو ایک وکیل اور ہائیکورٹ کے جج سر ظفر اللہ خاں کو تفویض ہوا جو ایک اور وفادار برطانیہ تھے۔ پھر سیکرٹری جنرل کا ایک نیا عہدہ نکالا گیا جو برطانوی ہند کی حکومت کے اندر نہیں تھا۔ اپنے منصب کے لحاظ سے تو وہ ایک سرکاری افسر کا عہدہ تھا لیکن سیکرٹری جنرل نہایت سیاسی اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ یہ منصب بھی اکاؤنٹ سروس کے ایک اور عہدیدار چودھری محمد علی کو دیا گیا جنہیں سلطنت برطانیہ کی خدمات کے عوض 1942ء میں او بی ای (OBE) اور 1945ء میں سی آئی ای (CIE) کے خطابات دیئے گئے تھے۔ وہ افسر شاہی جو بعد میں پاکستانی بن گئے آزادی سے پہلے بھی باقی ماندہ ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور افلاس اور تعلیم کی کمی کے باعث زیادہ جارحانہ اور بہار کے سوا دوسرے علاقوں میں جاگیرداری نظام کی وجہ سے زیادہ بااختیار تھی۔ یہ اس جاگیرداری کا عطیہ تھا کہ انگریز ہندوستان میں بڑے چین سے حکومت کرتے رہے۔ ہر ضلع کا ڈپٹی کمشنر کسی جاگیردار کو سزا دینے یا انعام سے سرفراز کرنے کے لئے پوری طرح بااختیار تھا اور جاگیردار اپنے کسانوں کو قابو میں رکھنے کے لئے افسر شاہی پر زیادہ تکیہ کرتا تھا۔ اس طرح اعلیٰ سماج کے دوسرے طبقوں کے مقابلے میں یہ لوگ زیادہ بااثر بن گئے تھے۔

ہندو تعلیم میں بہت آگے تھے، اس لئے ان کو آبادی کے تناسب سے زیادہ عہدے حاصل تھے۔ اعلیٰ ملازمتوں میں مثلاً انڈین سول سروس، انڈیا پولیس سروس اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس اور دوسری ملازمتوں میں اس بنا پر مسلمانوں کی نمائندگی کیلئے ایک کوٹہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ آزادی کے وقت ہندوستان کی اعلیٰ ملازمتوں میں بنگالی مسلمانوں کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔ اس طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان سے بھی ان کی کوئی نمائندگی نہ تھی۔ انڈین سول سروس میں سندھ سے دو مسلمان لئے جاتے تھے ان میں سے صرف ایک سندھی آ سکا۔

MashalBooks.org

انڈین سول سروس میں مسلمانوں کا جو کوٹہ مقرر تھا اس میں بالادستی پنجابی اور مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی تھی جن کی تعداد پنجابی مسلمانوں کی تعداد سے قدرے زیادہ تھی۔ آزادی کے موقع پر انڈین سپیریئر سروس اور دیگر مرکزی محکموں کے ملازموں کو برطانوی ہند کی حکومت نے یہ اختیار دے دیا تھا کہ چاہیں تو ہندوستان میں رہیں، بصورت دیگر پاکستان جائیں۔ مسلم لیگ کی قیادت نے ان پر زور دیا کہ پاکستان آئیں۔ بیشتر مسلمان افسروں خاص طور پر سپیریئر سروس کے عہدیداروں نے مسلم لیگ کا مشورہ قبول کرتے ہوئے پاکستان کو ترجیح دی۔ یہاں تک کہ مدراس جیسے دور افتادہ جنوبی ہند سے اعلیٰ افسر پاکستان آ گئے۔

مشرقی بنگال بڑا صوبہ تھا جسے بعد میں مشرقی پاکستان کا نام دیا گیا۔ افسر شاہی میں اس کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ ہوئی، وہی افسر شاہی جو اس وقت سب سے زیادہ طاقتور اور یقیناً پاکستان کا سب سے موثر اور بااختیار ادارہ تھا۔ اس صورتحال کی نزاکت کو بنگالیوں نے اس وقت شدت سے محسوس کیا جب غیر بنگالی اعلیٰ عہدیداروں نے ان کے ساتھ کم وبیش ویسا ہی سلوک کرنا شروع کیا جیسے انگریز کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو ان کا سلوک انگریز افسر سے بھی زیادہ متکبرانہ اور جارحانہ ہوتا تھا۔ ایک اعلیٰ عہدیدار عزیز احمد کے بارے میں مشہور تھا کہ بنگال ایوب خاں جنوری 1948ء سے نومبر 1949ء تک مشرقی پاکستان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ (جی او سی) تھے۔ وہاں سیاسی ارباب اختار سے ان کا برتاؤ جس میں وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور دوسرے سیاستدان بھی شامل تھے۔ ایک برطانوی حاکم کے مخصوص مزاج کی غمازی کرتا تھا۔ وہاں بنگالیوں کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس المناک صورتحال کی جڑیں تو اور بھی گہری ہیں۔[3] ان کا سرا مغربی پاکستان کے ان اعلیٰ افسروں کے رویے اور طرز عمل سے جڑا ہوا تھا جو وہاں مقرر کئے گئے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب میں نے وہاں کے گورنر فیروز خاں نون سے اور چیف سیکرٹری عزیز احمد سے ملاقات کی اور تیل کی ڈرلنگ کے معاملے میں معلومات انکے گوش گزار کرنی چاہیں تو اندازہ ہوا کہ انہیں اس معاملے سے چنداں دلچسپی نہیں کیونکہ مشرقی پاکستان ان کے لئے ایک نو آبادی تھی جسے ترقی دینا ان کے لئے ایک غیر اہم بات تھی۔ یہی مثال دوسرے اعلیٰ عہدیداروں پر صادق آتی تھی۔

MashalBooks.org

جس بات نے بنگالیوں میں بیگانگی کا احساس پیدا کرنا شروع کیا وہ ان پر اردو کا سرکرای زبان کے طور پر نفاذ تھا۔ حالانکہ وہ زبان آبادی کے ایک نہایت قلیل حصے میں بولی جاتی تھی۔ بنگالی اپنی زبان اور ثقافت سے اس طرح محبت کرتے تھے جس طرح کسی بھی باوقار قوم کو کرنا چاہئے۔ آزادی ان کی زبان اور ثقافت کے لئے بھی خطرہ بن گئی تھی۔ آزادی کے لئے ان کی والہانہ تڑپ کا ایک سبب اپنی زبان اور ثقافت کا تحفظ تھا۔ ان کے احساس بیگانگی میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب 1952ء کے لسانی فسادات کے دوران ڈھاکہ میں احتجاج کرنے والوں پر کچھ سوچے سمجھے بغیر گولی چلا دی گئی۔ کئی بنگالی نوجوان جو پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوئے۔ انہوں نے اپنی زبان کے لئے جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ ڈھاکہ میں شہید مینار اس عظیم قربانی کی یادگار ہے۔ غیر بنگالی پاکستانی قیادت نے جسے افسر شاہی کی مدد حاصل تھی وہ نعرہ بلند کرنا شروع کیا جو آزادی سے پہلے ایک کمزور موقف کو تقویت دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ افسوس کہ قیادت میں کسی کو اس بات کی پرواہ نہ تھی اور نہ غالباً ان میں اہلیت تھی کہ وہ مطالعہ کرتے کہ قومیں کس طرح تشکیل پاتی ہیں اور ایک فرد کے لئے اس کی زبان اور ثقافت بالکل اس کے مذہبی عقیدے کی طرح کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اندوہناک بات یہ تھی کہ نہ قیادت کو اور نہ افسر شاہی کو یہ علم تھا کہ ثقافت کیا ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ پاکستان کے وجود کا رسمی اعلان ہوتا افسر شاہی نے کسی اور کی نہیں بلکہ خود جناح کی تقریر پر احتساب کا عمل آزمانا شروع کر دیا لیکن جناح قوم کا انتہائی احترام حاصل تھا، ایسے نہ تھے کہ ان سے زیر ہو جاتے حتیٰ کہ لیاقت پر بھی آسانی سے اثر انداز ہونا ممکن نہ تھا۔ لیکن جب وہ دونوں دنیا سے رخصت ہو گئے تو افسر شاہی انتہائی طاقتور ہو گئی۔اب سرکاری عہدیدار عوام کی منتخب وزارتوں کو بھی برطرف کر سکتے تھے اور ازخود سربراہ مملکت اور وزیراعظم بن سکتے تھے۔ افسر شاہی کو اپنی ان سیاسی سازشوں میں فوج کے جرنیلوں اور افسر شاہی کے اعلیٰ عہدیداروں کو طاقتور بنا دیا وہ سیاستدانوں کی عدم موجودگی تھی۔ اس طرح یہ تین طاقتور عناصر یعنی فوجی جنرل، سرکاری افسر اور جاگیردار اپنے ناجائز مقاصد کے فروغ کی خاطر ایک ناپاک اتحاد میں شریک ہو گئے۔

مادی املاک اور وسائل کے علاوہ پاکستان کو بطور ملک چلانے کے لئے ایک

MashalBooks.org

مستعد انتظامیہ بھی ورثے میں ملی تھی۔ اسی طرح پاکستان کو اپنا نہری نظام چلانے اور اسے وسعت دینے کے لئے اور اسی طرح ریلوے، سڑکیں، آبی مواصلات اور مفاد عامہ کے تحت دوسری خدمات میں توسیع اور موثر کارکردگی کیلئے انجینئر، ماہر کاریگر، اعلیٰ درجے کے منتظم اور دوسرے ماہرین ملے تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی زراعت تھی جس کی بدولت ضرورت سے زائد غذائی اجناس، کپاس، جوٹ اورکھالیں جو زرمبادلہ کے حصول کے زبردست وسائل تھے اس ملک کو میسر تھے۔ علاوہ ازیں یہاں تین یونیورسٹیاں لاہور، کراچی اور ڈھاکہ میں تھیں۔ بہت سے سکول اور کالج تھے جو نوجوانوں کو تعلیم دے کر سرکاری اور نجی شعبوں میں انتظامی امور کی انجام دہی کے قابل بناتے تھے۔ کراچی میں ایک یونیورسٹی آزادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے قائم ہوئی تھی اگرچہ انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کو اس لئے رواج دیا تھا کہ اس طرح کلرک اور افسر پیدا ہوتے رہیں گے لیکن تعلیم سے کم از کم ہندوؤں میں سکالر، فلسفی یہاں تک کہ نوبیل انعام پانے والے سائنسدان بھی پیدا ہوئے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جو ملک آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے ان میں بہت کم ہی ملک پاکستان کی طرح خوش نصیب رہے ہوں گے۔ ہندوستان کی ایک محرومی اناج کی شدید قلت تھی۔ کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ یہ کوئی بہت بڑی بندرگاہ نہیں تھی۔ کراچی سندھ کا دارالحکومت تھا اور اس اعتبار سے جدید ترین تھا۔ خود سندھ کا شمار بھی ہندوستان کے چھوٹے صوبوں میں ہوتا تھا۔ ایک نئے ملک کا دارالحکومت بنانے کے لئے ہر چیز کو ازسرنو منظّم کرنے کی ضرورت تھی۔ کراچی چونکہ چھوٹا شہر تھا لہٰذا یہاں سرکاری عملے اور افسروں کی ضرورت کیلئے جو پورا ملک چلانے کی ذمہ داری عائد تھی انتظامات کافی نہ تھے۔ مرکزی سیکرٹریٹ کے عملے کو یعنی دفتری، کلرک، اسسٹنٹ اور درمیانہ درجے کے انتظام کار سبھی کو چھوٹے چھوٹے گھروں میں ڈال دیا گیا اس کے باوجود بہت تھوڑے سے لوگوں کو رہائش کی سہولت میسر آ سکی۔ عملے کی ایک بہت بڑی تعداد کو خیموں میں، جن کے ساتھ غسل خانے نہ تھے اور نہ نلکا پانی اور دوسری سہولتیں تھیں، رکھا گیا حالانکہ سیکرٹریت کے یہ ملازم دہلی جیسے جدید شہر میں رہائش کے عادی تھے۔

دفتری فرنیچر بھی بس برائے نام تھا۔ لکڑی کے ایک ڈبے پر بیٹھ کر دوسرے ڈبے کو میز کے طور پر استعمال کرتے اور دفتری کام انجام دیتے۔ اس طرح انہوں نے اپنے

فرائض خلوص دل سے ادا کئے۔ دفتر میں سٹیشنری نہ تھی، اس کیلئے ردی کاغذ سے جو ایک طرف سے سادہ ہوتا کام چلایا جاتا۔ متوسط اور اس سے کمتر درجے کے مسلمان سرکاری ملازمتوں نے بہت ہی مختصر عرصے میں مرکزی حکومت کے دفاتر قائم کر لئے۔ حکومت پاکستان کا ایک مکمل سیکرٹریٹ قائم کرنا بہت بڑا چیلنج تھا۔ انہوں نے شام کے وقت دیر تک یہاں تک کہ اکثر رات کو بھی کام کر کے یہ چیلنج پورا کر دکھایا۔ وہ جو پیش گوئی کی جا رہی تھی کہ پاکستان بہت مختصر عرصے میں ختم ہو جائے گا اسے ان لوگوں نے غلط ثابت کر دکھایا۔ انہی لوگوں کی کاوشوں کے نتیجے میں چند ہی ماہ کے اندر حکومت پاکستان کا کاروبار پوری طرح چل نکلا۔ یہ بات یاد رہے کہ ملازمت کے لئے پاکستان کا انتخاب کرنے والوں میں تقریباً سبھی مشرقی پنجاب اور اقلیتی صوبوں سے آنے والے ملازم تھے اور مقامی بمشکل چند تھے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور سیکرٹری صاحبان نے کراچی کے جدید ترین علاقوں میں آرام دہ مکانات حاصل کر لئے تھے۔ اپنے ماتحت عملے کی دشواریوں میں وہ کسی طرح بھی ان کے شریک نہ تھے۔

دوسرا نہایت اہم موقع بلکہ درحقیقت پاکستان کی پیدائش کا دن وہ تھا جب 17 اگست 1947ء کو آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ جناح صاحب نے آئین ساز اسمبلی کے صدر کے طور پر اس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ اس تقریر میں انہوں نے ریاست کی وہ حکمت عملی بیان کر دی جو آئین بنانے والوں کے لئے ایک نوشہ ہدایت تھی۔ انہوں نے کہا:

> ''آپ آزاد ہیں، آپ آزاد ہیں کہ اپنے مندروں کو جائیں، آپ آزاد ہیں کہ اپنی مساجد میں یا ریاست پاکستان کے اندر کسی دوسری عبادت گاہوں میں جائیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، مسلک یا عقیدے سے ہو گا لیکن اس بنیادی اصول سے اس کا ہرگز کوئی تعلق نہیں کہ ہم سب ایک ہی ریاست کے شہری ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ہم سب کے پیش نظر ایک ہی آئیڈیل ہونا چاہئے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر

فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں ریاست کے شہری ہونے
کی حیثیت سے۔''

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں جناح کی پہلی تقریر دوقومی نظریے کا استرداد اور سیکولرازم پر ان کا اصرار تھا۔ گویا پہلے موقف کی کلیتاً نفی تھا۔

علاوہ ازیں جناح نے اس تقریر میں یہ نہیں بتایا کہ آئین کی ہیئت کیا ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان کے پیش نظر ثانوی تھی۔ انہوں نے قومی استحکام کے یہ رہنما اصول بتائے تھے جو سیکولرازم پر مبنی اور چار چیزوں پر مشتمل تھے اور ان کے خیال میں آئین سازی سے زیادہ اہم تھے۔ اول انہوں نے آئین بنانے والوں پر زور دیا کہ ''آپ کو مکمل اختیارات حاصل ہیں'' اس کے معنی یہ تھے کہ ان کا اپنا کام انتہائی ذمہ دارانہ طور پر انجام دینا ہو گا اور یہ کہ اب قوم کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہے۔ دوئم، انہوں نے رشوت، کرپشن، خوش پروری اور بے راہ روی کے خلاف تنبیہہ کی تھی۔ بابائے قوم کے خیال میں قانون سازوں کی پہلی ترجیح، قوم کو ان خرابیوں سے نجات دلانا تھا جو ان کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن چکی تھی۔ سوئم یہ کہ متحدہ ہندوستان کے ضمن میں ان کے فہم کے مطابق کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تھی اور اس کے نہایت تباہ کن نتائج نکل سکتے تھے۔ لیکن جناح چونکہ ایک کھلے ذہن کے انسان تھے اور ہٹ دھرم ہرگز نہ تھے لہٰذا انہوں نے جو بات اپنی رائے کی تائید میں کی، وہ بہت اہم تھی۔ انہوں نے کہا ''ممکن ہے، یہ خیال صحیح ہو، ممکن ہے صحیح نہ ہو، اسے ظاہر ہونا باقی ہے لہٰذا جناح کے لئے دوقومی نظریہ جس کے وہ بانی تھے، کوئی آسمانی صداقت نہ تھی اور اگر تھی بھی تو اکثریتی اور اقلیتی قوموں کی پیچیدگی ہندو اور مسلمان قوموں کے درمیان پیچیدہ عوامل ان کے خیال میں بتدریج غائب ہو جائیں گے اور آخر میں انہوں نے فرقہ وارانہ تنازعے کے خلاف تنبیہہ کی تھی جو نہایت تباہ کن ہوسکتی ہے۔'' جناح نے ایک تاریخی مثال برطانیہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان تنازعے کی دی تھی جس کے تباہ کن نتائج خاصے عرصے تک محسوس کئے گئے۔

جناح نے اپنی 11 اگست کی تقریر میں واضح طور پر کہا کہ متحدہ ہندوستان کے لئے کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن ایک حقیقت پسند اور جمہوری ہونے کی بنا پر یہ بھی کہہ دیا کہ یہ خیال ممکن ہے صحیح ہو، ممکن ہے صحیح نہ ہو، اسے ظاہر ہونا باقی ہے'' لیکن ان

MashalBooks.org

کے بیشتر مقلد اس خیال کو ایک مذہبی عقیدہ سمجھ کر اس پر کار بلند چلے آ رہے ہیں۔

اس کتاب کی ضرورت کیلئے میں نے بریگیڈیئر نور احمد حسین کی رائے معلوم کرنا چاہی۔ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے اے ڈی سی اور ایک نوجوان افسر تھے اور جناح کے زبردست مداح بھی تھے۔ انہیں واضح طور پر ایک موقع یاد آیا جب جناح نے صریح طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ یہ عظیم رہنما صبح کا ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا اپنی بہن مس فاطمہ جناح اور ایڈی سی کی معیت میں کھانے کا عادی تھا۔ جن دنوں بڑے پیمانے پر قتل عام ہو رہا تھا جناح انتہائی افسردہ رہتے اور اذیت میں مبتلا نظر آتے تھے۔ بظاہر انہیں اندازہ نہ تھا کہ یہ سب کچھ رونما ہوگا۔ انہیں اس عالم میں دیکھ کر وہ نوجوان اے ڈی سی بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک روز وہ سب ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شریک تھے۔ ان کی بحریہ کے اے ڈی سی لیفٹیننٹ مظہر نے کہا، قائداعظم! کیا آپ کو یقین ہے کہ پاکستان مسئلہ کا صحیح حل تھا؟ اس سوال پر میز کے گرد بیٹھے ہوئے سبھی لوگ چونک پڑے۔ نور احمد حسین کو خیال گزارا کہ اب نیوی کے نوجوان افسر کو ملازمت سے بے عزت کر کے نکال دیا جائے گا۔ جناح سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں کانٹا تھا اور نظریں دور مستقبل پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ انہوں نے توقف کیا۔ پھر نہایت تمکنت کے ساتھ، کسی گھبراہٹ کے بغیر اور غیر جذباتی انداز میں جناح نے آہستہ آہستہ محکم لہجے میں کہنا شروع کیا ''یہ صرف وقت بتائے گا۔'' فطری طور پر لوگوں کے دم میں دم آیا۔ جناح کس قدر درست تھے۔ قائد کے نزدیک دو قومی نظریہ چنداں مقدس نہیں تھا۔ ان کے سادہ لوح مقلدوں اور خودغرض جانشینوں نے اسے ایک مذہبی نظریے کا مرتبہ دے دیا تھا۔ اول الذکر نے اسے ایمانداری سے لاعلمی کی بنا پر اور آخر الذکر نے بدنیتی سے ذاتی مفاد کے تحت ایسا کیا۔

جناح نے ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو جنہیں آزادی کے بعد ہندوستان کا شہری بن جانا تھا، اپنے رخصتی پیغام میں مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کے وفادار شہری ہوتے ہوئے ہندوؤں کے درمیان امن اور آشتی کے ساتھ رہیں۔ 21 جنوری 1981ء تک یہ تقریر غیر متنازعہ رہی۔ 22 جنوری 1981ء کو حامد جلال نے ایک مضمون میں لکھا، جو لاہور کے مجلّہ ویو پوائنٹ میں شائع ہوا، اس کا عنوان تھا ''جب ہم نے قائد کو سنسر

کرنا چاہا۔'' کہا جا سکتا ہے کہ قائداعظم کی وہ تقریر پاکستان کی مستقبل کی انتظامیہ اگرچہ وہ ابھی انتظامیہ کا محض پرتو تھی، کی پریس ایڈوائس کا ہدف بن گئی۔ اس کے کئی سرکردہ ارکان نے تقریر کی چند سیکولر عبارتوں کو کلیتاً حذف کر دینے کی کوشش کی۔ حامد جلال نے ان ارکان کے نام نہیں بتائے تاہم ضمیر نیازی نے انہیں کھول کر نکال لیا اور اپنی کتاب ''دی پریس ان چین'' میں درج کر دیا۔ جناح کی تقریر کو سنسر کرنے کا خیال اس وقت ترک کرنا پڑا جب یہ دھمکی دی گئی کہ یہ معاملہ جناح کے گوش گزار کر دیا جائے گا اور مجید ملک نے جو محکمہ اطلاعات (پی آئی ڈی) کے ایک پرانے افسر تھے، چودھری محمد علی کو فون پر اس دھمکی کی خبر دے دی۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ سنسر کا ارادہ ترک کرنے سے پہلے چودھری محمد علی کو فون پر اس دھمکی کی خبر دے دی۔ بعض لوگوں کا دعوی ہے کہ سنسر کا ارادہ ترک کرنے سے پہلے چودھری محمد علی نے لیاقت علی خاں سے ملاقات کی تھی۔

آزادی کے بعد واقعات تیزی سے رونما ہوتے گئے۔ غیر منقسم ہندوستان کے شمال میں دور دور تک ہندو مسلم فسادات پھیل گئے۔ زبردست قتل و غارت گری کی بنا پر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ بھاگ کر مغربی پنجاب میں آ جائیں۔ انہوں نے یہ سفر زیادہ تر پیدل یا بیل گاڑیوں پر طے کیا۔ ریل گاڑیاں اور بسیں اول تو زیادہ تر میسر نہ تھیں، دوسرے ان میں سفر غیر محفوظ تھا۔ زیادہ تر مہاجرین کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں ستر لاکھ یا اس سے زیادہ کچھ مہاجر جنہیں یکجا ہونے کی مہلت نہ مل سکی ملک میں آ گئے۔ ان دشوار ترین حالات کے باوجود مہاجروں کو مذہبی جذبے کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک عام مسلمان کے نزدیک یہ مہاجرت آنحضورﷺ کی ہجرت کا نمونہ تھی، جس میں مہاجر مدینہ آ گئے تھے۔ اسلام کی رو سے ہجرت کو ایک مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے چنانچہ عام پاکستانیوں نے مشرق پنجاب سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو مذہبی تقدس کی حیثیت دے دی اور اس جذبے کے تحت انہوں نے مہاجر آباد کاری کے کاموں میں حصہ لیا۔ مہاجروں کو دوبارہ آباد کرنے میں روپیہ اور وسائل بے دریغ استعمال کئے گئے اور ہر ممکن کوشش اس بارے میں کی گئی۔ مہاجرین کو خوراک، لباس اور چھت کا سایہ فراہم کیا گیا۔

مہاجر آبادکاری میں جاگیرداروں کا کردار محض برائے نام تھا۔ یہ عام پاکستانیوں

MashalBooks.org

اور بیشتر شہر کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب آنے والے مہاجروں کو شہروں اور دیہات میں عزت و احترام کے ساتھ آباد کیا گیا۔

پاکستان کیلئے یہ مسائل جیسے کچھ کم تھے کہ بلوچستان میں ریاست قلات کے حکمران خان قلات نے 12 اگست 1947ء کو اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کی بنیاد وہ سمجھوتہ تھا جسے ''اسٹینڈ سٹیل ایگریمنٹ'' (Standstilll Agreement) یعنی صورتحال کو بحسنہ برقرار رکھنے کے سمجھوتے کا نام دیا گیا۔ نئی دہلی میں 4 اگست 1947ء کو خان کے ساتھ پاکستان اور حکومت برطانیہ کے نمائندوں کی ملاقات کے بعد اس سمجھوتے پر دستخط کئے گئے تھے۔ یہ دستاویز حکومت پاکستان کی نادر دستاویزات میں اب بھی موجود ہو گی، بشرطیکہ کسی نے اسے پاکستان کی آزادی کے منافی نہ سمجھ لیا ہو جس طرح انہوں نے جناح کی 11 اگست کی تقریر کو پاکستان کی مخالفت پر مبنی سمجھ لیا تھا۔ ایک سرکاری اعلان کے تحت آزاد ریاست قلات کی حکومت قلات ایکٹ 1947ء کے تحت تشکیل دی گئی۔ ریاست قلات کے وزیراعظم نوابزادہ محمد اسلم خاں آئی پی ایس، بی اے (کیمبنٹ) بار ایٹ لاء کے دستخط سے قلات اسٹیٹ گزٹ میں یہ ایکٹ شائع کیا گیا۔ خان کے اعلان آزادی کی توثیق قلات اسمبلی سے ہو گئی۔ اسمبلی کے بعض ارکان مثلاً غوث بخش بزنجو معروف سیاستدان نہایت سیاسی بصیرت کے حامل تھے۔ بزنجو تو آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگریس کے عہدیدار بھی تھے۔ اسٹیٹ کانگریس ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں کانگریس کا سیاسی بازو تھا۔

بہاولپور کی ریاست میں بھی کچھ لہریں محسوس کی جانے لگیں، جو ہندوستان سے الحاق کیلئے حکومت ہند سے سلسلہ جنبانی کر رہی تھی اگرچہ اس کی تصدیق نہ ہو سکی لیکن اس سے ابہام کی کیفیت میں اضافہ ہوا۔ یہ پریشان کن، غیر محکم بلکہ تشویش انگیز صورت حالات تھے۔ مغربی پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک مربوط اور منظم قوم کا نقشہ پیش نہیں کر رہا تھا۔ اس کا سب سے خراب پہلو یہ تھا کہ آل انڈا مسلم لیگ اور پاکستان میں اس کی جانشین پاکستان مسلم لیگ کے لیڈروں نے صورتحال کی سنگینی کا قیات بھی نہیں کیا تھا۔ میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شمس الحسن کے کاغذات میں یا اور کسی جگہ سے مجھے ایک پرزہ بھی دستیاب نہیں ہوا، جس سے ان کے باخبر ہونے کا پتہ چلتا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ادھر گزشتہ صدیوں میں بہت کم کتابیں لکھی ہیں اور سیاستدانوں نے تو اور

MashalBooks.org

بھی کم لکھیں۔ مجھے وہی کتابیں ملیں جن میں قوم پرست مسلمانوں اور جمعیت علمائے ہند اور کانگریسی مسلمانوں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے کہ انہوں نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک متحدہ قوم تسلیم نہیں کیا۔ خود جناح نے جو دوقومی نظریے کے بانی تھے، اپنے درست یا نادرست ہونے کا معاملہ مستقبل کے سپرد کر دیا یہ ایک فراخدلانہ نقطہ نظر تھا۔ اگر کوئی جناح کی 7 اگست 1947ء کی تقریر جس میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے مشاورتاً خطاب کیا تھا اور 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں ان کی تقریر، ان دونوں پر ایک بار پھر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس نام نہاد نظریے کو انہوں نے خود بھی ترک کر دیا تھا۔

پاکستان کن مراحل سے گزر کر وجود میں آیا۔ اس کے بارے میں حقائق سامنے آ رہے ہیں۔ پہلی حقیقت یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں نے بہت بھاری تعداد میں اس کے لئے ووٹ دیئے تھے، دوسری حقیقت یہ کہ مجموعی ووٹوں کی تعداد بہت بھاری نہیں تھی اس سے قدرے کم تھی۔ 1945ء کے عام انتخابات میں، سرحد کے اندر مسلم اکثریت کے باوجود کانگریس نے ووٹ لے کر اپنی وزارت قائم کی۔

پاکستان کے بارے میں صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ریفرنڈم کرانا پڑا جس میں سو میں سے 49 افراد نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ یہ سو فیصد نہیں بلکہ 49 فیصد کے اندر کی اکثریت تھی جس نے ایک محدود رائے شماری میں پاکستان کا انتخاب کیا۔ صوبہ سرحد کے مسلمان سیاسی طور پر بہت بیدار اور باخبر تھے اور ان کے سیاسی لیڈروں میں بڑی سیاسی بصیرت تھی۔ پنجاب میں دو مختلف جغرافیائی علاقے تھے اور دونوں میں ووٹنگ کا انداز جداگانہ تھا۔ پنجاب کے قدرے چھوٹے نصف حصے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے مسلم لیگ نے 98 فیصد ووٹ لئے اور ساری مسلم نشستیں جیت لیں۔ مغرب کے مسلمان اکثریتی حصے میں، جو نصف پنجاب سے قدرے زیادہ تھا، مسلم لیگ 9 نشستیں ہار گئی کیونکہ یہاں پاکستان مخالف جاگیرداروں کا غلبہ تھا بلکہ درحقیقت یونینسٹ پارٹی تو آزادی کے ہی خلاف تھی۔ اس طرح پاکستان کے لئے ووٹوں کی تعداد 80 فیصد یا اس سے کچھ کم ہوگئی۔ خود سندھ میں جاگیرداروں کی بالادستی تھی۔ مسلم لیگ کو 60 ارکان کے ایوان میں صرف 28 نشستیں ملیں یعنی معمولی اکثریت حاصل کرنے کے لئے

MashalBooks.org

بھی تین نشستیں کم تھیں۔ سندھی جاگیرداروں نے بھی پنجاب کے جاگیرداروں کی طرح برطانوی راج کے تسلسل کو ترجیح دی۔ پنجاب میں جاگیرداروں نے پاکستان مخالف کانگریس کے اشتراک سے پاکستان کے خلاف یونینسٹ حکومت قائم کی۔ وہ 9 نشستیں بالکل غیر اہم نہیں تھی لیکن اس کا اثر اس تعداد کے حساب سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ 9 یونینسٹ ارکان ایک نہایت طاقتور سیاسی، سماجی اور اقتصادی گروہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ پنجاب کی ساری زرعی معیشت پنجاب اسمبلی میں جاگیرداروں کے ایک چھوٹے سے 9 رکنی گروہ کی مٹھی میں تھی۔ مغربی پنجاب کے مسلمانوں کی بھاری مسلم اکثریت یعنی ان کی 85 فیصد تعداد جو کسانوں پر مشتمل تھی زراعت پر انحصار کرتی تھی اور وہ 9 ارکان اپنی معاشی طاقت کی بدولت پورے معاشرے کو اور اس کی سیاست کو جدھر چاہتے بہا کر لے جا سکتے تھے۔ آزادی سے قبل پنجاب میں خاص طور پر صوبے کے مغربی حصے میں کوئی قابل ذکر صنعت نہ تھی۔

سندھ کی سیاسی صورتحال اور سماجی حالت کچھ کم قابل رحم نہ تھی اور پنجاب کے مقابلے میں اس کی سیاست بھی کچھ کم پرخطر نہ تھی۔ بلوچستان کا معاملہ تو صاف تھا اس کی وضاحت ضروری نہیں۔ اس کی بڑی سیاسی طاقت یعنی خان قلات نے پاکستان میں شمولیت سے انکار اور پاکستان کے قیام سے چار دن پہلے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کے مقابلے میں نصف سیسای قوت بھی ایسی نہ تھی جو پاکستان کی حمایت کرتی۔ صورتحال بڑی نازک تھی۔ مزید یہ کہ مغربی پنجاب اور سندھ میں مسلم لیگ کے اندر سیاسی لیڈروں کی قلت تھی۔ پنجاب مسلم لیگ پر جاگیرداروں کی نئی نسل کا غلبہ تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے پہلے ہی ہندوستان کی سیاست میں ہوا کا رخ پہچان لیا تھا اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ خرانٹ بوڑھے جاگیرداروں نے اپنے بیٹوں کو احتیاطاً مسلم لیگ میں شامل کروا دیا تھا۔ پرانے مسلم لیگی لیڈر مولانا صفر علی خاں کی طرح ایک آدھ ہی رہ گئے تھے۔ میاں افتخار الدین ایک خاص وضع کے جاگیردار تھے۔ ان میں سیاسی فراست اور ترقی پسندانہ افکار سے گہری وابستگی پائی جاتی تھی۔ اب وہ مسلمان اشتراکی بشمول میاں افتخار الدین جنہوں نے 1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا قابل قبول نہیں رہے تھے۔ آزادی سے

MashalBooks.org

قبل انہی جواں سال جاگیرداروں نے ترقی پسندانہ افکار اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے نظریات سے مکمل ہم آہنگی ظاہر کرتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کی تھی۔ آزادی سے چند سال پہلے انڈین کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ نوجوان مسلمان کمیونسٹوں کو ہدایت دی گئی کہ مسلم لیگ کی مدد کریں اور اس طرح کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی مقاصد کے حصول میں معاون ہوں۔ سندھ مسلم لیگ کی قسمت میں ایسے نوجوان جاگیردار بھی نہ تھے، جو قیادت کرتے۔ وہ تو سندھی جاگیردار تھے جنہوں نے سندھ میں 1945ء کے عام انتخابات کے بعد اپنے ووٹوں سے کمائی کی جس کے سب سے مسلم لیگ کی وزارت ختم ہوگئی۔

تجربہ کار مسلمان سیاستدان پنجاب، سندھ اور سرحد میں بھی، کم تعداد میں تھے لیکن بہرطور تھے۔ ان میں سے بہت سے لیڈر مثلاً سیف الدین کچلو، خان عبدالغفار خان، عبدالمجید سندھی اور عطاء اللہ شاہ بخاری زبردست سیاسی بصیرت رکھتے تھے لیکن وہ پاکستان کے مخالف تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو جو مسائل درپیش تھے ان کے خیال میں پاکستان اس کا حل نہ تھا۔ ان میں سے بعض لیڈروں کا خیال تھا کہ پاکستان کے قیام سے مسائل بڑھ جائیں گے۔ ان میں سے چند جو اپنے نظریات میں بڑے کٹر تھے آزادی کے بعد ہندوستان چلے گئے۔ اس گروہ میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسے سیاسی لیڈر، پروفیسر عبدالمجید خاں جیسے عالم اور ساحر لدھیانوی جیسے شاعر شامل تھے۔ کچھ مسلمان کانگریسی لیڈر جیسے سیف الدین کچلو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران امرتسر سے لاہور جانے کے بجائے سیدھے دہلی چلے گئے۔ لیکن یہاں جو نکتہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کے لیڈروں اور جاگیردارانہ قیادت کے درمیان سیاسی فکر کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے یا اس کے فوری بعد ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کے سوا سارے جاگیرداروں نے اپنے سابقہ پاکستان مخالف نظریات کے باوجود مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان میں یہ تبدیلی دلی طور پر آ گئی تھی، یہ تو اپنے جاگیردار مفادات کے تحفظ کے لئے تھا، جیسا کہ بعد میں سامنے آ گیا۔

قوم پرست لیڈر مثلاً سرحد میں غفار خاں اور ڈاکٹر خان صاحب، پنجاب میں سیف الدین کچلو اور عطاء اللہ شاہ بخاری، سندھ میں عبدالمجید سندھی اور بلوچستان میں غوث

MashalBooks.org

بخش بزنجو پورے شدومد سے نو آبادیاتی تسلط کے مخالف تھے۔مسلم لیگ کی طرح ان کا مقصد بھی حصول آزادی تھا۔ البتہ مسلم لیگ سے ان کا اختلاف اس سوال پر تھا کہ اس کا راستہ کیا ہو گا۔ سیاسی اصطلاح میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یونینسٹ جنہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اصل دشمن تھے جبکہ قوم پرست رہنما سیاسی مخالف ضرور تھے لیکن دشمن نہیں تھے۔مسلم لیگ کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ انگریزی راج کو جانا چاہئے البتہ اختلاف طریق کار میں تھا، مقصد میں نہ تھا۔

مشرقی بنگال کا صوبہ جسے 1971ء کے بعد پاکستان سے خارج کر دیا گیا، ایک مختلف سماجی اور سیاسی کیفیت کا حامل تھا۔ اگرچہ زمینداری کی صورت میں وہاں بھی جاگیرداری تھی اور افلاس بلکہ نہایت درد ناک افلاس تھا لیکن وہاں ایک متوسط طبقہ بھی تھا اگرتعداد میں کم تھا۔ ان کے یہاں ناظم الدین جیسے عظیم مدبر اور فضل الحق اور سہروردی جیسے آزمودہ کار لیڈر موجودہ تھے۔ ان کے علاوہ دوسری اور تیسری صف کے لیڈر اور سیاسی کارکن تھے۔ گو تعداد میں وہ بھی کم تھے، لیکن تھے تو اس معاملے میں مشرقی بنگال کا صوبہ مغربی پاکستان کے تمام صوبوں سے بہتر حال میں تھا۔مشرقی پاکستان کی سیاسی قیادت کس درجے کی تھی اس کی آزمائش تو اسی وقت ہوگئی جب خواجہ ناظم الدین نے وزیراعلیٰ کے طور پر صوبائی اسمبلی میں زمینداری کے خاتمے کا مسودہ قانون پیش کیا۔ یہ قانون اس وقت منظور ہوا جب نور الامین وزیراعلیٰ منتخب ہوئے کیونکہ خواجہ ناظم الدین کو ستمبر 1948ء میں گورنر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ یہ قانون بھاری اکثریت سے منظور ہوا۔ اس طرح مشرقی پاکستان نے اپنی ایک بڑی سماجی معذوری سے عملاً ایک سماجی برائی سے بہت شروع میں ہی نجات حاصل کر لی تھی۔

پاکستان کے مغربی حصے کو اپنی نسبتاً مادی فارغ البالی کے باوجود مشرقی حصے کے مقابلے میں زیادہ سنگین نوعیت کے سماجی اور سیاسی مسائل درپیش رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ پر مغربی پاکستان میں بہت سی معذوریوں کا بوجھ تھا۔ پنجاب اور سندھ اس کے دو بڑے صوبے جاگیرداری نظام کی سماجی اور سیاسی گرفت میں جکڑے ہوئے تھے جس کا ایک مضبوط سرا قبائلی اور ذات پات کی تفریق کے نظام سے جڑا ہوا تھا۔تجارت اور صنعت وہ جیسی بھی تھی اور مالیات کا شعبہ، یعنی باضابطہ بینک کاری اور لین دین کے غیر رسمی طریقے سب

غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھے جو پاکستان کے مخالف تھے۔ جاگیردار اپنی مضبوط گرفت کے باوجود ہندو مہاجنوں کے مقروض اور ان کے رحم و کرم پر جی رہے تھے۔ کسانوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے جاگیردار افسر شاہی کی طاقت پر انحصار کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک تو قیادت تھی ہی نہیں اور اگر کچھ تھی تو وہ چند نوجوان، ناتجربہ کار اور معمول سے کچھ زیادہ پرعزم جاگیرداروں کے تابع تھی۔ پھر بلوچستان میں پاکستان کے لئے کھلی مخالفت پائی جاتی تھی وہاں قلات کے حکمران نے پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کرتے ہوئے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ یہ کچھ دشواریاں تھیں جس کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کو قیاس کر لینا چاہئے تھا کہ 14 اگست 1947ء کے بعد ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن مغربی پاکستان کا بھی ایک ورثہ تھا۔ صوبہ سرحد میں پختون عوام کا ایک توانا وجود تھا جن میں سیاسی شعور تھا اور ایسے باجبروت ظالموں کے سماجی گروہ نہ تھے جیسا کہ جاگیرداروں کی صحت میں پنجاب اور سندھ میں موجود تھے۔ سرخ پوش اور خدائی خدمت گار کی صورت میں ایک نہایت تربیت یافتہ کارڈ اور ان کے علاوہ بھی قوم پرست مسلمان صوبہ سرحد کا اثاثہ تھے۔ صوبے کی معیشت اگرچہ چھوٹی اور زراعت پر مبنی تھی لیکن کسی خاص گروہی مفاد کے تابع نہ تھی۔ لوگوں کے پاس چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی تھے۔ سیاسی قیادت متوسط طبقے سے نکل کر آئی تھی جس کے افراد پختہ کار تھے۔ ان میں سردار عبدالرب نشتر جیسے پرانے تجربہ کار سیاستدان شامل تھے۔ ایسے لوگ مسلم لیگ میں نایاب تھے ان کے علاوہ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی غفار خاں، جو ایک کرشمہ ساز سیاستدان تھے اور ان کے پیچھے رہنماؤں کی ایک قطار تھی۔ پنجاب اور سندھ میں بھی تجربہ کار سیاستدانوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ پنجاب کے پرانے سیاستدانوں میں عبدالقادر قصوری، عطاء اللہ شاہ بخاری، سراج الدین پراچہ اور نسبتاً جوانوں میں عطاء اللہ جہانیاں، شورش کاشمیری اور میاں افتخار الدین شامل تھے۔ سندھ کے آزمودہ کار سیاستدانوں میں عبدالمجید سندھی، غلام مصطفیٰ بھرگڑی، عبدالقادر جونیجو اور حیدر بش جتوئی کے نام شامل تھے۔ بلوچستان میں بھی غوث بخش بزنجو جیسے قابل سیاستدان موجود تھے۔ ان لیڈروں میں ایسے مسلم لیگیوں کے برعکس انہوں نے سالہا سال انگریزوں کی جیل میں قید کی سزائیں جھیلیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں کیونکہ انہوں نے آزادی کے لئے جنگ کی تھی اور ایک سیاسی عمل سے گزر کر نکلے تھے۔

MashalBooks.org

آخر میں مشرقی بنگال آتا ہے، پنجاب اور سندھ کے مقابلے میں یہاں متوسط طبقہ بڑے پیمانے پر موجود تھا۔ بنگالی مالکانِ اراضی اپنے طرزِ عمل میں نسبتاً کم ظالم تھے اور بنگالی کسان، پنجاب کے مزارعوں اور سندھ کے ہاریوں کے برعکس فدوی اور فرماں بردار ہرگز نہ ہیں تھے۔ پنجاب اور سندھ کے جاگیردار اپنے کسانوں پر جتنا ظلم ڈھاتے تھے اگر اس کا عشرِ عشیر بھی بنگالی کسانوں پر روا رکھا جاتا تو ان کا ردِعمل نہایت جارحانہ ہوتا۔ اپنے مقصد کے لئے جنگ کرنا بنگالی کسانوں کی ایک روایت تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ٹیٹو میر کی بغاوت، کسانوں کی بغاوت تھی۔ پنجاب اور سندھ کے لوگوں کے مقابلے میں بنگال کے عوام میں نسبتاً زیادہ سیاسی شعور پایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خواجہ ناظم الدین، مولوی فضل الحق اور سہروردی جیسے سیاسی لیڈر اگرچہ اس طرح کے حریت پسند نہیں تھے جیسے عطاء اللہ شاہ بخاری اور غفار خاں تھے، پھر بھی وہ تجربہ کار اور نہایت دیانت دار رہنما تھے۔ بنگالیوں کی قیادت کو معلوم تھا کہ معاشرے پر جاگیرداری نظام کے اثرات کتنے ضرر رساں ہوتے ہیں۔

اعلان آزادی کے وقت مسلم لیگ ایک سرشاری کی کیفیت میں مبتلا تھی کہ 1 سے 98 فیصد عوام نے ووٹ دیا ہے حالانکہ اسے صرف ان دس فیصد کے درمیان سے ووٹ ملا تھا جو رائے شماری میں شرکت کے حقدار تھے۔ مسلم لیگیوں کو یہ صورتحال مثالی نظر آ رہی تھی اور بس اب یہی کرنے کو رہ گیا تھا کہ حکومت کی کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ جائیں اور ریاستی امور انجام دینے لگیں۔ اس وقت کی صورت حال کا ایک بار پھر جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ خوش اندیشی تو درکنار ان دنوں معمولی تساہل کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

کامیابی چونکہ مسلم لیگ نے حاصل کی تھی لہٰذا اس کی فراخدلی اور یہی نہیں بلکہ سیاسی دانشمندی کا بھی تقاضا یہ تھا کہ پہلے جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اس کا ازالہ کریں۔ مسلم لیگ کے ریکارڈ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ انہوں نے زخم کے اندر مال کی کوئی تدبیر کی تھی، البتہ ریکارڈ پر یہی بات موجود ہے کہ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت جس کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب تھے بیک قلم برخاست کر دی تھی۔ اس سے اختلاف کی خلیج اور زیادہ پھیل گئی اور یوں بھی وہ فیصلہ ان اصولوں کے منافی تھا جن کے لئے مسلم لیگ نے جدوجہد کی تھی یعنی صوبائی مختاری کا اصول۔ نفی و انکار کو برداشت کرنا اور

MashalBooks.org

اختلاف رائے کو تسلیم کرنا اسلام کی اور خود جمہوریت کی بنیادی ضرورت ہے۔ سیاسی اختلاف کے بغیر جمہوریت چل نہیں سکتی۔

آزادی کے بعد مشرقی پنجاب میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں لاکھوں افراد قتل ہوئے اور لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اس بارے میں اعداد وشمار پر مکمل اتفاق نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود صحیح اعداد خواہ کچھ بھی رہے ہوں، وہ اب تک ہونے والا سب سے ہولناک قتل عام تھا۔ آبادی کا چند مہینوں کے اندر ادھر سے ادھر ہونا بھی زبردست المیہ تھا اس سے پایاں ہلاکت اور تباہی کو روکنے اور صورت حالات سے نبٹنا بہت بڑا کام تھا۔

سکول اور کالج کی تاریخ کتب میں اس بھیانک انسانی المیے کو حصول پاکستان کے لئے دی جانے والی عظیم قربانی کے باب میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ المیہ ان لوگوں کی حماقت کا نتیجہ تھا جو انتقال اقتدار کے ذمہ دار تھے، خاص طور پر انگریزی حکومت اور اس کے سربراہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ یہ نتیجہ تھا ان کی مجرمانہ عجلت کا جو تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوانے کے لئے بے چین تھے لیکن اس کی ذمہ داری ہندوؤں اور مسلمانوں کی قیادت پر بھی آتی ہے۔ وہ ایسے اقدامات کرنے میں ناکام رہے جن سے اس تباہی کو روکا جا سکتا تھا اگر سیاسی فہم وفراست ہوتی اور پارٹی کی تنظیم ہوتی تو اس ہولناک قتل و غارت گری سے بچنا ممکن تھا کچھ بھی ہو لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو غیر ذمہ دارانہ قیادت کی کارستانی تھی جنہوں نے فسادات ابھارے۔ مستقبل کا مورخ اس بے پایاں انسانی ہلاکت اور تباہی کے بارے میں لکھے گا کہ یہ وہ قیمت تھی جو انتقال اقتدار کا منصوبہ بنانے، اس کے لئے سیاسی سمجھوتے کرنے اور اسے بروئے کار لانے والوں کی حماقت کے باعث ادا کی گئی۔ وہ قربانی ہرگز نہ تھی۔ قربانی تو اس وقت ہوتی جب حصول آزادی کے لئے ادا کی جاتی جیسے 1960ء کے عشرے میں الجزائر اور ویتنام کے باشندوں نے قربانیاں دی تھیں۔ آزادی کے لئے قربانی دینا، ایک سیاسی تربیت کا عمل ہے۔ دوسروں کی حماقت کی قیمت ادا کرنا سیاسی تربیت نہیں بلکہ تلخ تجربہ ہے لیکن مسلم لیگ کی قیادت نے کچھ بھی نہیں سیکھا اگر ایسا ہوتا تو کشمیر میں جنگ نہ چھڑتی۔ لڑائی کے بہت سارے محاذ کھول دینا، زبردست سیاسی حماقت تھی۔ جناح ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھے اور ان کو مشورہ یہ تھا کہ

اپنے اعصاب پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ مرض تیسرے درجے میں داخل ہو چکا ہے۔ (5) اس امر کے خاصے شواہد اب مل چکے ہیں کہ جناح کی بیماری نئی نہیں تھی۔ ان کو تپ دق غالباً 1945ء میں یا 1946ء میں لاحق ہو چکی تھی۔ جناح اس بات کو بھی سمجھتے تھے کہ مسلم لیگیوں میں وہ تنہا لیڈر ہیں جو غور وفکر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے سیاسی محالفوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا ہیں چنانچہ وہ مسلمانوں کی قیمت پر ان کی علالت سے پورا پورا سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا جناح نے اپنی جان لیوا بیماری کے معاملے کو دوستوں اور دشمنوں سب سے یکساں طور پر چھپایا۔ دوستوں میں سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی تھی اور دشمن سیاسی طور پر بڑے عیار تھے۔ (6) فطری طور پر انہوں نے اپنا وقت فوری نوعیت کے مسائل کو دیا تا کہ معلوم ہو کہ حالات یقینی طور پر معمول کے مطابق ہیں۔ اس کے باوجود توقع کی جاتی تھی کہ وہ کم از کم اپنی نیابت کیلئے دوسری، تیسری اور چوتھی صف کے لیڈر ضرور تیار کریں گے۔

اس کا راستہ یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے حزب مخالف کے ان سیاستدانوں کو سیاست کے دھارے میں لائیں گے جنہیں پہلے غدار کہا گیا تھا۔ اس میں کانگریسی، احرار، جمعیت العلمائے ہند کے ارکان، قوم پرست مسلمان اور تمام صوبوں کے مخالف ارکان شامل تھے۔ بہرحال حزب اختلاف کے لیڈر غفار خاں نے اس کا راستہ بتایا تھا۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ غفار خاں خود جناح کے پاس گئے اور وعدہ کیا کہ ریاستی امور کی بطریق احسن انجام دہی کے لئے وہ پورا تعاون کریں گے اور یوں دشمنی کے زخموں کا اندمال کریں گے۔ ان دو عظیم لیڈروں کے درمیان ملاقات کیسے ہوئی۔ اسے اجمل خان خٹک نے بیان کیا ہے، جو ایک دانشور اور سن 70 سے 90 تک کی دہائیوں کے درمیان ایک پرانے اور تجربہ کار لیڈر شمار ہوتے تھے۔ غفار خاں نے جناح سے مخاطب ہو کر کہا ''ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے آپ کے اور میرے دو جداگانہ طریق کار تھے اور مقصد تھا انگریزوں کو نکالنا۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو اپنے الگ الگ وطن کے لئے لڑائی کریں۔ ہم چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو مل کر ایک مشترکہ وطن کیلئے لڑائی لیں۔ انگریز چلے گئے اور آزادی حاصل ہوگئی۔ اس طرح جیسے آپ چاہتے تھے مشترکہ مقصد پورا ہو گیا۔ آزادی آپ ہی کے طریقے سے ملی ہے، ہمارے طریقے سے نہیں۔ ہم عوام کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں۔

Mashalbooks.org

اب ہمیں پاکستانی عوام کو خوشحالی کے لئے مل جل کر کام کرنا چاہئے۔'' جناح نے اس سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ جناح جب پشاور جائیں گے تو غفار خاں کو ملاقات کیلئے مدعو کریں گے۔ اس کے جواب میں غفار خاں جناح کو چارسدہ بلائیں گے جہاں وہ سرخ پوشوں اور خدائی خدمت گاروں کے اجتماع سے خطاب کریں گے لیکن کانگریسی وزارت کی برطرفی کے بعد قیوم خاں کو وزیراعلیٰ بنایا گیا، قیوم خاں کانگریسی تھے اور ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اس وقت اختیار کی تھی جب انہوں نے سمجھ لیا تھا کہاب پاکستان کا بننا یقینی ہے۔ وہ منافق اورموقع پرست تھے۔ ان کا کوئی یقینی موقف اور ایمان نہیں تھا۔ وزیراعلیٰ بننے کے بعد انہوں نے سرحد اسمبلی کے کانگریسی ارکان کو جیلوں میں ڈال دیا۔ اس طرح انہوں نے جمہوریت کو پامال کیا اور غیرجمہوری طریقوں سے ایوان میں اپنی پارٹی کی اکثریت کو یقینی بنا لیا۔

قیوم خاں نے جب یہ دیکھا کہ جناح اور غفار خاں کے درمیان مفاہمت کا امکان پیدا ہو گیا ہے تو وہ اور انہی جیسے دوسرے لوگ بوکھلا گئے۔ جب غفار خاں جناح کے ساتھ چائے پینے کے لئے نہیں پہنچے تو قیوم خاں نے ان کے خلاف جناح کے کان بھرنے شروع کئے۔ اس معاملے کو مزید الجھانے کے لئے اوراس غرض سے کہ کچھ خون بہہ جائے تاکہ مفاہمت غیرممکن ہو جائے قیوم خاں کی پولیس نے خدائی خدمت گاروں اور سرخ پوشوں کے ایک نہتے اور پرامن جلوس پر گولی چلا دی جس سے بہت سے لوگ مارے گئے۔ اب قیوم خاں کے لئے جناح کو صرف یہ بتانا رہ گیا تھا کہ انہیں اس کھلی بغاوت کو سختی سے کچل دینا چاہئے۔ غفار خاں اور ان کے ساتھ صوبائی اسمبلی کے متعدد ارکان سالہا سال جیلوں میں سڑتے رہے۔ اس طرح وزیراعلیٰ قیوم خاں کی آمرانہ حکومت کا برقرار رہنا یقینی ہو گیا۔ یوں پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل پر انکار کی مہر ثبت ہو گئی۔ حیرت ہے کہ جناح اتنی آسانی سے اس سازش کا شکار کیسے ہو گئے۔

ایک طرف تو صوبہ سرحد کے آباد اضلاع میں حکومت کی نااہلی اور ہسو جاہ کے باعث صورتحال بگڑتی جا رہی تھی دوسری طرف قبائلی علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ملک ان پر بے رحمی سے حکومت کر رہے تھے اور مظلوم افراد کے لئے چارہ جوئی کی خاطر پاکستانی عدالتوں تک رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ انہیں ووٹ دینے کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔

MashalBooks.org

ان کی جانب سے صرف ملک ووٹ دے سکتے تھے۔ ایک ایسے ملک کے لئے جس کی ایک بڑی آبادی حق رائے دہی سے بھی محروم ہو، خود کو آزاد کہنا بے شرمی کی بات ہو گی۔ ان قبائل کو جن کے اندر بے حد صلاحیتیں تھیں اگر پاکستان کے عوام قوانین کے تحت لایا جاتا اور انہیں قومی سیاست کے دھارے میں شامل کیا جاتا اور انہیں حقیقی آزادی دی جاتی تو آج وہ قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے۔ قبائلیوں کو رائے دہی کا حق 1996ء کے آخر میں نصیب ہوا۔

قوم میں تفرقہ اندازی کی ایک اور مثال ایچ ایس سہروردی کے تعلق سے تھی جسے مزید پھیلایا گیا۔ سہروردی ایک پکے مسلم لیگی، صحیح معنوں میں ایک پختہ کار سیاستدان تھے اور غیر منقسم بنگال کے وزیراعلیٰ رہ چکے تھے۔ آزادی کے بعد کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ جہاں اس وقت بہت سے مسلمانوں کی جانیں خطرے میں تھیں۔ چنانچہ سہروردی وہیں رک گئے تاکہ گاندھی کے ساتھ مل کر فرقہ وارانہ فسادات کو پھیلنے سے روکیں۔ سہروردی کو جب اس اہم کارگزاری سے فرصت نصیب ہوئی تو انہوں نے پاکستان آنے کا منصوبہ بنایا۔ اب جو لوگ برسر حکومت تھے انہوں نے ایک متبادل قیادت کے خطرے کو بھانپ لیا۔ چنانچہ انہوں نے بہ عجلت تمام اسمبلی میں ان کی رکنیت کو منسوخی کا بل پیش کر دیا۔ وہ پاکستان تو آ گئے تھے لیکن اب ان کے رویے میں تلخی آ گئی تھی۔ لیاقت علی خاں ان کو اپنی ذات کیلئے خطرہ سمجھتے تھے، پورے ملک میں جہاں وہ جاتے ان کا پیچھا کیا جانے لگا۔ یہ بڑی افسوسناک بات تھی۔ سہروردی کے پاکستان آنے کے بعد اس زبردست تلخی میں جو پہلے سے موجود تھی، اضافہ ہو گیا اور بنگالیوں کے ساتھ، جن میں سہروردی کے چاہنے والے بکثرت تھے تفرقہ اور بڑھ گیا۔ سہروردی کے سوانح میں اس کی دلدوز تفصیلات موجود ہیں۔

جن دنوں قیوم خاں کا ڈرامہ چل رہا تھا، ہندوستانی پنجاب اور جموں کی سیکڑوں میل لمبی سرحدوں سے چل کر مہاجروں کے قافلے آنے لگے تھے۔ وہ ایک بڑا انسانی المیہ تھا جس سے نبٹنے کے لئے حکومت کے قائدین کی بھرپور اور مکمل توجہ ضروری تھی انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انسانوں نے اتنی بڑی تعداد میں ایک نئے ملک کے اندر اور اتنے کم وقت میں ایک نئے ٹھکانے کی طلب اس وقت کی ہو جب انہیں سابقہ ٹھکانوں

اور مکانوں سے بے دخل کر دیا گیا ہو۔ اس وقت کسی فرد نے جو اس انسانی المیے کا احساس نہیں رکھتا تھا یا درپیش واقعات کی اہمیت سے ناواقف تھا، کشمیر میں گوریلا جنگ چھیڑ دینے کا فیصلہ کیا اور یہ سنجیدہ عناصر کے منع کرنے کے باوجود کیا اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی، ان میں میاں افتخار الدین بھی شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی کسی کارروائی سے بچنا چاہئے ورنہ ساری توجہ اور کوششیں جو مہاجر آبادکاری جیسے فوری نوعیت کے کاموں کے لئے درکار ہیں کسی اور طرف منتقل ہو جائیں گی۔

اور یہی مرحلہ تھا جب میاں افتخار الدین نے کہا کہ ہندوؤں اور سکھوں کچھوڑی ہوئی شہری املاک قومی تصرف میں لے لی جائیں تا کہ انہیں بعد میں تقسیم کیا جائے۔ جہاں تک زرعی اراضی کا تعلق تھا اور اس کی بہت بڑی تعداد تھی میاں افتخار الدین نے اس کے سلسلے میں متنبہ کیا کہ انہیں غیر حاضر مہاجر جاگیرداروں کو ہرگز نہ دیا جائے۔ ان کا مشورہ یہ تھا ان زمینوں کو کچھ عرصے کے لئے قومی ملکیت میں لے لیا جائے اور ان کے چھوٹے قطعات ان کسانوں میں بانٹ دیئے جائیں جو خود کاشت کرتے ہیں یہ سب کیسے ہوا؟ اس کے لئے میں حق نواز اختر کا بیان پیش کروں گا جو ان دنوں کالج کے طالبعلم تھے اور انہوں نے ساری سرگزشت میاں افتخار الدین سے خود سنی تھی۔ بعد میں اختر نے بطور چیئرمین پاکستان اسٹیل ملز اور وزارت ریلوے و مواصلات حکومت پاکستان میں سیکرٹری کے طور پر کامیابی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔

انہوں نے بتایا ''آزادی کے فوری بعد پاکستان کی نئی حکومت کو اپنے راستے اور سمت کا تعین کرنا تھا۔ اہم سوالات ان دنوں یہ تھے کہ جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی کیا آئندہ بھی برقرار رہے گی جبکہ ان کے سرپرست نوآبادیاتی حکمران رخصت ہو چکے ہیں۔ یہاں دو تین واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو مستقبل کی بدشگونی کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ حق نواز اختر گورنمنٹ کالج سرگودھا میں سال سوئم کے طالب علم اور مسلم لیگ کی طلبہ تنظیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھی تھے۔ وہاں آنے والے اکابر اور سیاستدانوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں سب سے پہلے پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں افتخار الدین تھے۔ وہ ضلعی مسلم لیگ کے عہدیداروں اور کارکنوں سے خطاب کرنے کے لئے سرگودھا آئے تھے۔ میاں صاحب کے ساتھ ملاقات میں اختر کے ہمراہ مسلم سٹوڈنٹس

فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری ارشد بھٹی بھی تھے۔ میاں صاحب نے انہی دنوں پنجاب کی کابینہ سے استعفیٰ دیا تھا۔ وہ ٹرانسپورٹ اور مہاجر آباد کاری کے محکموں کے وزیر رہ چکے تھے۔ اب اس ملاقات کا ماحول اختر کی زبانی سنئے جنہوں نے یہ عبارت میری فرمائش پر لکھی ہے:

''میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا، ایک نہایت گہرا، تفتیش طلب سوال۔ انہوں نے دونوں کے جواب نہایت صراحت کے ساتھ دیئے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کابینہ سے الگ ہو ہی چکے ہیں تو پارٹی کی تنظیم کیلئے اتنی محنت کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ سرکاری امور یا وزارتی عہدے یہ سب کسی سیاسی پارٹی کے لاحقے اور اس کے تابع ہیں جب تک پارٹی مستحکم رہے گی اور اس کی جڑیں عوام میں ہوں گی وہ اپنی پالیسیوں اور منشور کے ذریعے حکومت کو اسکی کارکردگی کے بارے میں ہدایات دیتی رہے گی۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے استعفیٰ کیوں دیا تو انہوں نے جواب دیا یہ ایک لمبی کہانی ہے، مختصر یہ کہ انہوں نے وزیراعلیٰ اور اپنی کابینہ کے رفقاء سے کہا کہ میں صرف مشرقی پنجاب، دہلی اور یوپی کے مہاجروں کا وزیر نہیں رہوں گا بلکہ یہ چاہوں گا کہ انہیں ایک سے دوسری جگہ عارضی مہمان کے طور پر بھیجتے رہنے کے بجائے جلد از جلد اور پورے وقار کے ساتھ بحال کیا جائے۔ میاں صاحب چاہتے تھے کہ ان کی آبادکاری کا ایک جامع منصوبہ بنایا جائے۔ چونکہ مہاجرین کی بھاری تعداد کا تعلق دیہات سے تھا اس لئے انہوں نے مغربی پنجاب میں مہاجر آبادکاری کے لئے ایک لینڈ بینک (اراضیات کا بینک) قائم کرنے کی تجویز دی۔ اس بینک میں ساری متروکہ اراضی شامل ہوں گی اور وہ زمینیں بھی اس بینک میں آ جائیں گی جو موجودہ جاگیرداروں کے پاس فالتو اور خودکاشت کی حدود سے باہر ہیں۔ اس تجویز کے نتیجے میں زرعی اصلاحات اور مہاجر آباد کاری کے

مقاصد پورے ہو جاتے جعلی کلیموں کا مجرمانہ کاروبار نہ چلتا اور مفت خوروں کا ایک اضافی طبقہ پیدا نہ ہوتا۔ اس تجویز پر بڑی واویلا ہوئی اور میاں صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ قائداعظم نے مداخلت کی لیکن پنجاب کابینہ کو وہ بھی قائل نہ کر سکے (اس میں حیرت کی بات کیا تھی، جب اس کے وقت کے وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین خاں ن ممدوٹ خود ایک بڑے مہاجر دعویدار تھے۔)

میاں افتخار الدین کو اس غوغہ آرائی کے بعد حکمراں پارٹی سے بھی نکال دیا گیا اور زندگی کے آخری زمانے میں انہیں کمیونسٹ ہونے کے طعنے دیئے گئے۔ لوگ اس بات کو بہت جلد بھول گئے کہ اگر میاں صاحب پیش قدمی نہ کرتے اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع نہ کرتے تو اس وقت پنجاب تحریک پاکستان سے باہر رہ جاتا۔

دوسرا انٹرویو وزیر داخلہ نواب مشتاق احمد گورمانی کے ساتھ تھا:

''ارشد بھٹی حسب معمول میرے ساتھ تھے۔ ہماری ملاقات نہری محکمے کے ریسٹ ہاؤس میں وزیر صاحب کی خواب گاہ میں ہوئی۔ جب ہم اندر پہنچے تو نواب گورمانی شب خوابی کے لباس میں آرام سے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ انہوں نے بعض چونکا دینے والی باتیں کیں۔ انہوں نے ہم نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ ایک تحریک دانش (Intellectnal M ovement) کا آغاز کریں اور ملک میں ذہنی انقلاب برپا کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف سے ملک کو ہمکنار کرنے کے لئے یہ انقلاب نہایت ضروری اور یقیناً ایک آزاد قوم کے شایان شان ہو گا۔ جب میں نے ادب سے گزارش کی کہ ہم سے بڑے دانشمند رہنماؤں سے رہنمائی چاہتے ہیں تو انہوں نے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ ''ہم جیسوں کو بھول جاؤ'' ہم انگریزوں کے جی حضوری کر چکے ہیں۔ ہم سازشوں کے ذریعے یہاں تک پہنچے ہیں اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے

کام کرتے آئے ہیں۔ ہم برطانوی حکومت کی مراعات اور سرپرستی سے پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ ایک آزاد اور خودمختار پاکستان کو جس طرح کے رہنماؤں کی ضرورت ہے یعنی ایسے رہنما جو نہایت بے ریا، بے لوث اور عقیدے میں محکم ہوں ان کے لئے ہم اس ضمن میں کوئی اچھی مثال نہیں۔''

''بڑا خالص، پاکیزہ اور ولولہ انگیز پیغام لیکن بدقسمتی سے میرے لئے اس کا انجام ناخوشگوار تھا۔ ارشد بھٹی نے جو پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت کے نامہ نگار بھی تھے اس ملاقات کی ایک خبر بنائی جس کی شہ سرخی یہ تھی ''ضرورت ہے ایک انقلاب کی۔ وزیر داخلہ کا اعلان'' جب گورمانی سے کابینہ میں اس بیان کی وضاحت مانگی گئی تو انہوں نے ایسے کسی بیان یا انٹرویو سے ہی انکار کر دیا۔ نیاز احمد سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر تھے (وہ مسٹر شعیب کے بھائی تھے، جو 1960ء کے عشرے کے اوائل میں ایوب خاں کی کابینہ میں وزیر خزانہ مقرر ہوئے) نیاز احمد نے پولیس انسپکٹر بھیج کر ہم دونوں کو بلوا بھیجا اور دھمکی دی کہ اگر ہم نے اس انٹرویو کی تردید نہ کی تو ہمیں جیل میں بند کر دیا جائے گا ارشد بھٹی کو ہدایت دی گئی کہ اپنے ہی مراسلے کی تردید شائع کرائے۔''

''تیسرا واقعہ جو 1949ء کے اواخر یا 1950ء کے اوائل میں پیش آیا ایسا تھا کہ اس کے بعد میں نے کسی طرح کے سیاسی کیریئر کا خیال ترک کر دیا۔ میں ان دنوں لاہور کے میکلیگن انجینئرنگ کالج کا طالب علم تھا (جو اب یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ہے) ایک روز نسبت روڈ پر جہاں میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا، واپس آتے ہوئے میں نے لکشمی چوک پر لوگوں کا ایک مجمع دیکھا۔ وہاں باٹا مزدور لیگ کے چار کارکن بھوک ہڑتال پر بیٹھے تھے۔ میں لوگوں کی بے چینی کی وجہ جاننے کے لئے وہاں پہنچا۔ بھوک ہڑتالیوں نے مجھے بتایا کہ انتظامیہ ان کے ساتھ زیادتی کرتی ہے اور حکومت یا حکمران جماعت (پنجاب مسلم لیگ) اتنی بے رحم ہے کہ ان کی بھوک ہڑتال کو تماشا کہتی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ باٹا کمپنی کے ایک ڈائریکٹر، وفاقی وزیر صحت چودھری نذیر احمد کے قریبی عزیز ہیں، اس بنا پر کمپنی کی انتظامیہ مزدوروں کے جائز مطالبات سے بھی لاتعلق ہو چکی ہے۔ یہ سن کر راقم غصے سے بپھر گیا اور پھر ایک شعلہ بار تقریر کر دی (کھڑے ہونے

MashalBooks.org

کے لئے مجھے ایک سٹول مہیا کر دیا گیا تھا، اگرچہ مائیکروفون دستیاب نہ ہو سکا) میرے مخاطب بے رحم حکمران تھے جنہیں میں نے متنبہ کیا کہ وہ ایک آتش فشاں، ایک خونیں انقلاب کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی زور دے کر کہا جو ایک احمقانہ خیال تھا کہ پاکستان مراعات یافتہ طبقے کے لئے نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کا استحصال کریں۔ میری بدقسمتی سے اس مجمع میں مرحوم حمید نظامی بھی موجود تھے۔ دوسرے دن کے نوائے وقت میں سرخی کے ساتھ یہ عبارت شائع ہوئی کہ ایک نامعلوم طالب علم نے خونیں انقلاب کی پیش گوئی کی ہے۔ میرے ایک دوست نے جس کا بھائی دہشت زدہ کر دینے والی پنجاب سی آئی ڈی کیلئے کام کر رہا تھا، دوسرے ہی روز مجھے خبردار کیا کہ وہ لوگ اس نامعلوم طالبعلم کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور میرے لئے بہترین بات یہ ہو گی کہ فرار ہو جاؤں۔ میں نے اپنا تعلیمی پروگرام تو بیچ میں ہی چھوڑا اور خاموشی سے سرگودھا، اپنے بے نام ٹھکانے پر پہنچ گیا، وہاں میں نے اپنے والدین کو بتایا کہ امتحانات کی تیاری کے لئے کالج بند ہو گیا ہے۔''

آزادی کے بعد بھی پولیس مجرموں کو پکڑنے کے بجائے سیاسی کارکنوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ یہ ترجیحی رویہ آزادی کے پچاس سال بعد 1997ء تک برقرار رہا۔ 1947ء کی طرح 1997ء میں بھی مجرم نہیں، بلکہ سیاسی کارکن پولیس سے ڈرتے رہے۔

اختر کے بیان کی تصدیق ان الفاظ سے ہوتی ہے۔''جب میاں افتخار الدین نے یہ مشورہ دیا کہ مہاجروں کو متروکہ زمینوں پر آباد کیا جائے تو انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا'' [8] اور اختر کے بیان کی تائید میں اب میاں کے اپنے افکار موجود ہیں۔ [9] 15 نومبر 1947ء کو پاکستان کے شہریوں نے اپنے اخبارات میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی جاری کردہ یہ خبر پڑھی تھی:

> ''میاں افتخار الدین نے جنہیں دو ماہ قبل وزیر برائے مہاجر آبادکاری بنایا گیا تھا، اپنے رفقاء سے اختلافات کی بنا پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اختلاف حکومت پنجاب کی آبادکاری کی پالیسی پر ہوا۔ میاں افتخار الدین صوبے میں اراضیات اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے حوالے سے معروف ہیں، وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد

MashalBooks.org

انہوں نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں بحالیات کے بارے میں اپنی پالیسی کی وضاحت کی تھی اور اعلان کیا تھا کہ وہ مغربی پنجاب کے مہاجرین کے درمیان ایک مفاد پرست طبقہ پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ مہاجر آبادکاری کے بھاری مسئلے کو کامیابی کے ساتھ اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکے گا جب تک صوبے میں طبقاتی امتیاز ختم نہیں کیا جاتا اور ہر شخص کو خوشحالی اور ترقی کے یکساں مواقع فراہم نہیں کئے جاتے۔ (10)

ستمبر 1948ء میں جناح کا انتقال ہوا۔ یہ بجائے خود ایک زبردست انسانی المیہ تھا کیونکہ انہوں نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا تھا۔ انکی جگہ خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا لیکن ان کے معاملے میں ایک بڑی کوتاہی تھی۔ پاکستان کی مستقل انتظامیہ میں ان کے لئے حمایت موجود نہ تھی۔ ناظم الدین کا شاندار کارنامہ زمینداری کا خاتمہ تھا۔ اس کا اثر پنجاب اور سندھ میں نظر نہیں آیا۔ ناظم الدین مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کے لئے اگرچہ کچھ تھے تو ان کے مفادات کے لئے خطرہ ہی تھے۔ جاگیردار افسر شاہی سے خوفزدہ تھے اور بے وجہ نہ تھے۔اس کا ایک حقیقی سبب تھا۔ نو آبادیاتی حکمرانی کے دور میں اضلاع کے سربراہ پنجاب میں ڈپٹی کمشنر اور سندھ میں کلکٹر ہوا کرتے تھے۔ انگریز حکمران انہی کے ذریعے اپنے احکام نافذ کرتا تھا۔ ضلع کا حاکم، جاگیرداروں کے لئے ''بڑا صاحب'' تھا جو انگریزی کا راج کا آلہ کار ہوا کرتا تھا۔ ضلع کے حاکم کے ذریعے سے حکومت جاگیرداروں کو سیدھی راہ پر رکھتی تھی، غلط رویے پر تنبیہہ کرتی یا راج کے لئے ان کی خدمات پر انعام دیتی۔ اس افسر کے ذریعے سے جاگیردار کو تقادی قرضہ ملتا تھا جسے معاف بھی کر دیا جاتا تھا۔ سی کے توسط سے اعلیٰ درجے کے سکولوں میں اس کے بیٹے کو داخلہ مل جاتا تھا۔اس حاکم ضلع کی سفارش سے جاگیردار کو خطاب ملتا تھا یا جاگیر کے طور پر اسے مزید اراضی بخش دی جاتی تھی اور یہی ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا جو جاگیردار کو سزا دے کر جیل بھیج سکتا تھا اس کی جاگیر ضبط کر سکتا تھا یا اس کی بے وفائی پر مختلف طریقوں سے ذلیل کر سکتا تھا۔

جب کوئی جاگیردار ''بڑا صاحب'' کو اپنا خراج عقیدت پیش کرنے کا ارادہ کرتا

خواہ وہ صاحب ہندوستانی ہوتا یا دیسی تو وہ اس کی تیاری کئی ہفتے پہلے شروع کر دیتا تھا۔ وہ اس موقع کیلئے موزوں لباس منتخب کرتا، ایسا لباس جو صاحب کو ناپسند نہ ہو، پھر ''ڈالی'' تیار کراتا۔ یعنی وہ تحفہ جس سے ''صاحب'' کے ساتھ اس کی وفاداری ظاہر ہو۔ اس تیاری کے بعد جاگیردار ''بڑا صاحب'' کے پیش کار کے پاس پہنچتا۔ یہ پیش کار ایک طرح کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوتا۔ وہ پیش کار سے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ملاقات کا وقت مانگتا وہ وقت جب صاحب خوشگوار موڈ میں ہو جاگیردار ''صاحب'' کے آگے انتہائی تابعداری کے جذبے کے ساتھ جھک جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر اسے بیٹھنے کیلئے بھی نہیں کہا جاتا تھا اگر وہ جاگیردار سے ناخوش ہوتا، تو اپنا سرا ثبات میں ذرا سا ہلا دیتا یہ بتانے کے لئے کہ اس نے ''ڈالی'' قبول کر لی پھر کہتا ''ٹھیک ہے'' اس کے بعد صاحب کا اردلی جاگیردار کو باہر کا راستہ دکھاتا۔ اگر شاذ و نادر کبھی ایسا ہوتا کہ صاحب جاگیرداری کی سپاس گزاری کو پسند کرتا تو مشفقانہ انداز سے مسکرا دیتا۔ جاگیردار اس موقع کا جشن مناتا اور اسے مہینوں یاد رکھتا۔ وہ دوسرے جاگیرداروں کو کھانے پر مدعو کرتا۔ محض یہ بتانے کے لئے کہ صاحب نے کس طرح مسکرا کر دیکھا تھا اور شاباش دی تھی۔ اس سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ جاگیردار، افسر شاہی کے لئے کس طرح کا احترام رکھتے تھے حالانکہ ڈپٹی کمشنر کے روبرو ہدیہ عقیدت پیش کرنے کا موقع ملتا تھا اور صوبائی سیکرٹری کے آگے تو اس سے بھی کم اور چیف سیکرٹری کے حضور میں تو بہت ہی کم اور لاٹ صاحب یعنی گورنر کے آگے سرخم کر دینے کی سعات تو شاذ و نادر ہی کسی کو حاصل ہوتی ہو گی۔

آزادی کے موقع پر ایسے ہی جاگیرداروں کے درمیان سے وہ سیاستدان نکلے جو راتوں رات مقتدر ہو گئے۔ ریاست کا انتظام چلانے کے لئے نہ تو انہیں کوئی سیاسی تربیت ملی تھی اور نہ ان کے پاس انتظامی اہلیت تھی۔ اس لئے بوکھلا کر رہ گئے۔ یہ بات ان کے حافظے میں بھی تازہ تھی کہ ''بڑا صاحب'' کس طرح ان کی تقدیر کے فیصلے کرتا تھا۔ کہاں تو ''بڑا صاحب'' کے آگے اس کی کوئی بساط نہ تھی اور کہاں یہ کہ اب وہ حکمران بن گیا۔ اس سے جو نفسیاتی عدم تعاون پیدا ہو گیا، اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا اور اس کا انتظام اسی طرح چلانا شروع کر دیا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے اور ریاست کے باشندوں کو اپنا غلام سمجھنا شروع کر دیا۔ تاہم جاگیرداروں کو یہ

اطمینان حاصل تھا کہ ریاستی امور کو چلانے کے لئے افسر شاہی موجود ہے۔ ان کے لئے تو صورتحال پہلے ہی جیسی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا، البتہ ایک چھوٹی سی دشواری ضرور تھی۔ پہلے افسر شاہی کو وائسرائے کو سیاسی رہنمائی سیکرٹری برائے امور ہند سے ملتی تھیں جو لندن کے انڈیا آفس میں ہوتا تھا اور سیکرٹری برائے امور ہند برطانوی پارلیمنٹ کے تابع تھا۔ وائسرائے اور اس سے اوپر اقتدار کا جو تسلسل تھا اب اس کی جگہ کوئی متبادل ادارہ موجود نہیں تھا۔ اب نہ کوئی فرد تھا اور نہ ادارہ جو سیاسی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالتا۔

جناح کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ 1948ء کے وسط تک وہ زیارت چلے گئے تھے۔ یہ بلوچستان کا وہ صحت افزا مقام ہے جسے جناح آزادی کے زمانے سے پہلے بھی پسند کرتے آئے تھے۔ پھر ان کی طبیعت بگڑنے لگی۔ 11 ستمبر 1948ء کو انہوں نے کراچی واپسی کا فیصلہ کیا۔ ان کا انتقال اسی ایمبولینس میں ہوا جو انہیں ہوائی اڈے سے ان کی سرکاری اقامت گاہ تک لانے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ ''اگر نہرو مر جاتے تو ان کی جگہ لینے کے لئے راج گوپال اچاریہ یا پٹیل موجود تھے لیکن جب جناح انتقال کر جاتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کے لئے کوئی نہیں ہوتا اور ان کے بغیر تو لیگ کی گاڑی بالکل ہی پٹڑی سے اتر جائے گی اور آگ اور خون بکھیرتی ہوئی ہندوستان سے گزر جائے گی۔''(11)

لیاقت علی خان جناح کے سیاسی جانشین تھے، راج موہن گاندھی نے ان کی زندگی میں ان کے لئے یہ تحسینی کلمات کہے تھے، جو بالکل درست تھے۔ ''اگر جناح نے پاکستان بنایا تو لیاقت نے اپنے کردار کو کمتر حیثیت دی اور محسوس کیا کہ پاکستان ان کو مل گیا ہے۔ جناح کو اگر یہ فخر حاصل تھا کہ انہوں نے پاکستان کوشش سے حاصل کیا تو لیاقت اس خیال سے سرشار تھے کہ پاکستان ان کے تصرف میں آ گیا ہے۔ پاکستان کے لئے ان کی خود سپردگی کا اظہار اس فقرے سے ہوگا کہ ''اگر میں پاکستان کی خدمت بطور ایک چپڑاسی کے کر سکوں تو میں اس ملک کا سب سے مفتخر شخص ہوں گا۔'' نواب کے بیٹے نے ہندوستان میں بیش قیمت جائیداد چھوڑی تھی، پاکستان میں وہ ایک قطعہ اراضی سے بھی محروم رہے، انہوں نے کلیم داخل کرنے سے انکار کر دیا جو ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے بطور معاوضہ مل سکتا تھا لیکن انہوں نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ پاکستان برقرار رہنے کا اہل ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ تھی کہ جس طرح جناح کے ایک معاون لیاقت تھے، اسی طرح

MashalBooks.org

لیاقت کا معاون کوئی نہ تھا۔'' (12)

لیاقت اگرچہ دوسرے مسلم لیگی جاگیرداروں سے جو محض فرضی سیاستدان تھے کہیں زیادہ بلند و برتر تھے لیکن وہ جناح جیسے قد و قامت کے مالک نہ تھے۔ اگرچہ جناح کا لبادہ ان کے شانوں پر بہت بوجھل تھا لیکن لیاقت نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جاگیردارانہ سماجی نظام پاکستان کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ یہ بات انہوں نے بہت سی تقریروں میں کہی اور ایک بار تو خود میں نے بھی سنا، جس سے بخوبی معلوم ہوا کہ مہاجر آباد کاری کے کام سے جو فوری نوعیت کا تھا، انہیں جوں ہی مہلت ملی وہ زرعی اصلاحات نافذ کریں گے۔ لیاقت خود بھی ہندوستانی پنجاب کے مقام کرنال کے ایک صاحب جائیداد رئیس تھے اور ان کی وافر زمینیں، جمنا کی دوسری طرف یوپی کے ضلع مظفر نگر میں تھیں لیکن انہوں نے مشرقی پنجاب میں چھوڑی ہوئی زمینوں کے عوض پاکستان میں ہندوؤں کی زمینوں پر اپنا کوئی دعویٰ نہیں کیا اور اس طرح اپنا اخلاص ثابت کر دیا لیکن انہوں نے اپنی ذات کی حد تک جس طرح جاگیرداری سے بریت کا اعلان کیا تھا اس سے ان کے پنجابی جاگیردار رفیقوں میں ان کے لئے کوئی پسندیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ ان کے نزدیک تو لیاقت نے اپنے طبقے سے دغا بازی کی تھی۔ لیاقت کے ساتھ یہ ایک کمزوری تھی۔

لیکن لیاقت کے ساتھ ایک اس سے بھی بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کا کوئی حلقہ انتخاب نہ تھا اور وہ کسی سیاسی عمل کے نتیجے میں اوپر نہیں آئے تھے۔ ان کا انتخابی حلقہ یا تو کرنال میں تھا یا مظفر نگر میں تھا اور یہ دونوں جگہیں ہندوستان میں تھیں۔ مہاجر جو ان کے ووٹر تھے وہ دور تک بکھرے ہوئے تھے انہیں مغربی پنجاب میں جگہ جگہ بسایا گیا تھا اور کچھ سندھ میں آباد کئے گئے تھے۔ حالانکہ لیاقت اپنی مقبولیت کی بنا پر پاکستان میں کسی بھی جگہ سے دوبارہ منتخب ہو سکتے تھے لیکن وہ ان کا انتخابی حلقہ نہ تو ہوتا کیونکہ وہ لوگ اس طرح قریب سے نہیں جانتے تھے، جیسے کرنال کے لوگ کہ یہ شہر ان کا جائے پیدائش تھا یا مظفر نگر میں ان کی جاگیر کے لوگ انہیں جانتے تھے۔ عملاً اب وہ افسر شاہی یا اپنے کچھ ساتھی جاگیرداروں کے رحم و کرم پر تھے، تاہم زرعی اصلاحات کے بارے میں لیاقت کے بیانات نے جاگیرداروں کو ہراساں کر دیا تھا۔ وہ جاگیرداری نظام کے لیے خطرہ تھے۔

آزادی کے بعد دو ہی سال کے اندر مئی 1949ء میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کو گورنر مغربی پنجاب کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ایک نہایت موقر اخبار

تھا اور اس کا شمار غیر منقسم ہندوستانی کے قدیم ترین اخباروں میں ہوتا تھا۔ آزاد پاکستان میں بھی اس کا اعتبار اور احترام دوسرے کسی بھی اخبار سے زیادہ تھا۔

جناح کی رحلت کے بمشکل نو ماہ بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپریل 1949ء میں ایک خبر شائع کی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان، ریاست جموں و کشمیر کی تقسیم کا ایک فارمولا زیر بحث ہے اور اس بارے میں عنقریب ایک سمجھوتہ ہو جائے گا۔ حکومت پاکستان نے اس خبر کی تردید کر دی۔ دوسرے دن سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے اخبار کے صفحہ اول پر وہ تردید شائع کر دی اور اس کی اساعت پر اظہار افسوس بھی کیا۔ 6 مئی 1949ء کو ایک مشترکہ اداریہ میں مغربی پاکستان کے 16 مدیران اخبارات نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کی معطّلی کا مطالبہ کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے مدیروں نے اس طائفے میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی خبر کا حوالہ دیتے ہوئے مشترکہ اداریے میں کہا گیا تھا کہ اس میں ''ایسی متعدد جھوٹی باتیں درج ہیں جن کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں (اس لئے) ہم بہ اصرار اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ریاست کے خلاف اور ہمارے عوام کے خلاف ایسی جارحانہ اور بے دریغ مداخلت کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ لہٰذا مطالبہ کرتے ہیں کہ گورنر مغربی پنجاب جو اس صوبے کے کلیتًا اور واحد سربراہ ہیں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف فوری تادیبی کارروائی کریں اور ایک مناسب عرصے کے لئے اس کی اشاعت کی معطّلی کا حکم صادر فرمائیں۔ مغربی پاکستان کی پریس مشاورتی کمیٹی نے بھی اسی روز اس طرح کا مطالبہ کر دیا۔ جن دستخطوں کے تحت سول ملٹری گزٹ کی بندش کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسکے آخر میں افسوس ناک طور پر فیض احمد فیض کے دستخط بھی موجود تھے، جنہیں بالعموم آزادی صحافت کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ تاہم مغربی پاکستان کے کارکن صحافیوں نے مشرقی پاکستان کے مدیران اخبارات اور کارکن صحافیوں کی طرح آزادی اظہار کو اس طرح سلب کئے جانے کی مخالفت کی۔ کراچی کے صحافیوں نے اس اقدام کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے اخباری بیان میں کہا ''سندھ یونین آف جرنلسٹس (ایس یو جے) کی مجلس انتظامیہ نے آج حکومت پاکستان سے اپیل کی ہے کہ پاکستان میں ایک صحت مند اور صحیح معنوں میں جمہوری صحافت کے استحکام کی خاطر سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف کارروائی سے احتراز کریں۔ تاہم گورنر

نے کارکن صحافیوں کو صحافت کے قبیلے میں ''نچلی ذات کے لوگ قرار دیا اور مدیروں کے بالائی طبقے سے اتفاق کرتے ہوئے بہ کمال مہربانی سول اینڈ ملٹری گزٹ کو چھ مہینوں کے لئے بند کر دیا۔''

یہی زمانہ تھا جب پنجاب کے جاگیردار سیاستدانوں نے آپس میں بے کم و کاست دنگا فساد شروع کر دیا تھا۔ نواب ممدوٹ کی حکومت 25 جنوری 1949ء کو برخاست کر دی گئی اور صوبے کو براہ راست گورنر کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے صوبائی خودمختاری کو بروئے کار نہیں لایا گیا۔ پنجاب میں حکمرانی غیر ممکن ہوتی جا رہی تھی چنانچہ پنجاب صوبائی اسمبلی کو بھی ختم کر دیا گیا۔ نئے انتخابات 1952ء میں ہوئے۔ 1952ء میں صوبائی اسمبلیوں کے ہونے والے انتخابات بدنامی کی حد تک غیر منصفانہ اور جانبدار نہ تھے۔ ڈپٹی کمشنر لاہور کے ''جھاڑو'' کو لوگ اب تک نہیں بھولے، جس نے مسلم لیگ کی حمایت میں جھاڑو پھیر دیا تھا۔ ان انتخابات کا میں خود بھی شاہد ہوں۔ میں پورے یقین کے ساتھ اس کی تصدیق کروں گا کہ صرف لاہور میں نہیں بلکہ پنجابی پنجاب کے طول و عرض میں جھاڑو پھیری گئی۔ اس کے بعد سے آئندہ کبھی پاکستان میں ہونے والے انتخابات میں اس جادو کی چھڑی یعنی جھرلو، نے ساتھ نہیں چھوڑا۔

ان انتخابات کا سب سے اندوہناک مذاق یہ تھا کہ لاہور کے حلقہ انتخاب سے

جھرلو کے اصطلاحی معنی کو سمجھنے میں مصنف کو غالباً غلط فہمی ہوئی- قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامہ میں اس کی وضاحت کچھ یوں کی ہے-''عزت مآب وزیر اپنے اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کے کندھے پر دست شفقت رکھ کر الگ لے گیا- اور اس کے حوالے ایک بنی بنائی فہرست کر دی جس میں تفصیلاً تفصیلاً یہ درج تھا کہ کون سے علاقے سے کون سا امیدوار عوام کا حق نمائندگی پوری طرح ادا کرنے کا اہل ہے اور کون کون سے امیدوار کو ہر قیمت پر ناکام کرنا باعث ثواب ہوگا۔ ڈپٹی کمشنر صاحبان نے دل و جان سے کاغذ کے بنے ہوئے یہ ''جھرلو'' اپنی جیب میں ڈال لئے- عام زندگی میں ''جھرلو'' گھمانا مداریوں کا کسب ہے لیکن جب یہ جھرلو الیکشن کے موقع پر ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر گھومتا ہے تو عوام کی ہتھلیوں پر سرسوں کے کھیت کے کھیت جم جاتے ہیں- لوہے کی سربمہر صندوقچیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور نااہل امیدواروں کے نام پڑے ہوئے ووٹ، تناسخ ارواح کے اصول پر لائق و فائق امیدواروں کے بکسوں میں منتقل ہو جاتے ہیں-'' (مترجم)

مرزا ابراہیم کو خلاف توقع شکست ہوگئی۔ آزادی سے پہلے مرزا ابراہیم ہندوستان کے سب سے زیادہ باعزت ٹریڈ یونین لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اس وقت آل انڈیا ریلوے ٹریڈ یونین کے صدر اور وی وی گری اس کے سیکرٹری تھے۔ آزاد ہندوستان نے جہاں گری کو اپنا صدر منتخب کیا، وہیں آزاد پاکستان نے گری کے صدر ابراہیم کو شکست دے دی۔

آزادی صحیح معنوں میں افسر شاہی کو ملی تھی۔ برطانوی وائسرائے کے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا تھا اس کو پر کرنے کے لئے کوئی مقتدر ادارہ موجود نہ تھا لہٰذا افسر شاہی کو کنٹرول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جناح بہت سے دیگر امور میں مصروف تھے اور ان کی صحت بہت خراب تھی۔ جاگیردار افسر شاہی کے تابعدار تھے اور اس نے ان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ صرف لیاقت ان کے لئے خطرہ تھے کیونکہ اپنے مرتبے اور پورے ملک کے عام لوگوں میں اپنی مقبولیت کی بنا پر ان کے ماننے والے بہت تھے حالانکہ ان کا کوئی انتخابی حلقہ نہ تھا اور نہ ابتدائی سطح سے کام کرنے کا کوئی سیاسی تجرب تھا۔ افسر شاہی کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی ان کی اطاعت گزار تھا۔ 1951ء میں مقتدر سرکاری افسر اور ان کے ماتحت یعنی جاگیردار سیاستدان کسی اور کو نہیں صرف لیاقت کو اپنے لئے خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ اکتوبر 1951ء میں لیاقت کو راولپنڈی کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

ان کے قاتل کو اسی پولیس والے نے گولی مار دی جو ان کے پہرے پر تعینات تھا۔ ان کی موت کے اسباب کی تحقیق کی گئی لیکن کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا، ایک اعلیٰ پولیس افسر جو انکوائری کر رہا تھا ہوائی جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا وہ اپنے ساتھ ایسے کاغذات لے جا رہا تھا جن میں لیاقت کی ہلاکت کے متعلق اہم اطلاعات درج تھیں کسی کو نہیں معلوم کہ لیاقت کو کیوں قتل کیا گیا اور اس کے لئے ہدایات کس نے دیں۔ اس سانحہ قتل اور طیارے کے حادثے کے سلسلے میں شکوک ہمیشہ سے موجود ہیں۔ بہت سے اعلیٰ سرکاری افسر اور جاگیردار لیاقت کی ہلاکت سے بالکل آزردہ نہیں تھے۔ اب ان کے اقتدار کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی جگہ ناظم الدین وزیراعظم بنائے گئے۔ غلام محمد جو ایک سرکاری افسر تھے گورنر جنرل بن گئے۔

اکتوبر 1951ء میں لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد افسر شاہی کی طاقت کا پہلا مظاہرہ ہوا۔ اس کے بجائے کہ لیاقت کے جانشین کا انتخاب برسر اقتدار جماعت کرتی وزیر

خزانہ غلام محمد اور دوسرے دو وزراء خواجہ شہاب الدین اور گورمانی نے فوج کے کمنڈر ایوب خان سے مل کر ایک سازش تیار کی۔ اس امر کا اعلان ہوا کہ کابینہ کے فیصلے کی رو سے خواجہ ناظم الدین کی جگہ گورنر جنرل کا عہدہ غلام محمد سنبھالیں گے اور آئندہ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین ہوں گے۔ دوسروں کے علاوہ دولتانہ کو اس اعلان سے بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے راقم کو بتایا کہ چند روز قبل ان کی ملاقات لیاقت علی خاں سے ہو چکی تھی۔ دولتانہ نے پنجاب کے وزیراعلیٰ کے طور پر وزیراعظم سے ملاقات کی تھی۔ وزیراعظم نے ان سے کہا تھا کہ وفاقی کابینہ میں وہ چند تبدیلیاں کریں گے جس کیرو سے گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کو ڈپٹی وزیراعظم کا عہدہ تفویض کریں گے، دوسرے کابینہ میں حسین شہید سہروردی کو شامل کیا جائے گا، تیسرے وزیر خزانہ غلام محمد کو کابینہ سے فارغ کر دیا جائے گا کہ بجا طور پر وہ آرام کے مستحق ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وزیراعظم ان تبدیلیوں کو بروئے کار لاتے، قاتل کی گولی نے ان کی زندگی ختم کر دی۔ دولتانہ کے بیان کے مطابق اگر پارٹی کو قیادت کے انتخاب کا موقع ملتا تو وہ سردار نشتر کو وزیراعظم منتخب کرتی۔ دولتانہ کا کہنا تھا کہ سازشی عناصر نشتر کو ناپسند کرتے تھے، اس بنا پر انہوں نے ان تبدیلیوں کا بڑی عجلت کے ساتھ اعلان کر دیا اور یہ ہدایت بھی دی کہ تمام لوگ اپنے اپنے صوبوں میں قیام رکھیں اور اسٹیشن سے باہر نہ نکلیں۔ (14)

صاف ظاہر ہے کہ لیاقت کے قاتلوں، یعنی افسر شاہی اور جاگیرداروں کو آنے والے خطرے سے جات پا لینے کی جلدی تھی چنانچہ قاتلوں کو فائدہ تو ہوا لیکن اس کا فائدہ چند اہم لوگوں کو بھی ہوا۔

> ''لیاقت کے قتل کی ایک منطق تو تھی۔ لیاقت اگرچہ کوئی انقلابی یا نہایت آزاد خیال شخص نہ تھے، تاہم ان کے ترقی پسندانہ خیالات مقتدر اشرافیہ کو موافق نہ تھے۔ اس سے اس بیان کی صداقت ثابت ہوگئی کہ فیصلے کا اختیار بتدریج سول اور فوجی افسر شاہی کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ حکومت کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی تھی اس بارے میں اگر اب بھی کوئی شک باقی رہ گیا تو اس کی توثیق اس وقت ہوگئی جب غلام محمد نے اپریل 1953ء میں وزیراعظم خواجہ ناظم

الدین کو برطرف کر دیا۔ افسر شاہی کو سیاستدانوں سے فیصلہ کرنے
کے اختیارات چھیننے میں پانچ سال سے بھی کم عرصہ لگا۔'' (15)

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ خواجہ صاحب کو برطرف اس وقت کیا گیا جب وہ مرکزی اسمبلی میں بجٹ کی منظوری کی صورت میں بھاری اکثریت سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر چکے تھے۔ وہ اپنے تدبر، سیاست میں صاف گوئی اور سب سے بڑھ کر اپنے رئیسانہ خاندانی پس منظر کے باوصف عوام دوستی کے لئے مشہور تھے چنانچہ اعلیٰ افسروں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے جرنیلوں سے تعاون کی درخواست کی اور وہ تعاون انہیں مل گیا۔ ممکنہ ردِعمل سے پیش بندی کی خاطر افسر شاہی نے جاگیردار سیاستدانوں سے اور مغربی پاکستان کے اخبارات سے مدد مانگی۔ چنانچہ اس کے تمام صوبوں میں اور بطور خاص لاہور میں خواجہ ناظم الدین کے خلاف پراپیگنڈے کی زبردست مہم مسلسل چلائی گئی۔ لاہور اس لئے کہ سیاسی طور یہ انتہائی حساس شہر تھا اور اسے پاکستان کا قلب شمار کیا جاتا تھا۔ پبلک جلسوں میں، مظاہروں میں اور اخبارات کے مضامین میں ناظم الدین کی مذمت نہایت ناشائستہ الفاظ میں ہوتی رہی اور اکثر غیر شریفانہ طور پر بھی مثلاً مظاہروں میں اس طرح کے نعرے لگائے گئے ''بھوکا بنگالی ہائے ہائے'' اور ''بنگالی کتا ہائے ہائے''۔ ''بھوکا بنگالی'' کا حوالہ بنگال میں ہونے والے اکثر غذائی قحط کی طرف ہوتا ہے اور اس سے بنگال کے لئے شدید نفرت ظاہر ہوتی یعنی ان کی موجودگی تباہی کا پیش خیمہ ہو گی۔ ایسی باتوں سے قومی یکجہتی کو فروغ نہ ہوتا اور اس سے بنگالیوں کے دلوں میں پنجابیوں کے لئے محبت تو پیدا نہ ہوتی۔ ایک آئینی حکومت کے سربراہ کو غیر جمہوری انداز سے برطرف کر دینے پر غلام محمد کو محافظ ملت کا خطاب دیا گیا۔ پھر پنجابی پبلک نے اور کراچی میں اردو بولنے والوں نے ان کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

پنجاب کے متوسط طبقے کے لوگوں اور دانشوروں نے افسر شاہی اور جاگیرداروں کو ان کی غیر جمہوری سرگرمیوں سے نہیں روکا۔ انہوں نے کراچی میں اقامت اختیار کرنے والے اردوداں مہاجروں کے ساتھ مل کر غیر جمہوری طاقتوں کی حمایت کی، بیشتر اس طرح کہ ان کے خلاف لب کشائی نہیں کی حالانکہ وہ ان اعلیٰ عہدیداروں کو غیر جمہوری روش اختیار کرنے سے باز رکھ سکتے تھے کیونکہ زیادہ تر اعلیٰ عہدیدار پنجابی یا اردو بولنے والے

تھے۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ پنجابی متوسط طبقے نے بظاہر نتائج سے بے پرواہ ہو کر صوبہ پرستی میں مدد دی۔ مثال کے طور پر عبدالرب نشتر کو پنجاب کا گورنر اس لئے مقرر کیا گیا تھا تاکہ وہ ناپختہ کار جاگیردار سیاستدانوں کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کو دور کریں گے لیکن اس تقرر کی مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ نشتر پنجابی نہیں تھے حالانکہ وہ اس کام کے لئے بہترین مسلم لیگی لیڈر تھے۔ نوائے وقت کے حمید نظامی نے ان کی مخالفت کی اور پاکستان ٹائمز نے بھی اسے ناپسند کیا جس کے ایڈیٹر فیض احمد فیض تھے جنہیں بائیں بازو کی جانب ان کے جھکاؤ کی بنا پر لینن پرائز دیا گیا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ نسبتاً کم معروف سیاستدان محمد علی بوگرہ نے جسے ناظم الدین کی جگہ منتخب کیا گیا تھا مرکزی اسمبلی میں ایک قانون کا مسودہ پیش کرنا چاہا جس کی رو سے گورنر جنرل کے آمرانہ اختیارات کو آئین کی حد میں رکھا جا سکے۔ غلام محمد نے بوگرہ کو فوراً برطرف کر دیا۔ دوسری بار حکومت بوگرہ نے ہی بنائی لیکن اب ان کیا ختیارات میں تخفیف کر دی گئی تھی۔ اس برطرفی میں فوج کے سربراہ جنرل ایوب خاں، وزیر دفاع کے طور پر نمایاں نظر آتے ہیں تاہم چند سیاستدانوں نے غلام محمد کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس لئے غلام محمد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیں جو ملک کا سب سے بااختیار ادارہ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ جنرل صاحبان غلام محمد کے حامی تھے۔

غلام محمد اس فیصلے کو اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے سندھ چیف کورٹ میں چیلنج کیا۔ چیف کورٹ کے ایک بنچ نے جس کے سربراہ جسٹس جارج کانسٹنٹائن تھے، اسمبلی کی تنسیخ کے حکم کو غیر جمہوری قرار دیا۔ چیف جسٹس جو ایک انگریز تھا گورنر جنرل کے تحکمانہ فیصلے سے بالکل مرعوب نہیں ہوا۔ بہرطور غلام محمد نے وفاقی عدالت میں اپیل کی اور سندھ چیف کورٹ کا فیصلہ رد کر دیا گیا۔ افسر شاہی کی اس بگھی میں اب عدلیہ بھی سوار تھی اور ایک بڑے اتحاد میں شامل ہو چکی تھی۔ ان دنوں ایک افواہ سننے میں آئی کہ مذکورہ فیصلہ ایک معاہدے کا نتیجہ تھا جس میں طے پایا تھا کہ غلام محمد کے بعد ان کی جگہ جسٹس محمد منیر گورنر جنرل بنائے جائیں گے۔ وہ فیصلہ منیر نے ہی لکھا تھا اور دوسرے ججوں سے اس کی تائید حاصل کی گئی تھی۔ منیر سے کیا ہوا وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔ اس نہایت مشہور فیصلے کا منیر کی کتاب ''فرام جناح ٹو ضیاء'' (جناح سے ضیاء تک) مطبوعہ 1981ء میں کوئی ذکر نہیں۔

MashalBooks.org

بالآخر سب سے سینئر اعلیٰ افسر چودھری محمد علی نے آئین کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچانے کیلئے وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ انہی دنوں جب کراچی میں اس فیصلے کا اعلان کیا جا رہا تھا، جواہر لال نہرو دہلی میں ایک پبلک جلسے سے خطاب کر رہے تھے، ایک سرکاری افسر کو پاکستان کا وزیراعظم مقرر کئے جانے کی خبر اتنی اہم تھی کہ کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر نہرو تک پہنچا دی گئی۔ نہرو نے وہ پرزہ پڑھ لیا اور یہ کہتے ہوئے اپنی تقریر دوبارہ شروع کر دی کہ ''میں ہندوستان کے دفتریوں پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ کبھی بھی ہندوستان کے وزیراعظم بن نہیں سکتے۔'' سامعین اس فقرے کا جو اصل تقریر سے غیر متعلق تھا، مفہوم نہ سمجھ سکے اور حیران و پریشان ہوئے لیکن دوسرے دن کا اخبار پڑھنے کے بعد اس فقرے کا صحیح مفہوم ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

منیر کے فیصلے نے بالآخر میں منتخب نمائندوں کی بالادستی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔ اب قوم کی تقدیر، افسر شاہی اور اس کے معاون فوجی جرنیلوں کو جن کے پاس بندوق کی طاقت تھی اور عدلیہ کو جو انتہائی غیر جمہوری احکام کو بھی قانوناً جائز قرار دے سکتی تھی یعنی ان تینوں اداروں کے ارکان ثلاثہ کو منتقل ہو چکی تھی۔ جب ووٹ کی طاقت نہ رہی تو اس کے بعد بندوق کی طاقت ہی سب سے پر بالا تھی۔ چنانچہ اکتوبر 1958ء میں جرنیلوں نے بندوق کی نالی پر ریاست کا پورا اقتدار سنبھال لیا، افسر شاہی ان کی ذیلی معاون بن گئی اور عدلیہ کو انہوں نے بے مصرف قرار دے کر الگ ٹھکانے لگا دیا۔

جرنیلوں کی وہ بغاوت، ایک بہت بڑی غداری تھی اور کو (Coup) کے نام سے، ہوس اقتدار کے سوا کسی اور باوقار مقصد کے لئے نہ تھی۔ پاکستان میں 1958ء میں رونما ہونے والے اس واقعہ نے نوکر شاہی کو گروہی حکمرانی کے دور کا خاتمہ کر دیا۔ پاکستان کے عوام نے غلطی سے اس کو ایک جمہوری اقدام سمجھ لیا۔ جرنیلوں کی جانب سے اقتدار پر قبضے نے اس جمہوریت کا فریب دور کر دیا جس کا درحقیقت کوئی وجود نہیں تھا لیکن آئندہ نسلیں یہ سوال ضرور کریں گی کہ ''ایسا کیوں ہوا کہ اس ملک کے عوام جنہوں نے اسلام کے تحت زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا اور جو محض جمہوری طریقے سے ووٹ دے کر اس ملک کے قیام کا باعث ہوئے پھر کبھی نہ تو جمہوریت سے ہمکنار ہوئے اور نہ اسلام کے سماجی نظام سے بہرہ مند ہو سکے؟'' آنے والی نسلوں کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی مسلم لیگ

MashalBooks.org

کی قیادت نے اسلام کا نام سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔

ایک جمے جمائے جمہوری ملک کو چلانے اور جمہوری خطوط پر ایک نیا ملک قائم کرنے اور اسے چلانے میں بہت بڑا فرق ہے۔ کسی پرانے جمہوری ملک کا ایک جمہوری کلچر ہوتا ہے۔ اس میں جمہوری روایات موجود ہوتی ہیں، پھر اس ملک کے انتظامات چلانے میں جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں، ان کا پہلے سے علم ہوتا ہے اور ان کے حل بھی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک نئے ملک میں ان روایات کی بھی بنیاد رکھنی ہوتی ہے اور مشکلات کا علم بعد میں تجربے سے ہی ہوتا ہے اور ان کا حل بھی اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ جمہوری کلچر بنانا اور اسے مستحکم کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو مسلم لیگ تھی جو حکومت میں آئی تھی اور اس کے لئے قیادت کی ضرورت تھی جو ایک سیاسی عمل سے گزر کر آتی ہے، اس کے ساتھ ہی ایک پرسکون سیاسی ماحول درکار ہوتا ہے، ایسا ماحول جو تلخیوں اور عداوتوں سے پاک ہو۔ مسلم لیگ اس امر کی اہمیت کو سمجھ ہی نہ سکی کہ یونینسٹ مسلم لیگ میں کیوں شامل ہوئے۔ ان کا مقصد سماجی اصلاح کی لڑائی کو کمزور کرنا تھا اور جاگیرداروں کے سیاسی اقتدار کو مستحکم بنانا تھا۔ اس سے مسلم لیگ مزید کمزور ہوگئی۔

سیاست وہ کھیل ہے جس میں کسی مقصد کے لئے جدوجہد اور کاوش کی جاتی ہے چونکہ وہ بیشتر مسلمان لیڈر جنہوں نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی بڑے سیاستدان تھے اور وسیع سیاسی تجربہ اور مہارت رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے 3 جون 1947ء کے بعد پاکستان کے ساتھ مفاہمت کر لی۔ اس کے شواہد میرے ذاتی علم میں ہیں۔ ابوالکلام آزاد جو ہندوستان میں تھے انہوں نے بھی پاکستان کے استحکام اور خوشحالی کے لئے دعا کی تھی۔ میرے ایک قریبی عزیز دہلی میں تھے۔ انہوں نے 15 اگست 1947ء کو آزادی کا جشن دیکھا۔ وہ سر سلطان احمد کے یہاں مقیم تھے جو ایک پرانے سیاستدان اور 1946ء میں بننے والی عبوری حکومت ہند سے پہلے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن رہ چکے تھے۔ وائسرائے کی کونسل کے رکن کا عہدہ ایک وزیر کے برابر ہوتا تھا۔ سرکاری ضیافت سے واپسی پر سلطان نے یہ واقعہ میرے اس قریبی عزیز کو سنایا ''مولانا آزاد مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے سلطان تم نے اور میں نے پاکستان کی مخالفت کی کیونکہ ہمارے خیال میں وہ تجویز ہندوستانی مسلمانوں کے بہترین مفاد میں نہیں تھی۔ مسلمانوں نے ہمارے خیال کو

رد کر دیا اب پاکستان کی ایک حقیقت ہے۔ اب یہ مسلمانوں کی عزت کا معاملہ ہے، ہمیں پاکستان کے استحکام اور اس کی خوشحالی کے لئے دعا کرنی چاہئے۔'' ایسی ہی مصدقہ شہادتیں جمعیت العمائے ہند کے دوسرے لیڈروں، قوم پرست مسلمانوں اور کانگریسی مسلمانوں کے سلسلے میں موجود ہیں اور ان میں مولانا حسین احمد مدنی بھی شامل تھے، جنہوں نے لیگ کی گالیاں اور جھڑکیاں برداشت کی تھیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت دوسروں پر ہمیشہ شک کرتی رہی اور مفاہمت کا ایک موقع ضائع کر دیا حالانکہ اس سے پاکستان کو بہت فائدہ پہنچتا۔ ایسا نہ کر کے اس نے پاکستان کو کمزور کیا۔ ایسی ہی ایک دوسری مثال میں نے ایک نہایت مصدقہ ذریعے سے سنی اگرچہ ذاتی طور پر میں اس کی تصدیق نہیں کروں گا۔ صوفی نذیر احمد کشمیری ایک روحانی شخصیت تھے۔ انہیں پاکستان سے بڑی محبت تھی، اگرچہ انہوں نے دہلی میں اقامت اختیار کی تھی اور مولانا آزاد کے بڑے مداح تھے۔ 1950ء کے عشرے کے اوائل میں جن دنوں مولانا غلام رسول مہر دہلی گئے ہوئے تھے، مشرقی پاکستان میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ مہر آزاد کے یہاں مقیم تھے۔ دوقومی نظریے سے گہری وابستگی کے باوجود، مولانا آزاد کے ساتھ مہر کی شگفتگی برقرار رہی۔ جب فسادات خطرناک حد تک بڑھ گئے تو آزاد کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔ انہوں نے مہر سے کہا ''میں کلکتے میں رہ چکا ہوں اور بنگالیوں کو جانتا ہوں، انہیں اپنی زبان کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی ہے۔ بنگالی زبان کے لئے وہ اپنی جانیں دے دیں گے۔ تم پاکستان واپس جاؤ اور حکمرانوں سے کہو کہ بنگالی کو ایک قومی زبان کے طور پر برقرار رکھیں۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو پاکستان کو نقصان ہوگا۔ ایک مضبوط پاکستان کی موجودگی مسلمانوں کی عزت کا معاملہ ہے۔ پاکستان کو مضبوط اور متحد رکھنے کے مقابلے میں اردو زبان کی بالادستی ایک کمتر اہمیت کا معاملہ ہے۔''

مسلم لیگ کی سیاسی حیثیت اس وقت اور بھی کمزور ہوگئی جب سیاسی قیادت نے سیاستدانوں کی نااہلی کا ازالہ کرنے کے لئے انتہائی حساس اور اہم وزارتوں میں افسر شاہی کی خدمات حاصل کرنا شروع کیں۔ صاف ظاہر تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت نے ایک آزاد ملک میں سیاستدانوں کے کردار کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک لیڈر کو یہ علم ہونا چاہئے کہ عوام کیا چاہتے ہیں اور اسی حساب سے اپنی پالیسی مرتب کرنی چاہئے۔ سرکاری

MashalBooks.org

عہدیداروں کا فرض تو اس پالیسی کا نفاذ ہوتا ہے۔ ان کی یہ تربیت نہیں ہوتی کہ پالیسی بنائیں کیونکہ انہیں عوام کی خواہشات کا علم نہیں ہوتا مسلم لیگ نے نہ صرف یہ کہ ان مواقع پر افسر شاہی کو استعمال کیا، جہاں سیاسی فراست درکار تھی بلکہ انہوں نے اپنے ناجائز سیاسی مقاصد کی خاطر نچلے درجے کے حکام کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی۔ پختہ کار صحافی سلیم علوی ایک ایسا ہی چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں۔

''اکتوبر 1947ء میں دہلی سے لاہور آنے کے بعد مجھے حکومت مغربی پنجاب کے محکمہ اطلاعات عامہ میں انفارمیشن افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ میرے سپرد پہلی ذمہ داری یہ کی گئی کہ ایک وزیر سردار شوکت حیات خان کے ہمراہ لائل پور (حال فیصل آباد) جاؤں جہاں وہ مغربی پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے۔ لائل پور، جڑانوالہ ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریتی آبادی کا علاقہ تھا، لیکن پاکستانی پنجاب میں اس بنا پر شامل کر دیا گیا تھا کہ وہ پنجاب کے ہندو سکھ اکثریتی علاقے سے متصل نہیں تھا۔ مرحوم آغا عبدالحمید لائل پور کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ جن دنوں پورے پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک رہے تھے، انہوں نے اپنے علاقے میں امن برقرار رکھا۔ اس بنا پر مسلم لیگ کے شہ زور عناصر ان سے ناخوش تھے چنانچہ سردار صاحب نے وہاں کے لوگوں کی حمایت اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آغا عبدالحمید کو سر عام جھڑکیاں دیں اور ان کی توہین کی۔ آغا صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ جب لیاقت علی خاں کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے آغا عبدالحمید سے درخواست کی کہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ اس کے ساتھ ہی وزیراعظم نے انہیں کراچی بلا کر اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کر دیا۔''

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ تو اقتصادی ترقی کی کوئی پالیسی مرتب کی گئی اور نہ کوئی اور قومی حکمت عملی وضع کی گئی۔ سارا کاروبار وقتی کارگزاری کے اصول کی بنیاد پر اس طرح چلتا رہا، جیسے ایک صدی قبل نو آبادیاتی حاکموں نے اسے چلایا تھا۔ افسر شاہی کو تربیت یہ دی گئی تھی کہ ملک کا انتظام غیر ملکی اقتدار کے بہترین مفاد میں چلائے، نہ کہ عوام کے مفاد میں۔ چنانچہ افسر شاہی کو کھلی چھٹی مل گئی کہ قوم کے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھے، پھر انہوں نے قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کو بہترین طور پر خود اعلیٰ حکام نے بیان کیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب ایک ایسے ہی افسر تھے۔ ان کے ساتھ کے بہت سے حکام

ان کی عزت کرتے تھے۔ بہت سے سربراہان حکومت کے مشیروں میں ان کا منصب سب سے بلند ہوتا تھا۔ اپنے کارناموں کا تذکرہ انہوں نے خودنوشت میں کیا ہے۔ آزادی کے موقع پر شہاب حکومت ہند کے تحت اڑیسہ کے محکمہ داخلہ میں ڈپٹی سیکرٹری تھے وہ سول سروس کے ان اعلیٰ افسروں میں شامل تھے جنہوں نے پاکستان میں ملازمت کا انتخاب کیا تھا یہاں انہیں وزارت تجارت کے انڈر سیکرٹری کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ ان کا بیان درج ذیل ہے:

''وزارت تجارت، صنعت اور ورکس چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی آئی چندریگر وزیر، مسٹر میکفارکر سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسنی جائنٹ سیکرٹری تھے۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کسے کہتے ہیں اور برآمدات و درآمدات کس چڑیا کا نام ہے۔ بند روڈ پر ایک کباڑیے کی دکان سے میں نے ایک انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کام کرنے کے لئے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا تھا، پہلے روز اس میں فقط ایک میز تھا۔ دوسرے روز ایک کرسی بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کرسیاں اور آ گئیں۔ فائلوں کے لئے کاغذ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اس روز وہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔''

ان دنوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ بھارت سے ان دونوں اشیاء کی درآمدی بند ہو گئی۔ چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گڑ کا استعمال شروع کر دیا اور کراچی میں جا بجا طرح طرح کا گڑ ریڑھیوں پر بکنے لگا لیکن کوئلے کی کمی سخت باعث تشویش تھی۔ اس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے پر چلتی تھیں اور اس کی قلت سے رسل و رسائل کے سارے نظام کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے چندریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افسروں کی ایک ہنگامی

میٹنگ منعقد کی۔ میں سیکنڈ ہینڈ فلسپ اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا اس لئے میری چند تجاویز سہولیات سے منظور ہوگئیں۔ اس سے میرے وزیر سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری کو غالباً یہ خوش فہمی ہوگئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے، لیکن مجھے علم تھا کہ میں اندر سے کھوکھلا ہوں۔'' (16)

اس بیان سے ان سوالوں پر خاصی روشنی پڑتی ہے کہ پالیسیاں کون لوگ بناتے تھے اور انہیں کس قدر نافذ کیا جاتا تھا۔ آئی آئی چندریگر کوئی جاگیردار نہیں تھے۔ ان کا تعلق بمبئی کی ایک تجارت پیشہ برادری سے تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ پہلے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک وزیر جس کا تعلق کاروباری برادری سے ہوا اور جو بمبئی میں وکالت کرتا رہا ہو وہ ایک کمتر درجے کے افسر کے رحم و کرم پر تھا تاکہ وہ افسر ایک نئے ملک کی درآمدی اور برآمدی پالیسی اس سے بنوائے۔ بمبئی اس زمانے میں اور آزادی کے بعد بھی ہندوستان کا تجارتی اور مالی دارالحکومت تھا۔ اب ذرا اس تاجر کی تقدیر کے بارے میں سوچئے جو اپنے کاروباری مقدمے میں پیروی کے لئے ایک ایسا آدمی منتخب کر لیتا ہے جسے درآمد و برآمد کا کچھ بھی پتہ نہیں۔ پوری قوم ایک ایسے ہی وکیل کے آسرے پر تھی اور چندریگر کو ایک سرکردہ مسلمان لیڈر سمجھا جاتا تھا اور اس سیکرٹری کی اہلیت کے بارے میں کوئی کیا کہے جو وزارت تجارت کے ایک ماتحت افسر اور جوائنٹ سیکرٹری سے متاثر ہو جائے جس کی استعداد پرانی انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور فلپس اٹلس کے مطالعہ تک محدود ہو۔ اس کا بہترین نتیجہ خود قدرت اللہ شہاب سے اخذ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''اپنی ہمہ دانی کا بھرم رکھنے کے لئے میں نے بازار سے تجارتی معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور محکمانہ میٹنگوں میں زبانی کلامی حد تک دخل در معقولات دینے کی شدبد حاصل کر لی۔'' (16)

قدرت اللہ شہاب نے ان دو فقروں میں جس صداقت کا بیان کیا ہے، وہ پوری افسر شاہی پر صادق آتی تھی اور اس وقت سے اب تک اس کا اطلاق پوری حکومت پاکستان پر ہوتا ہے۔

MashalBooks.org

افسر شاہی کس طریقے سے کام کرتی تھی، اس کی ایک اور شہادت چودھری محمد علی نے فراہم کی ہے۔ 1947ء میں وہ سب سے سینئر اعلیٰ افسر تھے۔ یہ روداد ایک اور اعلیٰ افسر غلام محمد کے متعلق ہے، جنہیں آزادی سے ذرا ہی دیر پہلے پاکستان کا وزیر خزانہ بنایا گیا تھا۔ اپنی کتاب ظہور پاکستان (Emergence Of Pakistan) میں چودھری محمد علی نے بڑے فخر کے ساتھ غلام محمد کی کارکردگی بیان کی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ وزیر خزانہ کے سامنے جب بھی کوئی تجویز کسی مد میں رقم کی منظوری کے لئے پیش کی جاتی، وہ فوراً اسے رد کر دیتے۔ جب وہی تجویز بار بار پیش کی جاتی تو غلام محمد اس کی نصف رقم کی منظوری دے دیتے۔ چودھری محمد علی رائے میں مالی معاملات میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کا یہی بہترین طریقہ تھا۔ اب اگر فرض کر لیا جائے کہ ایک وبائی مرض کے انسدادی ٹیکے کیلئے دس لاکھ ڈالر درکار ہیں اور غلام محمد کے مقررہ طریقے کے مطابق پانچ لاکھ ڈالر منظور کئے جاتے ہیں، وہ بھی مسلسل تقاضے کے بعد۔ پھر اس ٹیکے کی درآمد میں بھی کئی ماہ لگ جائیں گے اور وہ درآمد صرف نصف آبادی کے لئے ہو گی تو اتنے مہینوں کی تاخیر کے بعد ملک کی باقی آبادی کا کیا حال ہو گا اور ان خوش نصیبوں پر کیا گزرے گی جو وزیر خزانہ کی فیاضیانہ پیشکش سے فیض یاب ہوتے ہوں گے۔ ایک سو ڈاکٹروں یا دو درجن سکولوں کے بارے میں اگر کوئی تجویز آئی اور ان کی صرف آدھی تعداد کی منظوری ہوئی تو پھر یہی ہو گا کہ آدھی آبادی کے لئے کوئی ڈاکٹر نہیں ہو گا اور بچوں کی صرف نصف تعداد کے لئے سکول موجود ہوں گے۔

لیکن شہرہ آفاق سائنسدانوں اور پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کی گواہی سے زیادہ مصدقہ کوئی اور گواہی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے بتایا کہ جب ہم سائنسدانوں کے بارے میں افسر شاہی کے تحقیر آمیز رویے کی بات کرتے ہیں تو مجھے پلاننگ کمیشن کے ایک سابق چیئرمین یاد آ جاتے ہیں جب میں نے ان سے کہا کہ سائنسدانوں کو رہائش کے لئے مکان چاہئیں تو انہوں نے جواب دیا، کراچی میں ہر شخص فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔ سائنسدان یہ کیوں نہیں کرتے؟ اور جب میں نے یہ مشورہ دیا کہ جن صنعتوں کی بنیاد سائنس پر ہے، ان کی منصوبہ بندی میں سائنسدانوں سے بھی پوچھ لینا چاہئے تو انہوں نے کہا کہ میں سائنسدانوں سے مشورہ کیوں کروں؟ میں اپنے خانساماں سے تو نہیں پوچھتا کہ مجھے اپنا گھر بار کس طرح چلانا چاہئے؟ [17] اور یہ گفتگو 1950ء کے

عشرے میں ہوئی تھی، جن دنوں پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا۔

قدرت اللہ شہاب نے قومی زندگی کے ایک اور پہلو یعنی قومی یکجہتی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کیفیت کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

''میرے اس سطحی قسم کے علم سے چندریگر صاحب خاص طور پر مرعوب تھے اور اپنی بہ تسی میٹنگوں میں مجھے اکثر اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز وزیر خزانہ غلام محمد صاحب کے کمرے میں میٹنگ تھی۔ کراچی میں دفتری اور رہائشی ضروریات کے لئے جو نئی عمارتیں اور کوارٹر تعمیر ہو رہے تھے، ان کے لئے سینیٹری کا سامان درآمد کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میٹنگ میں چار وزیر اور کچھ افسر شریک تھے۔ وزیروں میں فضل الرحمٰن بھی موجود تھے، جن کے پاس امور داخلہ اطلاعات اور تعلیم کا چارج تھا۔

کچھ بحث کے بعد سینیٹری کے سامان کا کوٹہ طے ہو گیا تو وزیر تعلیم فضل الرحمٰن نے دبے الفاظ میں تجویز پیش کی کہ اگر اس امپورٹ کا کچھ حصہ ڈھاکہ کے لئے بھی مخصوص کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

اس تجویز پر بڑی ہنسی اڑی۔ کسی نے کہا کہ ڈھاکہ میں کوئی خاص تعمیری کام شروع نہیں ہوا۔ اس لئے وہاں پر سینیٹری سامان بھیجنے کی کوئی تک نہیں۔ کسی نے کہا کہ جو سامان ڈھاکہ جائے گا، وہ لازمی طور پر سمگل ہو کر کلکتہ پہنچے گا ایک صاحب نے مذاق ہی مذاق میں یہ پھبتی اڑائی کہ بنگالی لوگ تو کیلے کی گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں۔ وہ ابھی سے کموڈ اور واش بیسن لے کر کیا کریں گے۔

فضل الرحمٰن مسکرائے نہ بگڑے۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی سے انہوں نے ایک بات پر زور دے کر کہا کہ زیادہ نہیں تو اس سامان کا ایک قلیل علامتی حصہ ڈھاکہ کے لئے ضرور مخصوص کیا جائے کیونکہ نفسیاتی طور پر یہ مناسب اقدام ہو گا۔ کچھ مزید بحث و مباحثہ اور طنز و مزاح کے بعد فضل الرحمٰن صاحب کی بات مان لی گئی اور ڈھاکہ کے لئے سینیٹری سامان کا کچھ حصہ مخصوص ہو گیا۔ لیکن ایسی بدمزگی کے ساتھ جس طرح دودھ میں مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں لاشعوری طور پر بنگلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔

یہ رویہ، یعنی بنگالیوں کو کمتر قیاس کرنا اور ان کو حقارت سے دیکھنا، لاعلمی کی بنا پر

تھا یا اپنی طرف سے بیجا تفاخر کا اظہار تھا لیکن اب تو میں یہ کہوں گا کہ یہ تمام تر مجرمانہ تھا۔ جب امجد علی وزیر خزانہ مقرر ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ پٹ سن کی برآمد سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ نہایت کثیر تھا بلکہ پورے مغربی پاکستان کی ساری اجناس سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ اس کا علم انہیں اس وقت ہوا جب وہ بجٹ تقریر کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی عجلت سے اپنی بجٹ تقریر کے ٹائپ شدہ مسودے میں تبدیلیاں کیں اور پٹ سن کی آمدنی کم کر دی اور اس کوتاہی پر انہوں نے بجٹ بنانے والوں پر لعنت بھیجی کہ اس طرح بنگالیوں کو خواہ مخواہ مغربی پاکستان کو مطعون کرنے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔'' امجد علی لاہور کے ایک متمول تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کہانی مجھے اس شخص نے سنائی جو وزیر خزانہ کا افسر تعلقات عامہ تھا اور اس موقع پر موجود تھا۔ بعد میں اس نے ترقی کی اور اسٹیٹ بینک کا ڈائریکٹر مقرر ہوا۔

اس امر کا وافر تحریری مواد موجود ہے کہ مشرقی بنگال میں متعین غیر بنگالی افسران اعلیٰ بنگالیوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتے تھے اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز جتنا آزادی سے پہلے ''گورا صاحب'' کرتا تھا۔

افسران اعلیٰ کی اشرافیہ نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی اقتدار کے اس نظام میں ایک اہم عنصر کی حیثیت اختیار کر لی تھی، بتدریج اس کا انداز زیادہ تحکمانہ ہوتا گیا اور اکثر سیاسی اشرافیہ کے مقابلے میں زیادہ مقتدر اور بااختیار ہو گیا۔ ایک بڑی حقیقت جس نے اس صورت حالات میں اضافہ کیا یہ تھی کہ پاکستان کی تاریخ کے بالکل ابتدائی مرحلے میں کچھ پرانے افسران اعلیٰ، گورنر جنرل اور وزیراعظم کے عہدوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مخصوص افسر شاہی کی روایات، انہی کا زاویہ نظر اور رویہ ساتھ لائے چنانچہ اس کی ہمدردیاں بھی سیاسی اداروں کے بجائے افسر شاہی کے ساتھ تھیں۔ 1969,1958ء اور 1977ء کی فوجی بغاوتوں نے سول افسر شاہی اقتدار اور دبدبے میں مزید اضافہ کیا۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے بیشتر زمانوں میں اعلیٰ افسر شاہی نے ہی ملک پر حکمرانی کی۔ درحقیقت پاکستان کو افسر شاہی کی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے۔

متوسط طبقے کے خواندہ لوگوں نے، دانشوروں اور عالموں نے اس عوام دشمن سیاست کے خاتمے کی خاطر عوام کی رہنمائی کے لئے کیا کیا؟ یہ ایک جائز سوال ہے کیونکہ

MashalBooks.org

ایک جمہوریت میں خواندہ افراد، دانشور اور ارباب علم عوام کو سیاسی بیداری اور سماجی شعور مہیا کرتے ہیں، جو ایسے عناصر کو ایسے اقتدار سے نکال باہر کرتے ہیں جو اقتدار میں آنے سے پہلے کئے ہوئے انتخابی وعدوں پر پورے نہیں اترتے۔ مسلم لیگ کی قیادت آزادی کے گیارہ سال بعد ایک مرتبہ بھی انتخابات نہ کرا سکی اور ناکام ہوگئی۔ نتیجہ یہ کہ ایک آمر نے ملک پر قبضہ کر لیا اور اسے لوگوں کی منظوری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ تو انتخابات کا طریقہ ہے، جس میں عوام کو یہ آگاہی ملتی ہے کہ انہیں صحیح پالیسیوں کی حمایت میں رائے دینی چاہئے۔ 1945ء کے بعد پہلے عام انتخابات 1971ء میں ہوئے یعنی ایک چوتھائی صدی بعد۔ مسلم لیگ کی قیادت اس کے باوجود عام لوگوں کو ایک فرضی دشمن کے بھوت سے ڈراتی رہی۔ ان غداروں کے وجود سے، حالانکہ وہی ان کے حقیقی معاون تھے، جبکہ اصل دشمن سامنے تھا۔ یعنی افلاس، جہل، ناخواندگی، خرابی صحت، توہمات، غیر اسلامی اور نامہذب سماجی رسوم و رواج، ذات پات اور مسلک کے پیدا کئے ہوئے تفرقے، قبائلی تقسیم اور ان کے سوا جاگیردارانہ نظام۔

1958ء میں اقتدار پر جنرل کے غاصبانہ قبضے سے پہلے، جو سیاسی قیادت کی نااہلی کے سبب سے تھی، افسر شاہی مضبوط سیاسی استحکام کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے افسر شاہی ریاستی اقتدار کو اور اس کی حقیقی طاقت کو استعمال کر رہی تھی لیکن بدترین صورت اس وقت پیدا ہوئی جب اس میں عدلیہ بھی شامل ہوگئی اور منیر نے آئین ساز اسمبلی کی غیر جمہوری تنسیخ کو جائز قرار دے دیا۔ عدلیہ ملک کا واحدہ ادارہ تھا جس پر عام لوگ اعتبار کرتے تھے چنانچہ اب لوگ اگر ساری عدلیہ نہیں تو اس کے بعض ججوں کی دیانت پر شک کرنے لگے اس رویے نے قوم کو لاتعلق بلکہ حالات سے بیزار کر دیا۔

جنرل صاحبان ایسے سادہ لوگ نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ افسر شاہی اس وقت تک بے خوفی سے عمل نہیں کر سکے گی جب تک ان کی بندوق ساتھ نہ ہوگی۔ جب 1958ء میں عام انتخابات ہونے لگے اور وہ آزادی کے بعد پہلے عام انتخابات ہوتے، تو برسر اقتدار لوگ یعنی اعلیٰ افسر، جنرل اور جاگیردار بجا طور پر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ اس مرتبہ جمہوریت کی طرف سے حقیقی خطرہ محسوس کیا جانے لگا، جسے ٹالنے کے لئے اقتدار پر غاصبانہ

MashalBooks.org

قبضے کیس وا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب عام لوگ انتخابات کے ذریعے حکومت میں خود تبدیلی لا سکیں اور اختیارات کے استعمال پر قادر ہوں تو کسی غیر جمہوری طاقت کے لئے اقتدار پر قبضہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی تباہ کن صورتحال سے بچنے کے لئے افسر شاہی کے سربراہ سکندر مرزا اور جرنیلوں کے سربراہ ایوب خاں نے 8 اکتوبر 1958ء کو مراشل لاء لگا دیا۔ تمام سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دیں اور ساری سیاسی پارٹیوں کو منسوخ کر دیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب جرنیلوں نے جو حقیقی معنوں میں طاقت کو استعمال کرتے آئے تھے افسر شاہی سے کہا ''بس، بہت ہو چکی، اب باجہ ہم بجائیں گے۔'' چنانچہ 23 اکتوبر کو جرنیلوں کے ہاتھوں سکندر مرزا کی برطرفی کے بعد افسر شاہی کو ثانوی حیثیت دیدی گئی۔

اب یہ ہوا کہ جنرل صاحبان گھوڑے پر زین کس کر سوار ہو گئے اور افسران اعلیٰ ان کے خادم اور معاون ہو گئے۔ عام لوگوں کی ہمدردیاں جیتنے کے لئے اس موقع پر غذائی اجناس اور اشیائے صرف کی قیمتیں ایک حکم کے ذریعے خاصی کم کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سیاستدانوں کے خلاف پراپیگنڈے کی مہم شروع کر دی گئی۔ اشیاء کی قیمتوں میں کمی مصنوعی انداز سے کی گئی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی اقتصادی فیصلے نہ تھے تاہم عام لوگوں نے سیاستدانوں کی حکومت کے مقابلے میں مارشل لاء کے ''فیوض کو'' دیکھ لیا تھا۔ جرنیلوں کو بھی اندازہ ہوا کہ چند اعلیٰ افسر جو دیانتدار اور باصلاحیت ہیں ان کے لئے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کو بددیانت قرار دے کر حکومت سے نکالا گیا۔ اس طرح افسر شاہی میں ماضی سے ملی ہوئی تھوڑی بہت دیانت اور اہلیت جو باقی بچ رہی تھی وہ بھی رخصت ہو گئی۔

پاکستان کو فوج اور فوجی افسر انگریزی راج سے ورثے میں ملے تھے، برطانیہ کے مقابلے میں ہندوستان میں افسروں کی بھرتی کے مختلف معیار تھے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی ہمیشہ انڈین سول سروس یا صوبائی سول سروس اور دیگر انڈین اور صوبائی ملازمتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ مقابلہ کا امتحان بہت سخت ہوتا تھا اور اس میں اعلیٰ ترین علی استعداد کا مالک ہی کامیابی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ فوجی ملازمت میں جانے والے افراد اعلیٰ تعلیمی معیار اور دماغی صلاحیت کی کوئی نمایاں مثال نہیں ہوتے تھے۔ وہاں بھرتی کے لئے مردانہ ڈیل ڈول، اچھی صحت اور خاندانی پس منظر کو دیکھتے تھے، یہی معیار پاکستان میں بھی برقرار رکھا گیا، سوائے اس تبدیلی کے کہ ''اچھے خاندانی پس منظر'' کی جگہ ''صحیح تعلقات'' نے لے لی۔ اس طرح

MashalBooks.org

پاکستان کو ملنے والے جرنیلوں نے اپنے منصب کی ابتداء کمتر حیثیت سے کی۔ ان کے مقابلے میں ہندوستان کے جنرل ان سے کچھ زیادہ برتر نہیں تھے لیکن ہندوستان کی قیادت نے انہیں اقتدار سے میلوں دور رکھا تھا تاکہ سیاست میں ٹانگ نہ اڑائیں اور وہ کام نہ کریں جسے کرنے کے وہ اہل نہیں۔

پاکستان میں زیادہ تر جنرل پنجابی تھے۔ جمہوریت کے نہ ہونے کے باعث وہ پنجابی ہی رہے، خاص طور پر اس لئے کہ صوبہ پرستی کے جذبات ابھارنا سود مند تھا۔ 1977ء کے پہلے چھ مہینوں میں لاہور سمیت چند شہروں میں مارشل لاء نافذ کیا گیا تھا۔ لاہور میں مبینہ طور پر ایک غیر قانونی اور بے قابو مجمع پر گولی چلائی گئی جس سے تین افراد ہلاک ہو گئے۔ اس وقت تین بریگیڈیئر صاحبان نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ وہ اپنے ہی لوگوں پر گولیاں نہیں چلائیں گے لیکن جب بنگالیوں کا قتل عام ہوا اور بلوچ، سندھی اور مہاجر مارے گئے تو کسی اعلیٰ افسر نے احتجاج تک نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ امر محض اتفاقی ہو، لیکن ایسا بھی ہو تو تاریخ اسے علاقائیت اور جانبداری پر مبنی قرار دے گی۔ ایسے ہی رویوں کی بنا پر پاکستان کی قوم میں تفرقہ پیدا ہوا۔

پاکستانی جنرل خاصے چالاک تھے کہ انہوں نے جاگیرداروں کی سیاسی قیادت کی نااہلی کو پہچان لیا تھا۔ جنرل صاحبان خود بھی نااہل تھے لیکن اس نااہلی کی پردہ پوشی ان کی بندوق سے ہو جاتی تھی، جو ان کے اندر تحریک پیدا کرتی۔ سازش کرنے کے سلسلے میں ان کی پہلی کوشش وہ تھی جسے بعد میں راولپنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا اور جو کچھ نتیجہ خیز ہوئی اس سے ان کے اندر اعتماد پیدا ہوا۔ ورنہ وہ عملی سیاست میں کیسے چوری سے گھس جاتے اور اس کے لئے افسر شاہی کی مدد کرتے اور یوں ناظم الدین کی برطرفی عمل میں آتی۔ سیاست میں جرنیلوں کا دوسرا قدم زیادہ کھل کر سامنے آیا، جب فوج کا سربراہ بوگرہ کی حکومت میں وزیر بن گیا۔ قوم کے خلاف بدعہدی کے ضمن میں جرنیلوں کا یہ پہلا قدم تھا۔ مسلح فوج کا کوئی افسر اپنی وردی میں رہتے ہوئے سیاسی عہدہ نہیں لے سکتا۔ مسلح افواج کے افسروں پر سیاست میں داخلہ ممنوع نہیں، بس شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے وہ اپنا کمیشن واپس کر دیں۔ اس کے باوجود کہ جنرل نے وزیر دفاع کے طور پر اپنا سیاسی عہدہ چھوڑ دیا لیکن ان کا خفیہ ہاتھ سیاست کی بساط پر اپنا کام کرتا رہا۔ بالآخر 1958ء میں انہوں نے

اس آئین کو منسوخ کر دیا جس کے تحفظ کا انہوں نے حلف اٹھایا تھا اور یوں بہت بڑی غداری کے مرتکب ہوئے۔'' پاکستان کی مسلح افواج کے اعلیٰ افسروں نے بڑی حد تک ایک روایتی مسلمان معاشرے کے اس رجحان کو اپنے لئے استعمال کیا کہ فوجی طاقت کی حیثیت، قومی وقار، اس کی طاقت اور ترقی کے مساوی ہوتی ہے۔ جس طرح مسلم عوام نے جناح کو خلیفہ وقت کے روپ میں دیکھا۔ اسی طرح انہیں فوجی وردی میں ہر افسر گویا صلاح الدین ایوبی کا پرتو نظر آیا۔ ایوب خاں کا دراز اور توانا وجود ان لوگوں کے اندر بھی اعتماد پیدا کر دیتا تھا جو حکومت سے ویسے تو مایوس ہو چکے تھے۔ (20)

ہندوستان کے مسلمان معاشرے اور اس کے جانشین پاکستانی معاشرے کی تربیت، ماضی بعید کی مسلمان فوجوں کی فتوحات کی بنیاد پر ہوئی تھی، یہ تربیت اسلام کی روحانی، اخلاقی اور سماجی اقدار اور بالغ نظری کی اساس پر نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے یہ نہیں سمجھا کہ اسلام کی فتح اس کی اعلیٰ اقدار کی سربلندی میں ہے۔ یہ سمجھے بغیر وہ سمسلمان فوجوں کی طاقت کو ہی اسلام کی رفعت سمجھنے لگے۔ برطانوی ہند کی فوج کا جو حصہ پاکستان کو ملا وہ مجاہد اور غازی کے وجود کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس کی بنیاد پرانی روایات پر تھیں جنہیں پاکستان کا خواب دیکھنے والے شاعر اقبال نے اس طرح روشن کر دکھایا تھا:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے رنگ خدائی
شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

ایک پاکستانی کے ذہن میں سپاہی کا جو تصور ہے، اقبال کے اشعار اس کی بہترین عکاسی کرتے ہیں، یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، حرکت و عمل کے جذبے سے بھرپور، ایک بے لوث سپاہی جس کا ایک ابدی مشن ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کی یہ کمزوری جو مسلح طاقت کے لئے ان کے دلوں میں موجود تھی، جرنیلوں نے نہایت چالاکی سے اس کا خوب استحصال کیا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ زبردست غداری کے مرتکب سب سے پہلے پاکستان کے جنرل نہیں تھے۔ پہلے غدار تو افسر شاہی کے اعلیٰ عہدیدار تھے لیکن اگر ان جرنیلوں نے

سنجیدگی کے ساتھ سماجی، اقتصادی اور سیاسی اصلاحات نافذ کی ہوتیں جس طرح اس زمانے میں جنوبی کوریا کے جرنیلوں نے کی تھیں، اگر انہوں نے جاگیرداری ختم کر دی ہوتی، عام تعلیم کے پروگرام پر عمل کیا ہوتا جس سے نوجوان پاکستانیوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے تحریک پیدا ہوتی، ان میں بصیرت اور تحقیق کا جذبہ ابھرتا، اگر انہوں نے صنعتکاری کو فروغ دیا ہوتا، سرمایہ کاری امنگ پیدا کی ہوتی، صنعتوں میں بہتری اور وسعت لاتے تو ان کی زبردست غداری کو فراموش بھی کیا جا سکتا تھا، اور وہ قوم کو ایک ایسا آئین دیتے جس میں تمام صوبوں اور نسلی و لسانی گروہوں کیلئے یقینی مساوات کی ضمانت موجود ہوتی تو اس وقت بھی ان کی غداری کو فراموش بھی کیا جا سکتا تھا، اور اگر وہ قوم کو ایک ایسا آئین دیتے جس میں تمام صوبوں اور نسلی و لسانی گروہوں کے لئے یقینی مساوات کی ضمانت موجود ہوتی تو اس وقت بھی ان کی غداری قابل معافی تھی، لیکن جرنیلوں نے اس کے قطعی برعکس کیا۔ سندھی ہاریوں سے چوری کی ہوئی زمینیں جرنیلوں نے آپس میں بانٹ لیں اور یوں جاگیرداری نظام کو مزید مستحکم کیا۔ تعلیم کے معیارات گر گئے اور ان پر نواب آف کالا باغ جیسے لوگوں کو متعین کیا گیا جنہوں نے پہلے سے موجود تعلیمی سرگرمیوں کے لئے بھی رقم دینا بند کر دی۔ صنعتوں کی بنیاد مانگے تانگے کی سرمایہ داری پر رکھی گئی جس میں سرمایہ یا تو ٹیکس گزاروں کی بچتوں سے آتا تھا یا بونس واؤچر کے ذریعے صارفین کی جیبوں سے چوری کیا جاتا تھا۔ جرنیلوں نے قوم سے جو بے اندازہ بے عہدی کی تھی ان ترکیبوں سے اس میں مزید اضافہ ہو گیا اور افسر شاہی کے ضمن میں انصاف کی بات تو یہ ہو گی کہ سیاسی گرفت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی دلیر ہو گئے اور وہ بھی سیاستدانوں کی نااہلی کے سبب سے ہوا۔

جرنیلوں نے 1965ء کی جنگ شروع کی اور لوگوں نے سوچا کہ وہ کشمیر جو 1948ء میں افسوسناک طور پر ان سے چھین لیا گیا تھا، واپس لے کر جرنیل اپنے نام کی لاج رکھ لیں گے، لیکن کشمیر بھی واپس نہیں ملا، اس میں بھی شکست ہوئی۔ کشمیر بدستور ہندوستان کے ہاتھ میں رہا۔ بہرطور جرنیلوں میں سے ایک نور خاں تھے، جنہوں نے جنگ کی اور اس حقیقت کو بڑی جرأت کے ساتھ تسلیم کیا۔ یہ جرأت بہت سے دوسرے جرنیلوں میں نہیں تھی۔ نور خاں اس جنگ میں پاکستانی فضائیہ کے کمانڈر انچیف تھے۔

جنگ کی صورت میں نور خاں کو پختہ یقین تھا کہ پاکستان اپنی فوجی تیاریوں کو

MashalBooks.org

دیکھتے ہوئے جنگ بندی کی خاطر سکیورٹی کونسل کی طرف بھاگے گا۔ وہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کے خلاف ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہندوستان کے ساتھ تین جنگوں میں پاکستان کی مسلح افواج خود اپنی توقع کے مطابق کارکردگی دکھانے میں ناکام رہ گئیں۔مزید یہ کہ ان کے خیال سے 1965ء کی جنگ پاکستان کو درپیش ہونے والی ہزیمتوں میں ایک سنگ میل کی طرح ہے۔ انہوں نے کہا کہ صدر ایوب نے پورے اعتماد سے جنگ شروع کی تھی لیکن ان کو دوسرے ہی دن اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم فوراً ہی جنگ بندی کا انتظار کرنے لگے۔

ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بریگیڈیئر اے آر صدیقی کی زیر صدارت شائع ہونے والا مجلّہ ڈیفنس جرنل اس بارے میں مصدقہ طور پر پاکستان میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسکے مارچ اپریل 1979ء کے شمارے میں ایئر مارشل نور خان کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں وہ صریح طور پر کہتے ہیں کہ ''بظاہر دو متصادم نظریات یعنی اسلام اور ہندو مت کے حوالے سے وہ جنگ ہماری کوئی مجبوری تھی، اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ جہاں تک اصل کارکردگی کا تعلق تھا۔نور خان نے بتایا کہ اعلیٰ سطح کا کوئی مشترکہ منصوبہ جنگ کی خاطر موجود نہ تھا اور یہ کہ ''ہم نے مقامی سطح کے آپریشنز کو ایک عام بڑی جنگ میں منتقل کر دینے کی حماقت کی اور اس طرح پہل کاری ہندوستان کو چلی گئی۔''(23)

1969ء میں اور بھی زیادہ غداری کی گئی اور مارشل لاء ایک بار پھر لگا دیا گیا۔ جرنیلوں نے آزادانہ انتخابات تو کرا دیئے اور اس کے لئے تاریخ انہیں معاف بھی کر دیتی بشرطیکہ وہ رائے عامہ کے فیصلے پر سرخم کر دیتے اور اقتدار منتخب جماعت یعنی عوامی لیگ کے سپرد کر دیتے۔ اس کے بجائے انہوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف بغاوت کر دی، حالانکہ اس اکثریتی آبادی سے ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ اس امر کا اعتراف تو مخالف بھی کرتے ہیں کہ پنجابی اور پختون بہت اچھے سپاہی ہیں۔ ان کی اہلیت کا اقرار تو انگریزوں نے بھی کیا تھا۔ اس بنا پر ایک اچھا سپاہی ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے اور بغاوت، ڈسپلن سے انحراف کی بدترین مثال ہے لیکن سپاہیوں کو نفسیاتی فریب کاری اور عیاری کے ذریعے مشرقی پاکستانیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ ایک جمہوریہ میں عوام ہی مقتدر ہوتے ہیں۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے عوام بھی مقتدر تھے۔

MashalBooks.org

یہ کام دو سطحوں پر ہوا ایک تو پورے مغربی پاکستان میں پنجاب اور کراچی میں خاص طور پر مشرقی پاکستانیوں کے خلاف ملک گیر پراپیگنڈہ کیا گیا، دوسری طرف سپاہیوں اور نوجوان افسروں کو نفسیاتی فریب میں مبتلا اور ان کے ذہنوں کو مسموم کیا گیا۔

مشرقی پاکستانیوں کے خلاف پراپیگنڈہ اور خاص طور پر اردو اخبارات میں جھوٹی خبروں کی اشاعت کے ذریعے یہ کہا گیا کہ ان کا میلان اسلام کی طرف کم ہے ان کی معاشرت، رسم و رواج اور تہذیب ہندوؤں جیسی ہے۔ یہ بھی پراپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ در پردہ ہندوؤں سے ملے ہوئے ہیں لیکن ان سب سے بالا اس بات کا پراپیگنڈہ کیا گیا کہ بنگالیوں کا اصل ارادہ پاکستان سے الگ ہو کر اپنی آزادی کا اعلان کرنا اور پھر ہندوستان سے مل جانا ہے۔ حالانکہ بنگالیوں کی قیادت نے الگ ہونے کا اعلان اس وقت تک نہیں کیا تھا، جب تک مارچ 1971ء میں جرنیلوں کے برے عزائم ان پر واضح نہیں ہو گئے تھے۔ غیر بنگالی پاکستانیوں اور اردو زبان کے خلاف بنگالیوں کی عداوت کی خبریں بھی سننے میں آتی تھیں۔ سپاہی اور نوجوان افسر جو زیادہ تر پنجاب سے تھے، مغربی پاکستان میں اس پراپیگنڈے سے لاتعلق کس طرح رہ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ فریب میں آ گئے اور ان بنگالیوں کے خلاف شدید نفرت گھر کرنے لگی۔ انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ بنگالیوں کو سزا دینا اسلام کی بڑی خدمت ہو گی۔

ایک پراپیگنڈہ مہم کے تحت جس کا رخ مشرقی پاکستان میں سپاہیوں اور نوجوان افسروں کے خلاف تھا بنگالیوں کو غیر محسوس انداز سے بھڑکایا گیا کہ وہ علانیہ انہیں گالی دیں اور ان کے خلاف شدید عناد ظاہر کریں لیکن سپاہیوں اور نوجوان افسروں کو اس کے ردعمل کے اظہار سے روکا گیا تاکہ بنگالیوں کے خلاف ان میں نفرت شدید سے شدید تر ہوتی جائے۔ اسکے متوازی، مشرقی پاکستان میں یہ کام ہوا کہ بہاریوں اور بنگالیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تصادم کی راہ پر ڈال دیا گیا۔ بہاری، وہ اردو بولنے والے لوگ تھے جو 1947ء کے بعد ہندوستان کے صوبہ بہار سے نقل وطن کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کے اردو اخبارات میں بنگالیوں کی غداری کی حب الوطنی کو خوب اچھالا گیا اور اس کا پراپیگنڈہ ہوا۔ جلد ہی بہاری بستیوں میں بہاریوں کی لاشیں جنہیں سخت ایذا دے کر مارا گیا تھا، بند بوریوں میں ملنے لگیں۔ یہ ان زخم خوردہ لاشوں سے مختلف نہ تھیں جو

MashalBooks.org

اس سے کچھ عرصہ بعد کراچی میں 1995ء میں بوریوں کے اندر ملنے لگی تھیں۔ اس کے بعد تو بہیمیت کا ایک طوفان آ گیا جس میں بنگالی خاصی بڑی تعداد میں ہلاک کر دیئے گئے۔ اگرچہ بہاریوں اور بنگالیوں کے درمیان پہلے بھی چنداں محبت نہ تھی لیکن خاموش اور دبی ہوئی نفرتیں علانیہ طور پر سامنے آ گئیں۔ بہاری بنگالیوں کو دوقومی نظریے کا غدار سمجھنے لگے اور بنگالیوں نے بہاریوں کو ایک حملہ آور فوج کا حمایتی اور شریک سمجھ لیا۔

25 مارچ 1971ء تک سپاہیوں اور نوجوان افسروں کے دلوں میں نفرت کا لاوا ابلنے لگا تھا۔ اس وقت جرنیلوں نے مشرقی پاکستان میں اقتدار اعلیٰ کے مالک وہاں کے عوام کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ لاچار شہریوں کی ہلاکت کا سلسلہ خاصے دنوں تک جاری رہا لیکن وہ ایک مایوس کن جنگ تھی، پاکستانی جرنیل اسے جیت نہیں سکتے تھے، لہٰذا مشرقی پاکستان کے حریت پسندوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے بچنے کی خاطر ہندوستان کو حملہ کرنے کے لئے اکسایا گیا، 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کو انتہائی ذلت، شرمندگی اور المیے کا سامنا کرنا پڑا۔ بہادر پاکستانی سپاہیوں اور شہریوں کو جن کی تعداد 93 ہزار تھی اپنے بدترین دشمن کے آگے جو کوئی ایسا بہادر بھی نہیں تھا محض اپنے جرنیلوں کی نااہلی، لالچ اور بزدلی کے باعث ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہتھیار ڈالنے والے سپاہیوں کو ہندوستان میں جنگی قیدیوں کے کیمپ کے توسط سے واپس لایا گیا لیکن بہاریوں کو بنگال میں کلفت اور عذاب کے عالم میں چھوڑ دیا گیا۔ پاکستانی جرنیلوں نے ان سے جو بدعہدی کی تھی اس کے بعد سے اب 2001ء تک وہ وہیں پڑے ہیں۔

اوائل 1977ء میں عام انتخابات ہوئے لیکن حزب اختلاف نے سڑکوں پر مظاہرے کر کے انتخابات کے نتائج کو جعلی قرار دیا۔ بعض جگہوں پر یہ مظاہرے جارحانہ ہو گئے یا کم از کم حکومت نے یہی قیاس کیا۔ بعض شہروں میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس میں کچھ حصے لاہور اور کراچی کے شامل تھے۔ لاہور میں چند اعلیٰ فوجی افسروں نے جنہی پرامن شہریوں پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا تھا، ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ یہ نہایت قابل تعریف کام تھا لیکن لاہور میں پولیس کی فائرنگ سے جب ایک احتجاجی ہلاک ہو گیا تو 5 جولائی 1977ء کو فوجی بغاوت ہو گئی۔ اعلیٰ فوجی افسروں کو صوبائی وابستگی کی نوعیت کیا تھی اسے جانتے ہوئے تاریخ یہ سوال کرے گی کہ جب 1958ء میں

اور پھر 1972ء میں بلوچوں پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یا جب 1983ء میں سندھیوں پر فائرنگ کا حکم ہوا تھا تو اس وقت استعفے کیوں نہیں آئے؟ اور بنگال کے سلسلے میں تو افسروں کی بڑے پیمانے پر مستعفی ہونا چاہئے تھا۔ یہ جانب داری کیا پاکستانی قوم کے ساتھ بدعہدی نہیں تھی اور پاکستان کی واحد قومیت کے لئے موت کا پیغام نہیں تھی؟ میرا خیال ہے کہ ایک باضمیر جرنیل، میرے مقابلے میں اس سوال کا جواب بہتر طور پر دے سکتا ہے۔ سردار ایف ایس کے لودھی اس نایاب ہوتی ہوئی نسل کے باخبر جرنیلوں میں شامل تھے۔ انہیں 1980ء کے درمیانے عشرے میں ریٹائر کر دیا گیا۔ 1990ء کے عشرے میں کراچی کچھ اس طرح کے مسائل سے دو چار تھا جو 1971ء میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو درپیش تھے اور جس طرح جنرل نیازی مشرقی پاکستان کے مسائل حل کر رہے تھے جنرل نصیر اللہ بابر اور ان سے پہلے جنرل آصف نواز اور جنرل نصیر اختر اس طرح کراچی کے مسائل حل کر رہے تھے۔ جنرل سردار ایف ایس لودھی نے 28 جولائی 1995ء کو روزنامہ ڈان کراچی میں ایک خط لکھا جس کا عنوان تھا ایک دماغ سوز مکالمہ، ایک روح فرسا عبارت۔

جنرل بابر کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ''اس بنا پر کہ جنرل بابر ایک اچھے فوجی ہیں، وہ بلاشبہ اس بات کو محسوس کر لیں گے کہ مسائل طاقت کے استعمال سے حل نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ کچھ دیگر مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم نے مشرقی پاکستان اور پھر بلوچستان میں طاقت کا استعمال کیا پھر جب ہم نے لاہور میں طاقت استعمال کیا تو فوج میں ہی رخنہ پڑ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بنگالی، بلوچ، سندھی اور مہاجر فوجیوں کے نزدیک ان کے اپنے لوگ نہیں تھے۔

بیس بائیس انتخابی حلقوں میں انتخابات کرانے پر سمجھوتہ ہو چکا تھا، لیکن اس کے بجائے کہ سیاستدانوں کو اپنا کام کرنے دیا جاتا 4 فروری 1977ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ وہ مشرقی پاکستان کے رسوا کن سانحے کے بعد بدعہدی کا سب سے بڑا المیہ تھا جس میں سیاسی عمل کو بروئے کار آنے کی مہلت نہیں دی گی۔ اس کے بجائے انہوں نے 1979ء میں آزاد یکے بعد براہ راست منتخب ہونے والے پہلے وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ پاکستانی قوم کے ساتھ یہ نہایت سنگین بدعہدی تھی جس کے بعد 1983ء کی تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کے تحت پرامن احتجاج کو بھی بے دردی سے کچل دیا گیا۔ 1977ء

کے مارشل لاء سے جو مایوسی پیدا ہوئی تھی اس نے پورے معاشرے کو خاص طور پر سندھ کے معاشرے کو لسانی اور نسلی گروہوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ جس کے بعد پاکستانی قوم سفاکانہ سلوک رو رکھا گیا۔ کراچی میں اکثریتی آبادی مہاجروں کی تھی۔ اس کے متوسط طبقے کے افراد اور دانشور اپنے پنجابی ہم مسلک افراد کے ساتھ نظریہ پاکستان کے قلبی محافظ تھے۔ یہ دونوں نسلی گروہ آزادی کے پہلے سے دوقومی نظریے کے علم بردار چلے آ رہے تھے۔ وہ 1948ء ''لادین'' پختونوں کے خلاف، 1958ء اور 1974ء میں بلوچوں کے خلاف، 1971ء میں بنگالیوں کے خلاف اور 1983ء میں سندھیوں کے خلاف متحدہ طور پر جہاد کر چکے تھے۔ بڑھتی ہوئی بیروزگاری، شہری سہولتوں کی کمیابی، تعلیمی سہولت اور ان کے معیار کی گراوٹ اور اس طرح کے دوسرے مسائل نے سر اٹھانا شروع کیا تو کراچی کے باشندوں میں مایوسی پھیلنے لگی۔ ادھر سندھ میں بھی 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں ابھرنے والے متوسط طبقوں میں 1980ء کے عشرے تک آتے آتے پختگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ فرزند زمین تھے، اس لئے کم سے کم تر سرکاری ملازمتوں پر ان کا دعویٰ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر ملازمت کی تلاش میں ہجرت کر کے کراچی آنے والے پختونوں اور پنجابیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ جس بنا پر سندھی دعویدار تھے اس بنیاد پر ان کا دعویٰ بھی اولیت کا تھا۔ اب دو قومی نظریہ ایک بار پھر ایک عذر لنگ ہو کر رہ گیا۔

اب مہاجر یکسر تنہا ہو کر رہ گئے۔ ان کے بے بصیرت متوسط طبقے اور کور دماغ دانشوروں نے آئندہ حالات کو نہیں دیکھا، اگر دیکھ لیتے تو یہ روز دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اعلیٰ تعلیم اور خواندگی کے باوجود اور ان کے متوسط طبقے کی بالادستی کے باوصف، مہاجروں میں سیاسی آگہی سماجی شعور، ذہنی بیداری اور بالغ نظری کی کمی تھی۔ وہ 1960ء کے عشرے کے اواخر میں مہاجروں کے جاگیردار طبقے کے جال میں پھنس گئے حالانکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مہاجر جاگیرداروں اور بڑے مہاجر آبادکاروں کے اشتراک سے مہاجر پنجابی پختون محاذ تیار کیا گیا جسے مہاجر اور پنجابی افسر شاہی کی خوشنودی حاصل تھی۔ اس سے مہاجر اعلیٰ افسروں کو اور جاگیرداروں کو تو فائدہ حاصل ہوا ہوگا لیکن اس سے مہاجروں کے وسیع تر مفاد کو بہت نقصان پہنچا۔ حالانکہ ان کا فائدہ سندھیوں کے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ساتھ قریبی تعاون میں تھا۔ پنجابی متوسط طبقے کو اس سے یکسر نقصان نہیں پہنچا جس طرح

MashalBooks.org

مہاجر متوسط طبقے کو پہنچا۔ کیونکہ اول الذکر نے اپنی وفاداری دوبارہ جوڑی تھی اور وہ اس مرتبہ سندھی متوسط طبقے کے ساتھ ہو گیا تھا۔ مہاجروں کو اعلیٰ مہاجر افسروں اور مہاجر جاگیرداروں کی بدعہدی اور خود اپنی سیاسی کم فہمی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

1980ء کے عشرے کے وسط تک نسلی اور لسانی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ افراد اپنی بیروزگاری کا ذمہ دار دوسرے فرقے والوں کو قرار دینے لگے۔ بہت جلد وہ کشیدگی نسلی فسادات میں بدل گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود خفیہ ایجنسیوں نے وہ فسادات کرائے تھے تاکہ عام لوگوں کی توجہ حکومت کی عیارانہ روش سے ہٹ جائے۔ بہرحال فسادات کس نے شروع کرائے اس بارے میں حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ سخت مایوسی اور بے چینی سبھی قوموں میں پائی جاتی تھی، جس سے فسادات میں شدت پیدا ہوئی۔ ایک کے بعد دوسری بار فساد ہوا اور قتل بھی اسی طرح ہوتے رہے۔ 1990ء کے عشرے میں آ کر فرقہ وارانہ فسادات اگرچہ تھم گئے تھے، لیکن اب کے تشدد نے ایک زیادہ مفسدانہ انداز اختیار کر لیا تھا جس میں افراد کو نشانہ بنایا جا رہا تھا، دولت مند تاجر تاوان کے لئے اغواء کر لئے جاتے تھے، انتہائی مصروف سڑکوں پر بھی گاڑیاں چھین لی جاتی تھیں اور ڈکیتیاں دن دیہاڑے ہو رہی تھیں، جو اس امر کی علامت تھی کہ ریاست کی انتظامی مشینری رفتہ رفتہ بکھر جانے کو ہے۔ اندرون سندھ میں بعض ڈاکوؤں نے راکٹ لانچر بھی آزادی سے استعمال کئے گئے اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ بعض برے جاگیرداروں نے اپنی زمینیں چھوڑ دیں۔ صورتحال سارے ملک میں خراب ہو گئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی خرابی کراچی میں تھی۔ اغواء کرنے والے غیر ملکیوں کو بھی اغواء کر لیتے تھے اور حکومت اتنی بے بس تھی کہ ان کی بازیابی کیلئے تاوان ادا کرتی تھی۔

ان حالات پر قابو پانے کے لئے 1994ء میں فوج طلب کر لی گئی۔ اندرون سندھ میں تو فوج کی موجودگی کس قدر موثر ثابت ہوئی لیکن کراچی میں زیادہ اثر نہیں ہوا۔ دو سال بعد فوج کو واپس بلا لیا گیا بالآخر حکومت نے بوکھلا کر پوری مہاجر قوم کے خلاف ایک زبردست مہم اس طرح شروع کر دی جیسی اس نے 1971ء میں بنگالیوں کے خلاف تھی۔

کراچی کی ایک حساس حیثیت تھی چنانچہ اس کی دھماکہ خیز صورتحال خاص طور پر

MashalBooks.org

ہر ایک کی نظر میں تھی۔ صوبہ پنجاب کے حالات اس سے ذرا سے ہی بہتر رہے ہوں گے لیکن اس سے بھی بری حالت پختون قبائلی علاقے میں تھی جو براہ راست حکومت کے ماتحت تھا۔ وہاں ہر فرد پوری طرح مسلح تھا اور ہر فرد نہایت لازمی اور بنیادی شہری حقوق سے بھی محروم تھا، یعنی قانون کی عدالت سے رجوع کرنے کے حق سے، اس لئے قبائلی علاقے پر قبائلی ملکوں اور فرنٹیئر کرائم ریگولیشنز کی حکمرانی تھی۔ چند ایک کے سوا کسی بھی قبائلی ملک کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک کے بعد ایک آنے والی دوسری بلکہ کسی بھی حکومت نے تعلیم اور روزگار کی فراہمی کیلئے کچھ نہیں کیا۔ خواندگی کی شرح قبائلی علاقے میں باقی ہر پاکستانی علاقے سے کم تھی، حالانکہ پاکستان بجائے خود ایک ناخواندہ معاشرے کا ملک تھا۔ انہیں بیزار کن حالات میں قبائلیوں نے اپنے علاقے میں صورت حالات کی فوری بہتری کا مطالبہ شروع کر دیا۔ کراچی میں تو مسلح ریاست اسلحہ کے زور پر شہریوں کو کچھ عرصے کے لئے دبا سکتی تھی، لیکن قبائلی علاقے میں اسلحہ کے استعمال کے معنی تھے، باقاعدہ لڑائی کیونکہ وہاں ہر شخص نہایت حساس نوعیت کے اسلحہ سے بھی لیس تھا۔ ملک کے باقی تمام حصوں سے زیادہ وہاں کی حالت دہشت ناک تھی۔

اس بدعہدی کے عمل میں مہاجروں کے کردار کی وضاحت تو کی گئی ہے لیکن مجموعی ملکی آبادی میں ان کی تعداد شمہ برابر تھی۔ ان کا کردار نمایاں طور پر افسوسناک تو ہوسکتا تھا، لیکن اسے ہلاکت خیز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ 1971ء سے پہلے 24 افراد میں ایک مہاجر ہوتا تھا۔ 1971ء کے بعد بھی 12 افراد میں ایک مہاجر ہوتا تھا۔ جب ایوب نے نہایت صفائی سے بہت سے مہاجر افسروں کو بیک قلم برطرف کر دیا تو فیصلہ سازی میں مہاجروں کا کردار بہت کم رہ گیا۔ جو بچ رہے تھے انہیں یحییٰ اور ان کے بعد بھٹو نے نکال دیا، اس طرح فیصلہ سازی میں ان کا کردار سرے سے ختم ہو گیا۔ اس کے باوصف مہاجر دانشور اور اس کے متوسط طبقے کے لوگ نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریے کے مستقل مزاج محافظ کے طور پر ڈٹے رہے۔

اب صرف پنجابی دانشور اور اس کے متوسط طبقے کے افراد رہ گئے تھے، جن کا کردار انتہائی اہم بلکہ مہلک ہوسکتا تھا۔ اول اس لئے کہ ان کی آبادی کثیر تھی اور 1971ء کے بعد پاکستان میں باقی سب علاقوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تعداد پنجابیوں کی تھی۔

MashalBooks.org

دوسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ سول اور فوجی افسر شاہی میں پنجابیوں کی اجارہ داری کی بنا پر فیصلہ سازی میں ان کا حصہ بہت زیادہ اور اس بنا پر ان کا کردار انتہائی اہمیت رکھتا تھا۔

پرانے اور پختہ کار بلوچ لیڈر مسٹر بزنجو نے اس سول کے جواب میں جو صوبوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کے حوالے سے تھا کہا، آپ لوگ ملک کو متحد نہ رکھ سکے اور اسے جمہوری رنگ نہ دے سکے اگر آپ لوگ جو پنجاب سے ہیں خود اپنی فکر نہیں کرتے اور نہ دوسروں کی پرواہ کرتے ہیں تو پھر ملک کو متحد اور مربوط نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو آپ، پنجاب کے لوگوں کا کام ہے، صوبوں کے درمیان برابری کے تعلقات پیدا کریں، پھر صرف اس کی بنیاد پر قومی اتحاد برقرار رہ سکے گا۔ قومی مسائل سے آپ کی لاتعلقی کی بناء پر بنگالیوں نے آپ کو اپنا قریبی نہیں سمجھا۔ آپ کو یقین ہے کہ سول انتظامیہ اور فوج کی افسر شاہی میں آپ کے ترجمان آپ کے مفادات کے تحفظ کے لئے موجود ہیں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ نہیں ہیں وہ تو اپنے مفادات کو آگے بڑھا رہے ہیں اور پنجاب کے لوگوں کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

پاکستان کے تمام صوبوں کے درمیان ایک قابل عمل، باوقار اور برابری کا رشتہ ہونا چاہئے، اسے بروئے کار لانے کے لئے بزنجو کی اپیل کے جواب میں، میں نے پوچھا کہ اس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ بزنجو نے جواب دیا، مشرقی پاکستان، پنجاب، بلوچستان، سندھ اور صوبہ سرحد، متنوع قومی ریاستیں ہیں۔ ان کے عوام کی مختلف تاریخ، زبان اور ثقافت ہے۔ ان کا اتحاد اس طرح ممکن تھا کہ ہمارے انتظام کاروں نے محض انگریزوں کی حکمت عملی اور صوبوں کے درمیان مواصلات کو ہی کافی نہ سمجھا ہوتا بلکہ انہوں نے تو ایک وفاق کے اندر عام لوگوں کی رضا کارانہ شرکت کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی چنانچہ جو ہنوا تھا، وہ نہیں ہوا اور پاکستان میں صحیح طور پر ایک جمہوری اور وفاقی نظام حکومت نہ چل سکا، جس میں وفاق کی وحدتوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہوتی، لہٰذا ہم نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ اب اگر ہم نے باقی ماندہ چاروں وحدتوں یعنی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے باہمی تعلق اور اس ڈھانچے کی ساخت میں تبدیلی نہ کی تو دوسروں کی طرف سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن بلوچستان الگ ہو جائے گا۔ (24)

بزنجو نے بھٹو کو متنبہ کیا تھا کہ سول معاملات میں فوج کو استعمال نہ کریں۔ فوجی

بغاوت سے پہلے بھٹو نے اپنی آخری پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ میں نے اگر بزنجو سے معاملات سلجھائے ہوتے تو یہ مسائل پیدا نہ ہوتے۔''

انٹرویو کے آخر میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا:

''ایک پنجابی ہونے کے ناطے اب تک آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ آپ کے اور آپ کے صوبے کے خلاف بلوچستان میں شدید جذبات پائے جاتے ہیں، چنانچہ پاکستان کی تاریخ میں اس مرحلے پر پنجاب کی قیادت کو نہایت اہم کردار ادا کرنا ہو گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ پنجابی اچھے منتظم تو ہیں لیکن اچھے حکمران نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے صوبے سے باہر حکمران تلاش کرتے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زبان نہیں بولتے۔ اپنی ثقافت پر عمل کرتے ہوئے شرماتے ہیں جب یہ حالات ہوں تو آپ پاکستان کے لیڈر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ان تمام کامیابیوں کے باوصف آپ ملک کو متحد رکھنے میں قیادت کا کردار ادا نہ کر سکے۔''(25)

اس عبارت کے مصنف کاردار نے جن دوسرے بلوچ لیڈر سے انٹرویو کیا کہ وہ قبائلی سردار اکبر بگٹی تھے۔ کاردار نے اپنی گفتگو یہیں سے شروع کی کہ وہ کوئٹہ میں یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ قوم کو متحد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ بگٹی نے جواب دیا ''کون سی قوم؟'' تمہاری یا میری؟ میں نے جواب دیا پاکستان، انہوں نے جواب دیا کہ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے اور بنگلہ دیش بن جانے کے بعد جناح کا پاکستان باقی نہیں رہا۔ انہوں نے کہا جب بھٹو نے دسمبر 1971ء میں اقتدار سنبھالا تو انہوں نے ایک نئے پاکستان کی بات کی تھی۔ اس فیصلے سے ظاہر ہوا کہ پاکستان چار قومیتوں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے اجزائے ترکیبی سے مل کر بنا ہے۔''

میں نے اس وقت کہا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ پاکستان میں چار قومیں آباد ہیں اور ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ یہ چاروں مل جل کر کام کرتے ہوئے ایک قومی اتحاد بنانا چاہتے ہیں۔ تو ان مفروضوں کی بنا پر آپ ایک مربوط اجڑے ہوئے اور متحدہ پاکستان کو

MashalBooks.org

کس طرح دیکھتے ہیں؟ میں نے یہ بھی کہا کہ میں یہ سوالات اس بنا پر کر رہا ہوں کہ بلوچستان کے باشندوں میں احساس محرومی کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کیلئے دو لیڈر پاکستان سے باہر چلے گئے ہیں جن میں سے ایک نے ایک آزاد بلوچستان کی تحریک کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ بگٹی نے جواب دیا کہ انہوں نے 1947ء میں ہونے والے محدود ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا تھا لیکن ایسا کرنے کا انہیں افسوس ہی رہا کیونکہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے بلوچستان کے عوام نے سول اور فوجی افسر شاہی کے ہاتھوں تشدد اور بے انصافی ہی برداشت کی ہے اور پنجاب کے تاجر اور صنعتکار طبقے یہاں سے اپنے مفادات پورے کرتے آئے ہیں۔ بگٹی نے سارا الزام پنجاب کے صوبے پر ڈال دیا اور کہا پنجاب نے لیڈروں کو ہمیشہ اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کے خیال میں بھٹو خود بھی پنجاب کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکے۔ پھر کیا صرف مافوق البشر کوششیں ہی اتحاد برقرار رکھ سکتی ہیں، بشرطیکہ اس کی بنیاد چاروں بھائیوں کے درمیان مساوات کے کے اصول پر ہو، اس اتحاد کو بروئے کار لانے کے لئے پہل قدمی پنجاب کو کرنا ہو گی۔ ہم منتظر ہیں، چپ چاپ بیٹھے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھیل رہے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ سہ طرف بندوبست، جو سول اور فوجی افسر شاہی اور پنجاب کے اقتصادی مفادات کے ترجمان وہاں کے کاروباری اور صنعتی طبقوں کے مابین قائم ہے، منہدم ہو جائے گا۔ (اس پر کاردار نے اضافہ کیا) میں امید کر رہا ہوں کہ اس میں وہ جاگیردار طبقے کو بھی شامل کریں گے، لیکن انہوں نے یہ نہیں کیا کیونکہ بگٹی خود بھی پاکستان کے ایک بڑے شاہانہ طرز کے جاگیردار ہیں۔''

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے، اس کے ایک سلجھے ہوئے لیڈر نے یہی باتیں اکثر و بیشتر اس سے کہیں کم کھردرے طریقے سے کہی ہیں۔ 1970ء کے عشرے کے اوائل میں، میں نے لاہور کے گول باغ میں ان کی تقریر سنی تھی۔ انہوں نے لکھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد، تنہا پنجاب ہی پاکستان ہے۔ لہٰذا انہوں نے پنجابی لیڈروں کو مشورہ دیا کہ وہ سنجیدہ رویہ اختیار کریں اور پنجابی تنگ نظری کی بجائے قومی انداز فکر اختیار کریں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کو اگر کچھ ہوا تو تاریخ پنجاب کو اور صرف پنجابیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دے گی۔

MashalBooks.org

پنجاب کی آبادی میں کسان ہیں، اس کے ماہر کاریگر اور کارکن ہیں، چھوٹے سرمایہ کار اور شہروں میں بسنے والے عام لوگ ہیں، یہ سب سخت کوش اور محنتی ہیں لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ وسیع القلب اور کشادہ ذہن کے لوگ ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ پنجابیوں میں ایک بہت چھوٹی سی اقلیت جس کے اپنے مفادات ہیں، یعنی جاگیردار، بڑے صنعتکار اور تاجر پنجاب کی بدنامی کا سبب بنی ہوئی ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پنجاب کے دانشور اور متوسط طبقے کے افراد جو بجائے خود اقلیت میں ہیں ایک عام پنجابی کی طرح دردمند، کشادہ ذہن اور فیاض ہونے کے بجائے ان سے بالکل مختلف کیوں ہیں اور استحصالی طبقے کی طرح کیوں ہیں؟

گزشتہ تحریر کے حوالے سے اپنی بات کو میں اس نتیجے پر ختم کروں گا کہ پاکستان چونکہ ایشیا کے بہترین حصے میں واقع ہے لہٰذا اس کا نتیجہ جلد اور تیز رفتار، اقتصادی، سماجی اور سیاسی ترقی ہونا چاہئے تھا، اسے 1950ء کے عشرے میں ہی ترقی کی راہ پر ان قوموں کے درمیان آگے آگے ہونا چاہئے تھا جنہیں 1990ء میں ایشین ٹائیگر (ایشیا کے شیر) کہا جاتا ہے اور ان ''ایشین ٹائیگر'' کے مقابلے میں اسے ایک نمونے کا جمہوری ملک ہونا چاہئے تھا جس کی پیروی دوسرے ملک بھی کرتے۔ اتفاق سے ہندوستانیوں کی تقدیر بھی اگر بہتر ہے تو اس کی جمہوریت کے باعث اور پاکستان کے ہمسائیوں سے بہت معمولی طور پر بہتر ہے، ظاہر ہے کہ سارا جنوبی ایشیا عذاب جھیل رہا ہے۔

حوالے

1۔عزیز صدیقی — روزنامہ ڈان کراچی جنوری 1997ء

2۔خالد شمس الحسن — Sindh's fight for Freedom

3۔گیون کینیڈی — The Military in the Third World. Gerald Duckworth London.

4۔اے ایچ کارداد — Failed Expectation: Book traders, Lahore

5۔محمد منیر — From Jinnah to Zia

MashalBooks.org

6۔ بیوری نکلس Beverley Nichols Verdict on India.

7۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ Huseyn Shaheed Suharwardy: Biography Oxford Universty Press Karachi.

8۔ کلیم صدیقی Conflict Crisis and War in Pakistan.

9۔ عبداللہ ملک Selected Speeches and Statements, Mian Iftikharuddin nigarishaat Lahore.

10۔ ضمیر نیازی The Press in Chains.

11۔ اے ایچ کاردار Failed Expectations.

12۔ ایضاً

13۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ

14۔ ڈاکٹر عبدالسلام Science and Education in Pakistan.

15۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ

16۔ چارلس ایچ کینیڈی Bureaucracy in Pakistan, Oxford Universty Press.

17۔ کلیم صدیقی Conflict Crisis and war in Pakistan.

18۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی The Military in Pakistan Image and Reality.

19۔ The Nation Islamabad 18 Aug 1994

20۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی The military in Pakistan Image and Reality

21۔ اے ایچ کاردار Failed Expectations.

22۔ ایضاً

23۔ ایضاً

MashalBooks.org

اختتامیہ

قوموں کی برادری میں معاشروں کو وقار اور امتیاز حاصل ہوتا ہے ان کی تخلیق کاری، تخیل کی طاقت، شہری اور انسانی حقوق کے لئے احترام کی بناء پر، ان کے خیالات کی تازگی اور وسعت خیالی کی وجہ سے، اور صداقت، عدل و انصاف اور سماجی اور اقتصادی برابری اور ان سب سے سوا اعلیٰ روحانی اخلاقی اور انسانی رویے کی بنا پر ایسے ہی معاشرے ادارے بناتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں، شخصیتوں پر انحصار نہیں کرتے۔ ایسے ہی معاشروں میں فلسفی، مفکر، سائنسدان، عالم، مصلح اور سماجی کارکن پیدا ہوتے ہیں جو قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کی بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں، سیاستدانوں اور حکمرانوں کی ذہانت کو جلا بخشتے ہیں۔ معاشرے کو ایک مقصد فراہم کرتے ہیں، آگے بڑھنے کے لئے سمت متعین کرتے ہیں اور طبقاتی صورتحال میں تبدیلی لاتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں داخلی طور پر ناپسندیدہ سماجی اور اخلاقی خرابیوں سے مقابلے کا ایک خود کار نظام موجود ہوتا ہے۔ جس طرح ایک صحت مند انسانی جسم میں بیماریوں سے مدافعت کا نظام طبعی طور پر موجود ہوتا ہے۔ پھر جس طرح انسانی جسم میں خلیے دوبارہ تعمیر ہوتے ہیں، اسی طرح معاشرے بھی اپنے اندر ہونے والی اخلاقی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کر لیتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں جہاں دوسرے معاشروں سے سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہیں وہ اپنی توانائی سے دوسرے معاشروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کچھ سوچے سمجھے بغیر بندروں کی طرح دوسروں کی نقالی کرتے ہیں اور نہ دوسرے معاشروں کی اعلیٰ قدروں کو احمقانہ طور پر رد کر دیتے ہیں۔ وہ دوسرے معاشروں کی قدروں کو اچھی طرح پرکھنے اور سوچنے سمجھنے کے بعد

MashalBooks.org

اپنی اخلاقی ، روحانی اور ثقافتی اقدار میں شامل کرنے کے لئے چن لیتے ہیں۔

ساری باتیں انسانی معمولات میں شامل ہیں اور کوئی معاشرہ کلی طور پر ان معیارات پر پورا نہیں اترتا البتہ جو معاشرے ان میں سب سے زیادہ نکات پر پورے اترتے ہیں وہی سب سے آگے ہوتے ہیں اور جو کم سے کم نکات کے حامل ہوتے ہیں وہ باقی سب سے پیچھے جاتے ہیں۔

ساتویں اور چودھویں صدیوں کے درمیان، مسلم معاشرے زیادہ سے زیادہ ان صفات کے حامل تھے، چنانچہ وہ باقی معاشروں کی رہنمائی کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ پیچھے رہ گئے اور اب مغرب نے برطانیہ کی تقلید کرتے ہوئے رہنمائی کا کردار اختیار کیا ہے۔

برطانیہ میں متوسط طبقے نے سولہویں صدی میں ابھرنا شروع کیا۔ ان میں اکثریت تاجروں کی تھی۔ برطانوی متوسط طبقے نے پہلی بار اپنی توانائی کا ثبوت اس وقت دیا جب اس نے اپنے وسائل یکجا کئے اور 1552ء میں ایک مشترکہ کمپنی (Joint Stock Company) بنائی تا کہ ماسکو کی کمپنی (Dutchy of Moscovy) کے ساتھ تجارت کریں۔ اس اقدام نے ایک کاروباری کلچر کی بنیاد رکھی جس کی اساس باہمی اعتماد، پیشہ وارانہ انتظام کاری اور تجارتی لین دین میں معاملے کے شفاف ہونے پر تھی۔ تعلیم چونکہ کاروباری کلچر کی لازمی ضرورت تھی لہٰذا عام لوگوں میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ یاد رہے کہ اس سے کچھ عرصہ قبل انگریزوں نے لاطینی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر مسترد کرتے ہوئے یہ درجہ انگریزی کو دے دیا تھا۔ اس وقت تک انگریزی صرف بول چال کی زبان تھی۔ یہ ادبی تحریری زبان نہیں تھی۔

تعلیم اور کاروباری کلچر سے بہرہ مند ہونے کے بعد متوسط طبقے کے انگریزوں نے اپنے سیاسی کردار کا زیادہ موثر استعمال کیا اور اب وہ برطانوی دارالعوام میں زیادہ اختیارات پر اصرار کرنے لگے۔ وہی مختصر سا متوسط طبقہ تھا جو اس ایوان کے لئے ارکان منتخب کرتا تھا۔ جب منتخب ارکان کو زیادہ سیاسی طاقت حاصل ہوگئی تو تعلیم، ریاست کی ذمہ داری بن گئی۔ اس کے نتیجے میں متوسط طبقہ پھیل گیا۔ یہی وہ معاشرہ تھا جس نے بہت سے سائنسدان، عالم اور مفکر پیدا کئے جنہوں نے برطانوی معاشرے کو قوموں کی برادری میں ''محترم اور ممتاز'' بنا دیا۔ یہی معاشرہ تھا جس نے بادشاہ کو بھی پابند کر دیا کہ دوسرے لوگوں

MashalBooks.org

کی طرح قانون کی پابندی کرے یہی وہ معاشرہ تھا جس نے انگریزوں کو جہد آزما، بہادر اور اتنا بے باک بنا دیا کہ تجارت اور دریافت کی خاطر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر دنیا کے انتہائی دور افتادہ کناروں تک بحری سفر کرتے رہے۔ وہی ایک ایسا معاشرہ ہوسکتا تھا، جہاں کم تعلیم یافتہ اور جیمز واٹ اور جارج سٹیفن جیسے معمولی خواندہ موجد بھی اعزاز کے مستحق قرار پاتے تھے، ان کا تعلق محنت کش طبقے سے تھا اور ایسی ہی مثالوں سے لاتعداد دوسرے افراد کو بھی امنگ ہوتی تھی کہ وہ بھی ایجادات ریں، قومی اعزاز سے سرفراز ہوں اور قوم کے ہیرو بن جائیں۔ یہ انہی کی ایجاد کی ہوئی ٹیکنالوجی تھی جس نے صنعتی انقلاب کا آغاز کیا۔

حاصل کلام یہ کہ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ نے روشن خیالی، رواداری اور اختلاف رائے کیلئے احترام کا ماحول پیدا کیا اس بات نے انگریز عوام اور اسکے محنت کش طبقے میں روشن خیالی، سیاسی بالغ نظری اور سماجی بیداری کی اور یہی وہ ماحول تھا جس نے موجدوں میں یہ امنگ اور ولولہ پیدا کیا کہ اپنی دریافتوں کے ذریعے ٹیکنالوجی کی تخلیق کریں اور ایک صنعتی انقلاب برپا کر دیں۔ اس ماحول نے سائنسدانوں کو آمادہ کیا کہ اپنی تحقیقات کے ذریعے قدرت کے مظاہرہ کا سراغ لگائیں اور عالموں کو اکسایا کہ سماجی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل کا حل کریں، تاکہ وہ مسائل حل کئے جاسکیں اور اس ایک نئی تہذیب کی تخلیق ہو۔ یہی وہ ماحول تھا جس نے نئے سرمایہ کاروں کو صنعتوں کی تنصیب پر آمادہ کیا۔ 1707ء میں سکاٹ لینڈ کے الحاق کے بعد برطانوی باشندے روشن خیال اور خوشحال اسی طرح ہوئے تھے۔

آیئے، اب ذرا دیکھیں کہ سولہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی بھی ہندوستان کے مسلم معاشرے کی کارگزاری کیا تھی۔ متحدہ کمپنیوں کی طرح یہاں کوئی کاروباری کمپنیاں نہیں تھیں، اس لئے کاروبار کا کوئی کلچر نہیں تھا۔ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مساوی کوئی کمپنی نہیں تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری درجنوں متحدہ کمپنیاں بہت سے سمندر پار ملکوں کے ساتھ تجارت کر رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مہم جوئی اور جہد آزمائی کا جذبہ موجود نہ تھا۔ ہندوستان کے مسلم مغل معاشرے نے سائنسدان اور سکالر پیدا نہیں کئے کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے یہاں نہیں تھے۔ برطانیہ میں جب کوئی بادشاہ قانون کی پابندی

MashalBooks.org

اور ریاستی اقتدار سے انحراف کرتا تو اسے عدالت میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہاں پر مغل بادشاہ کے اقتدار کو شہزادوں نے میدان جنگ میں للکارا کیونکہ قانون سازی کے ادارے موجود نہیں تھے۔ بادشاہ ذاتی طور پر خود ہی سب سے بڑی عدالت ہوتا تھا اور تنہا قانون ساز ہوتا تھا۔

برطانیہ میں تعلیم اس لئے پھیل رہی تھی کہ ذریعہ تعلیم عام لوگوں کی زبان تھی۔ مغلیہ ہندوستان میں تعلیم صرف ایک چھوٹے سے مراعات یافتہ طبقے تک محدود تھی اور کچھ کچھ متوسط طبقے تک پہنچتی تھی، اس لئے کہ تعلیم غیر ملکی زبان میں دی جاتی تھی۔ یہ تھی فارسی زبان، تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس کی جگہ مقامی زبان نافذ کرتے۔ نتیجہ یہ کہ ہندوستان کا مسلم مغل معاشرہ بڑی حد تک ناخواندہ رہا اور سائنس، فلسفے، عمرانیات حتیٰ کہ ادب میں بھی کوئی بڑا کام پیش نہ کر سکا، جس طرح انگریزی معاشرہ پیش کر رہا تھا۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کا مسلم مغل معاشرہ درحقیقت ایک زوال آمادہ معاشرہ یا کم از کم ایک بے جان معاشرہ تھا۔ صداقت اور علم کی تلاش تو ایک طرف رہی اس میں کوئی تجسس اور تلاش کی روح نہیں تھی تا کہ یہی معلوم کرتے کہ یہ عجیب سے سفید فام لوگ کون ہیں جنہوں نے سمندر میں، چھوٹے چھوٹے جہازوں پر بیٹھ کر ہزاروں میل کا سفر کیا۔ اس کا بھی کوئی ثبوت موجود نہیں کہ مغل ہندوستان کے کسی شہری نے تفتیش کی خاطر برطانیہ کا جوابی سفر اختیار کیا ہو۔

انگریزوں کے متوسط طبقے نے انگریز عوام میں تعلیم پھیلانے، بیداری اور روشن خیالی کو عام کرنے کے لئے جو کچھ کیا، صاف ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کے مسلم مغل متوسط طبقے نے یہ خوبیاں تو خود اپنے اندر بھی پیدا نہیں کی تھیں۔ برطانیہ میں متوسط طبقے کی کوششوں کے نتیجے میں انیسویں صدی کے اندر اس طبقے اور محنت کش طبقے کے درمیان امتیاز مٹتا گیا اور بیسویں صدی میں تو یہ امتیاز کرنا ممکن نہیں رہا لہٰذا ان دونوں طبقات کی کارکردگی آپس میں مل گئی۔ پاکستانی معاشرے میں ایسا کوئی انضمام نہیں ہوا، اس لئے آزادی کے پچاس سال گزرنے کے بعد بھی متوسط طبقے اور محنت کش طبقے کی الگ الگ کارکردگی کا فرق باقی رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طبقے کی کارگزاری کو الگ الگ پرکھا

جانے لگا۔

البتہ مغلیہ ہندوستان کے دست کاروں اور کاریگروں میں تحریک اور تخلیق کاری برقرار رہی جس کا ثبوت ان کی تخلیق کے شاہکار ہیں۔ مثال کے طور پر تاج محل، جس کا شمار دنیا کے آٹھ عجائبات میں ہوتا ہے اور ہنر کاری کے دوسرے شعبے، خواہ وہ ڈھاکہ کی مکمل ہو یا بنارس کے ریشمی کپڑے، سیالکوٹ کی توپیں اور بندوقیں، مراد آباد کے منقش ظروف ہوں یا حیدرآباد کے چوب کاری کے کام۔ ان ہنر مندوں کو متوسط درجے کے تاجروں اور سائنسدانوں سے کوئی مدد نہیں ملی، وہ ارباب حکومت کی سیاسی اعانت سے بھی محروم رہے۔ اس بنا پر ان کی کاری گری ٹیکنالوجی میں تبدیل نہ ہوسکی۔

ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کی زوال آزمادگی، بے عملی اور بے حسی 1857ء کے بعد برطانوی راج کے دوران تک برقرار رہی۔ ایک سرسید کے سوا، ایسے بلند قامت مصلح درمیانہ طبقے سے نہیں اٹھے جنہوں نے تعلیم کو پھیلانے کیلئے سخت جدوجہد کی ہو۔ ہندوستان کا ایک مریض اور روبہ زوال مسلم معاشرہ توہم پرستی، ناخواندگی، خود اعتمادی اور باہمی اعتبار سے عاری تھا۔ وہ سماجی ذات پات اور مذہبی فرقوں میں بٹا ہوا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان برائیوں میں پختہ اور ہٹ دھرم تھا۔ ایک شاہانہ اقتدار کی غلامی سخت ذلت آمیز تھی لیکن ان کے اندر ایسی کوشش نہ تھی کہ اس محکومی کے اصل اسباب معلوم کرتے اور اس تذلیل سے کچھ اپنا فائدہ حاصل کرتے، یعنی اس غیر ملکی طاقت کے کاروباری کلچر، جمہوریت اور اس کی سرمایہ کاری سے کچھ سیکھتے اور اس جدید تعلیم سے فائدہ اٹھاتے جسے انگریزوں نے رواج دیا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے نے کبھی سنجیدگی سے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کی قوم کتنی پرمایہ اور ثروت مند ہے اور اس سرمائے میں اضافہ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور نہ انہوں نے کبھی یہ سوچا کہ یہ قوم کتنے سنگین اقتصادی، سماجی اور اخلاقی وسائل سے دو چار ہے اور ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ انگریزوں نے انہیں کس طرح غلام بنایا؟ وہ کہتے ہیں، سیدھی سی بات ہے، سازش اور غداری کے ذریعے لیکن ان کے درمیان کوئی نہ تھا جو وال کرتا کہ یہ قوم اتنی نااہل کیوں تھی کہ اتنی بے بسی کے ساتھ سازش کا شکار ہوگئی؟ اس سازش اور غداری کو شکست دینے کے کوشش کیوں نہیں کی گئی اور یہ کیا ہوا کہ

ہندوستانی مسلمانوں کے اندر اتنی بڑی تعداد میں غدار پیدا ہو گئے؟

پیچیدہ مسائل کو اس قدر آسان بنا لینے کی قومی عادت نے مسلمانوں کو ان قائدین کی تقلید پر مائل کر دیا جو مسائل کا آسان حل پیش کر دیا کرتے تھے۔ کافر کی حکومت میں اگر زندہ رہنا پڑ جائے تو کیا کیا جائے؟ ایک مثالی مسلمان ملک افغانستان کی طرف مراجعت اور ہجرت مسلم قیادت کے نزدیکی وہ مثالی مسلمان افغانستان کیسا تھا؟ ابتدائی تہذیب کا ایک قبائلی معاشرہ جس پر ایک باجبروت حاکم مسلط تھا اور جیسے ہندوستانی مسلمانوں کے اپنے کوئی مسائل ہی نہ تھے، چنانچہ لیڈروں نے ان پر زور دیا کہ خلافت تحریک کے ذریعے ترکوں اور عربوں کو جو مسائل درپیش ہیں، انہیں حل کریں۔

اور جب مسلمان اپنے مسائل کے حل کی جانب مائل ہوئے تو ان کے قائدین نے کہا کہ تمہارے سارے مسائل کا سبب ہندو ہے۔ ہندو مہاجن مسلمان جاگیرداروں کو جو قرض دیتا تھا کیا اس کے عوض ان سے بھاری سود وصول نہیں کرتا تھا اور اس کی ادائیگی میں ناکامی کے بعد ان کی رہن رکھی ہوئی زمینوں پر قبضہ نہیں کر لیتا تھا؟ لیکن جاگیرداروں کو کسی نے یہ مشورہ نہیں دیا کہ اپنی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرو اور مسرفانہ زندگی بسر کرنے کے لئے قرض نہ مانگو اور بھی بری بات یہ کہ ان جاگیرداروں کو جو کفایت شعار تھے کنجوس کہا گیا اور فضول خرچ افراد کو سماج میں برتر حیثیت دی گئی اور انہیں ''دل والے'' کہا گیا۔

یہ تھی وہ قوم جس نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ان لیڈروں کی پیروی کی جو مسائل کے آسان حل پیش کرتے تھے۔ کافروں کا کیا کیا جائے؟ ہندوستان کو توڑ کر غیر مسلموں سے نجات پا لو، اس طرح سارے مسائل ہو جائیں گے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کے بعد ہندوستان کا بہترین حصہ اپنے وطن کے طور پر ملا۔ زرخیز مٹی، زائد نقد آور، فصلیں جیسے پٹ سن، کپاس، تمباکو اور نجی شعبے میں جمی جمائی صنعتیں جو انجینئرنگ کا سامان اور ضروری اشیاء تیار کرتی تھیں، ان کے علاوہ نہایت باصلاحیت سرمایہ کار اور ماہر کاریگر لیکن اس نئی قوم نے کچھ نہیں کیا، کیوں؟ غدار اور بھوکے بنگالیوں کی وجہ سے، پھر اس کا حل؟ ان سے بھی جان چھڑاؤ۔ ایسا کرتے وقت یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ تو دو قومی نظریے کا صریح بطلان ہوگا، جس کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔

لیکن باقی ماندہ پاکستان بھی تو نہیں چل رہا تھا۔ مسئلہ کا حل؟ صنعتوں کو قومی

ملکیت میں لے لیا جائے اور بھول جاؤ کہ قومی ملکیت میں لی جانے والی صنعتوں کو صرف پارٹی کے کارکن چلا سکتے ہیں، جو سیاسی طور پر پارٹی سے گہری وابستگی رکھتے ہوں اور تربیت یافتہ وں، جیسا کہ چین میں ہوا۔ لیکن پاکستان میں سیاسی وابستگی کا حامل ایسا کوئی پارٹی لیڈر نہیں تھا بلکہ صحیح معنوں میں کوئی سیاسی پارٹی ہی نہیں تھی، لہٰذا قومی ملکیت میں لی جانے والی صنعتوں کو نااہل اور بددیانت افسر شاہی کے حوالے کر دیا گیا۔ قومی صنعت تباہ ہو گئی۔ لاابالی زندگی کا چلن قومی سطح پر برقرار رہا۔ جاگیرداری تہذیب کی نشانی اور مسائل کا حل بھی وہی، ورلڈ بینک سے مانگتے رہو، جس نے ہندو ساہوکاروں کی جگہ لے لی ہے اور آخر میں قومیائی گئی صنعتوں کو بیچ دو اور اسے نجکاری کا نام دو۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ سیاسی بیداری نہیں تھی۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ، خاص طور پر دانش ور، بائیں بازو کے لوگ اور صحافی بجائے خود بھی سیاسی آگہی حاصل کرنے میں ناکام رہے تاکہ وہی شعور جو وہ پورے معاشرہ کو دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آزادی سے پہلے ہندوستان کا مسلم معاشرہ مسائل کا آسان حل قبول نہ کرتا۔ اس نے اپنی اصلاح کی ہوتی اور مقابلہ کرنے کے لئے اعتماد اور اہلیت پیدا کی ہوتی۔ آزادی کے بعد پاکستانی معاشرے نے حکمرانوں کو مجبور کر دیا ہوتا کہ جمہوریت کی پابندی کریں اور معاشرے کو جاگیرداری نظام، ذات پات کی تقسیم، محدود قبیلہ داری اور مذہبی فرقہ پرستی سے نجات دلائیں۔ اس وقت معاشرے نے آمریت کو استحکام کی علامت یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کی نشانی سمجھ کر اس کا خیر مقدم نہ کیا ہوتا اور غاصبوں کو اقتدار پر قبضہ کرنے نہ دیا ہوتا۔

1990ء کے عشرے میں پاکستان عملاً نراجیت کی آماجگاہ تھا، دہشت گردی، دن دیہاڑے ڈکیتی، ڈاکہ زنی، کار چھیننے کی وارداتیں، عورتوں کی بے حرمتی اور اجتماعی عصمت دری عام تھی جس پر پولیس قابو پانے میں ناکام تھی بلکہ کبھی کبھار خود بھی شریک جرم ہو جاتی تھی۔ کوئی بھی پاکستانی، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ رکھتا ہو، خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ یہ مہذب شہری معاشرے اور معمول کی معیشت کا مکمل انہدام ہے۔ 1990ء کے عشرے میں پاکستان نے بہت کچھ گنوا دیا، کیونکہ اسکے متوسط طبقے نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔

☆☆☆

MashalBooks.org

کچھ مصنف کے بارے میں

غلام کبریا ایک ٹیکنالوجسٹ ہیں اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر، جنہوں نے عملی زندگی کی ابتدا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انجینئرنگ کے لیکچرر کے طور پر کی۔ قبل ازیں انہوں نے اس یونیورسٹی سے گریجوایشن کیا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ ایک غیر ملکی انجینئرنگ کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ 1950ء میں وہ برطانیہ اور جرمنی گئے جہاں انہوں نے انجینئرنگ کے سامان کی تیاری اور اس کی دکانداری کا تجربہ حاصل کیا۔ واپسی پر وہ ایک برطانوی انجینئرنگ کمپنی سے منسلک ہو گئے جس کا دفتر لاہور میں تھا۔ وہ کمپنی میں انجینئرنگ ایگزیکٹو تھے اور اس عشرے کے آخر تک اس سے وابستہ رہے۔ غلام کبریا نے 1960ء کے عشرے کے آغاز سے لاہور میں مشینوں کی فروخت کا اپنا کاروبار شروع کیا۔ 69-1968ء میں وہ لاہور کے ایوان تجارت وصنعت کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہو گئے۔

1972ء میں جمہوریت کی بحالی کے بعد، اس وقت کے وزیر خزانہ کی دعوت پر غلام کبریا نے Appropriate Technology Development Organization) ATDO) قائم کی اور اس کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اس ادارے کا مقصد لوگوں کو سادہ ٹیکنالوجی سے متعارف کرانا تھا جس سے وہ سرکاری مداخلت کے بغیر فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر سوات میں چھوٹے ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ لگائے گئے۔ اس کی مالی ضرورت وہاں کے لوگوں نے خود ہی پوری کی اور پلانٹ کو چلایا۔ اس کے ٹربائن پشاور میں بنائے گئے اور لوگوں نے اس کی تقسیم بھی بطور خود کی۔

1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد غلام کبریا ATDO سے مستعفی ہو

MashalBooks.org

گئے۔ اس وقت انہیں زراعت میں مشینی استعمال کی بابت اقوام متحدہ کا مشیر بنایا گیا۔ اس حیثیت میں انہوں نے جنوبی کوریا، فلپائن، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور ہندوستان میں کام کیا۔ 1979ء میں اپنی رپورٹ پیش کرنے کے بعد وہ کراچی آ گئے۔ یہاں انہوں نے مشاورت (Consultancy) شروع کی اور بین الاقوامی لیبر تنظیم (آئی ایل او) ہالینڈ کی حکومت اور پاکستان کے چند مالیاتی اداروں کو 1997ء تک مشورے فراہم کرتے رہے۔ ورلڈ بینک کی مالی اعانت سے چلنے والے ادروں کے تعلق سے بھی وہ مشیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

غلام کبریا ایک سرگرم سماجی کارکن رہ چکے ہیں۔ انہوں نے لاہور کے ملی تکنیکی ادارہ میں ایک رضا کار استاد کے طور پر دس سال تک خدمات انجام دیں۔ کراچی میں وہ اورنگی پائلٹ پراجیکٹ اور پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لیبر آرگنائزیشن (پائکر) سے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔

اب تک غلام کبریا کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں پاکستان میں ٹیکنالوجی کا حصول (Technology Acquisition in Pakistan) مطبوعہ سٹی پریس کراچی 1998ء میں شامل ہے۔ وہ قومی اخبارات کیلئے پولیٹیکل، اکانومی اور ٹیکنالوجی کے موضوعات پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

MashalBooks.org